حقیقتِ شرک و توحید

حقیقتِ شرک و توحید

امین احسن اصلاحی

فاران

فاران فاؤنڈیشن
لاہور — پاکستان

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۹

جملہ حقوق محفوظ

جدید ایڈیشن

ناشر : ———— ماجد خاور

مطبع : ———— مکتبہ جدید پریس۔ لاہور

طابع : ———— رشید احمد چودھری

اشاعت : ———— فاران فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام : طبع چہارم۔ پانچ سو

تاریخ اشاعت : ———— اکتوبر ۱۹۹۸ء۔ جمادی الثانی ۱۴۱۹ھ

ادارہ : ———— فاران فاؤنڈیشن

122۔ فیروز پور روڈ، اچھرہ

لاہور-54600-پاکستان

فون: 042-7595100

قیمت : 165.00

یہ کتاب قبل ازیں "حقیقتِ دین" کے تحت شائع ہوتی رہی ہے۔

فہرس

عرضِ ناشر	۹
دیباچہ	۱۳

حقیقتِ شرک

	تمہید	۱۹
باب ۱	شرک کی حقیقت اور اس کے اقسام	۲۳
باب ۲	مشرکین کا شرک	۲۷
	۱۔ ملائکہ پرستی	۳۰
	۲۔ جنات پرستی	۳۷
	۳۔ کواکب پرستی	۴۲
	۴۔ آباء پرستی	۴۸
	۵۔ خود پرستی	۵۲

باب ۳	اہلِ کتاب کا شرک	۷۱
	۱۔ احبار پرستی	۷۴
	۲۔ حضرت مسیح کو رب بنانا	۷۸
	۳۔ پاکی و برتری کا دعویٰ	۸۹
	۴۔ ایمان بالجبت والطاغوت	۹۴
	۵۔ حمایتِ شرک	۹۷
باب ۴	منافقین کا شرک	۱۰۰
	تحاکم الی الطاغوت	۱۰۱
باب ۵	پچھلے مباحث کا خلاصہ	۱۱۵
باب ۶	موجودہ دنیا کا سرسری جائزہ	۱۲۰
	مشرقِ بعید	۱۲۱
	ہندوستان	۱۲۶
	مغربی یورپ اور امریکہ	۱۲۹
	روس	۱۳۲
باب ۷	مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ	۱۳۴
باب ۸	وقت کا اصلی فرض اور بعض شبہات کا ازالہ	۱۳۶
باب ۹	کیا شرک تقاضائے فطرت ہے	۱۵۹
باب ۱۰	شرک کا اصلی سبب	۱۶۹

حقیقتِ توحید

مقدمہ ۲۰۱
قرآن کے اوّلین مخاطب ۲۰۱
قرآن کا طرزِ استدلال ۲۰۲
قرآنی استدلال کی اساس ۲۰۴
بعض ضروری تنبیہات ۲۰۷
اس حصّہ میں مباحث کی ترتیب ۲۰۹
باب ۱ توحید کے عمومی دلائل ۲۱۱
دلائلِ آفاق ۲۱۱
۱۔ کائنات کا حسن وجمال ۲۱۱
۲۔ کائنات کے مختلف اجزاء کا باہمی توافق ۲۱۶
۳۔ ضد سے ضد کا وجود ۲۲۴
۴۔ متحدات سے مختلفات کا وجود ۲۲۶
۵۔ مظاہرِ کائنات کی تسخیر ۲۲۷
۶۔ کائنات کی محکم تدبیر ۲۲۹
۷۔ ہر نظمِ اجتماعی کے لیے لازم ہے کہ حاکمیت غیر منقسم ہو ۲۳۲

۸۔ حق و باطل کی آویزش اور حق کا غلبہ ۲۳۴
۹۔ اشارات ۲۳۸
باب ۲ توحید کے دلائلِ انفس ۲۴۳
۱۔ عہدِ فطرت ۲۴۴
۲۔ علم و یقین کی فطری طلب ۲۵۱
۳۔ فطرتِ انسانی کا علو ۲۵۴
۴۔ انسان کا ضعف و افتقار ۲۶۰
باب ۳ توحید کے خصوصی دلائل ۲۶۵
دلائل بلحاظ مستدعاتِ مخاطب ۲۶۵
۱۔ شرکاء کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے ۲۶۶
۲۔ لوازم سے استدلال ۲۷۰
۳۔ دلیلِ عدل ۲۸۸
۴۔ اہلِ کتاب اور منافقین ۲۹۰
باب ۴ پچھلے مباحث کا خلاصہ ۲۹۴
باب ۵ توحید کے اثرات ۲۹۷
باب ۶ توحید کی اہمیت دین میں ۳۰۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر

"میں اس بات کا آرزومند تھا کہ میری ناچیز تالیفات، بالخصوص تدبرِ قرآن کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داری کوئی ایسا شخص اٹھائے جو اس فکر کا حامل ہو جو ان کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے یہ آرزو پوری کر دی۔ عزیزم ماجد خاور صاحب سلمۂ میرے پرانے رفقاء میں سے ہیں۔ وہ نہ صرف میرے فکر سے بلکہ بحیثیتِ مجموعی پورے فکرِ فراہی سے بڑی گہری دل چسپی رکھتے ہیں۔ انہوں نے پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ اب اس فکر کی ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھا لیا ہے اور وہ اپنے ادارہ : فاران فاؤنڈیشن کو، اس کے قیام کے دن سے ہی، اسی مقصد کے لیے مختص کیے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی صلاحیتوں سے پوری توقع ہے کہ وہ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں گے اور خدا نے چاہا تو آئندہ تھوڑے عرصہ میں، ان کے اور ادارۂ تدبرِ قرآن و حدیث کے تعاون سے وہ قرآنی فکر و فلسفہ بالکل واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آ جائے گا جو اس عہد کے چیلنج کا اصل جواب ہے۔"

حضرت الاستاذ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی مدظلہ العالی نے جس بے پایاں محبت و اعتماد کا اظہار اپنی محولہ بالا تحریر ـــــ دیباچہ تدبرِ قرآن ـــــ میں فرمایا ہے

وہ مجھ عاجز کے لیے سرتاسر اعزاز ہے۔ اِن کے اور میرے درمیان اصلاً استاد و شاگرد کا رشتہ ہے جو ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا۔ مصنف و ناشر کا رشتہ ان کی نظرِ عنایت سے ۱۹۷۶ء میں استوار ہوا۔ انہوں نے میری تعلیم و تربیت میں آج تک جو کمالِ رافت فرمائی اور شفقت اٹھائی ہے کسی اسلوبِ بیان میں اس کا اظہار ناممکن ہے۔ ان سے نسبت ہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔ ان کے دیے ہوئے پروگرام کی تکمیل ہی میری زندگی کا مشن اور ترجیحِ اوّل ہے۔ انہوں نے جو شرف بخشا اور اپنے جس عظیم اعتماد کا اظہار فرمایا ہے خدائے بزرگ و برتر کے حضور ملتجی ہوں کہ وہ مجھے ان کی امیدوں کا مصداق بنائے اور فکرِ فراہی و اصلاحی کی ترویج و اشاعت کا جو زریں تاج مجھ بے مایہ فقیر کے سر پر سجایا گیا ہے اس کی لاج رکھے۔ وبیداللہ التوفیق!

حضرت الاستاذ کا ذوق آشنا ہوتے ہوئے میرے لیے یہ لازم تھا کہ ان کی نگارشات کو ان کے مطلوبہ پسندیدہ معیار کے مطابق پیش کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر ان پر کام شروع کر دیا۔ میں نے بیک وقت شاگرد و ناشر، دونوں حیثیتوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ الحمدللہ نظرِ ثانی اور ازسرِ نو کتابت کا بیشتر کام مکمل ہو چکا ہے اور اب تک اس کا غالب حصہ اشاعت کے مراحل بھی طے کر چکا ہے۔ یہ پیش کش بھی اسی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی ایک کوشش ہے۔

زیرِ نظر کتاب دو حصوں: حقیقتِ شرک اور حقیقتِ توحید پر مشتمل ہے۔ قبل ازیں اس کی اشاعت الگ الگ اجزاء کی شکل میں اور 'حقیقتِ دین' کے تحت بھی ہوتی رہی ہے۔ اب نفسِ مضمون کے اشتراک کی بنا پر ان کو یکجا کرنا مناسب خیال کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے جدید ایڈیشن میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا گیا ہے :

۱ - متن پر نہایت اہتمام سے نظر ثانی کی گئی ہے۔

۲ - قرآن مجید کے تمام حوالے مکمل نقل کیے گئے ہیں اور ان کا ترجمہ تدبر قرآن کے مطابق کر دیا گیا ہے۔

۳ - کتاب میں موجود تمام اقتباسات کو ان کے اصل ماخذوں سے تقابل کر کے درست کر دیا گیا ہے اور حوالے مکمل نقل کر دیے گئے ہیں۔ مزید برآں بعض جگہ اگر صرف ترجمہ دیا گیا تھا تو ان کی اصل عبارتیں بھی دے دی گئی ہیں۔

اس کتاب کے جدید ایڈیشن کی پیشکش کے غیر معمولی اہتمام کی وجہ سے اس کی دستیابی میں کچھ عرصہ تعطل رہا جس کے لیے میں انتہائی معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے کہ اس کے امتیازی محاسن کی روشنی میں اس کے قدرداں مجھے معاف فرما دیں گے۔ اب اس کا موجودہ ایڈیشن ان شاء اللہ ہمیشہ دستیاب رہے گا۔

اس پیش کش میں ہر ممکنہ احتیاط کے باوصف، اپنی کوتاہیوں کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔ میری درخواست ہے کہ اس کے قارئین بھی اس کام میں حصّہ لیں۔ ان کی جانب سے ہماری کوتاہیوں کی نشان دہی اور بہتری کی ہر قابلِ عمل تجویز خندہ پیشانی اور شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے گی اور آئندہ اشاعتوں میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس پیش کش کی صورت میں مجھ بندہ حقیر و فقیر سے جو خدمت بن پائی یہ سراسر اس کی توفیق اور تائید و نصرت کا کمال ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

لاہور — والسلام

۱۹ر دسمبر ۱۹۸۸ء — ماجد خاور

دیباچہ

اسلام کی اساس کلمہ ' لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ' ہے۔ یہ کتاب اس کی شرح ہے۔ اس کے حصّہ اوّل ـــــ حقیقتِ شرک ـــــ میں پہلے ٹکڑے یعنی ' لَآ اِلٰہَ ' اور حصّہ دوم ـــــ حقیقتِ توحید ـــــ میں دوسرے ٹکڑے یعنی ' اِلاَّ اللّٰہُ ' کی شرح ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ حصّہ اوّل میں بتایا گیا ہے کہ توحید کیا نہیں ہے۔ شرک کی حقیقت، اس کی قسمیں، اس کی خرابیاں اور انسانی فطرت سے اس کی نامناسبت پہلے حصّہ سے پوری طرح واضح ہو جائے گی۔ توحید کے دلائل کی تفصیل دوسرے حصّہ میں ہے۔

اس کتاب کے لکھنے سے مقصود یہ تھا کہ دین کے بنیادی عقائد کی وضاحت قرآنِ حکیم کے فطری و عقلی دلائل کی روشنی میں کی جائے۔ ہمارے متکلمین نے ان مسائل پر جس نہج سے بحث کی ہے وہ یونانیوں کے فرسودہ طریقِ استدلال سے ماخوذ ہے۔ جس کے اندر عقل و فطرت کے لیے کوئی اپیل نہیں ہے۔ میں نے چاہا کہ قرآنی علمِ کلام کا پورا سلسلہ مرتب کر دیا جائے یعنی شرک اور توحید کی طرح رسالت اور معاد سے متعلق تمام سوالوں کے جواب بھی قرآن کی روشنی میں دیے جائیں کہ قرآن کی عقلیت بھی آشکارا ہو اور عصرِ حاضر نے نئی نسل کے ذہنوں میں جو زہر پھیلائے ہیں ان کا تریاق بھی فراہم ہو۔ افسوس ہے کہ

میں کلیۃً تفسیر کی طرف متوجہ ہو جانے کے سبب سے اس سلسلہ کی دو پیشِ نظر کتابیں ——حقیقتِ رسالت اور حقیقتِ معاد—— مرتب کرنے کی فرصت نہ پا سکا۔ اگر یہ دونوں کتابیں بھی مرتب ہو جاتیں تو یہ سلسلہ مکمل ہو جاتا۔ لیکن ان تمام مسائل پر تدبر قرآن میں اتنی وضاحت کے ساتھ میں بحث کر رہا ہوں کہ میرے رفقاء میں سے کسی کو توجہ ہوئی تو وہ بڑی آسانی سے 'حقیقتِ رسالت' اور 'حقیقتِ معاد' کے لیے سارا مواد تفسیر کے صفحات میں سے فراہم کر لیں گے۔ مطالب میں ایک منطقی ترتیب قائم کرنے کے سوا کوئی اور زحمت ان کو اٹھانی نہیں پڑے گی۔

اس کتاب کی تالیف اہل قلم کے عام طریقہ کے مطابق نہیں ہوئی ہے کہ ایک عنوان سامنے آیا ہو اور محض ظاہری مناسبت کو سامنے رکھ کر اس سے متعلق کچھ آیتیں قرآن سے یکجا کر لی گئی ہوں اور کچھ مواد اِدھر اُدھر سے اکٹھا کر لیا گیا ہو اور پھر اس مواد کو جمع کر کے ایک کتاب بنا دی گئی ہو۔ بلکہ اس میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں تدبر قرآن کے سلسلہ میں میں نے بار بار جانچا پرکھا ہے، بار بار ان کے ضعف و قوت کا امتحان کیا ہے اور برسوں کی تنقید و تنقیح کے بعد اس خیال سے ان کو ٹانک رکھا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوگی تفسیر قرآن میں یہ اپنے اپنے مواقع میں بیان ہوں گے۔ ان ہی معلومات کا کچھ حصہ اس کتاب میں ایک مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ تاہم مجھے اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے سب ٹھیک ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مجھ سے لغزشیں ہوئی ہوں۔ پس جو اصحابِ علم کسی لغزش پر مجھے متنبہ فرمائیں گے میں نہایت مسرت اور کشادہ دلی کے ساتھ ان کی تنبیہات کا خیر مقدم کروں گا۔

یہ کاوش محض علمی تحقیق نہیں ہے، بلکہ ایک عظیم مقصد کے لیے دعوت کے ساتھ ساتھ وقت کے نظام اور وقت کی سوسائٹی پر تنقید بھی ہے۔ علمی تحقیقات کو بعض لوگ

خاموشی سے پڑھ لیتے ہیں، بعض اس کی تحسین کرتے ہیں، بعض اس کو مہمل قرار دیتے ہیں اور بعض یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، ان باتوں کو ہم بھی جانتے ہیں۔ لیکن وقت کے نظام اور سوسائٹی پر تنقید سے بہت سے لوگ آزردہ ہوتے ہیں اور بعض اوقات ان کی یہ آزردگی غصہ و غضب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مجھے تنقید کے جرم کا اقرار ہے اور اس کے لیے صفائی پیش کرنا فضول سمجھتا ہوں۔ لیکن میری نیت نیک ہے اور اللہ تعالیٰ سے ملتجی ہوں کہ اگر میرے قلم سے حق نکلا ہے تو اس کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے اور اس کے اجر و ثواب میں ان تمام دوستوں کو شریک کرے جو اس کتاب کے لکھنے کے محرک ہوئے اور اگر میرا قلم کہیں چوکا ہے تو اس کے اثر کو مٹا دے اور سب کو اس کے گناہ سے بچالے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

لاہور
یکم مارچ ۱۹۷۲ء

والسلام
امین احسن اصلاحی

۱

حقیقتِ شرک

تمہید

شرک کی معصیت دوسری تمام معصیتوں کے مقابل میں، ایسی سخت و شدید ہے کہ کوئی مسلمان اس کی ادنیٰ نسبت بھی اپنی طرف گوارا نہیں کرتا۔ ایک عامی سے عامی مسلمان بھی ہر قسم کے الزامات سہ لے گا، ہر قسم کی معصیتوں کی نسبت اپنی طرف گوارا کرلے گا، ہر طرح کی آلودگیوں اور ہر قسم کے گناہوں کا اعتراف کرلے گا، لیکن اگر آپ اس کے کسی عقیدہ یا عمل میں، کسی معمولی شائبۂ شرک کی بھی نشان دہی کیجیے گا تو تلملا اٹھے گا۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ جدید علوم و افکار سے متاثر ہیں، ان کا ذہین طبقہ بھی، بلا امتیاز مذہب و قوم، شرک سے بیزاری ضرور رکھتا ہے۔ خواہ توحید کے لیے اس کے اندر کوئی حمیت ہو یا نہ ہو۔ ان کا خیال ہے کہ اس زمانہ میں الحاد ہے یا توحید، شرک جیسی وہم پرستی میں اس زمانہ کا عقلیت پرست انسان مبتلا نہیں ہوسکتا، اور ان میں سے ہرگز کوئی شخص اس بات کا روادار نہ ہوگا کہ آپ اس کی طرف شرک کی نسبت کریں۔

ایک آدمی جس کے پاس قرآن و حدیث کا کچھ علم ہو، جب شرک سے لوگوں کی اس بیزاری و نفرت کو دیکھتا ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں کے اعمال و عقائد اور دنیا کے احوال و معاملات پر غور کرتا ہے تو اس پر سخت حیرت سی چھا جاتی ہے۔ وہ اپنے علم اور لوگوں کی شہادت میں کھلا ہوا تضاد پاتا ہے۔ وہ اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے کہ گوشہ گوشہ میں شرک کی نجاست پھیلی ہوئی ہے لیکن دوسروں کو اس بات پر متفق اللفظ پاتا

ہے کہ دنیا اس نجاست سے پاک ہو چکی ہے، اور اگر اس کا کچھ نشان باقی ہے تو ایسی ناقابلِ ذکر اور غیر مؤثر حالت میں ہے کہ اس کے لیے چنداں فکر و اہتمام کی حاجت نہیں ہے۔ زمانہ کی ترقی اور علم کی اس وسعت سے وہ آپ سے آپ مٹ جائے گا۔ اپنی رائے کی مخالفت میں دوسروں کا یہ اتفاقِ کلمہ ایک نیک نیت آدمی کو مشتبہ کر دیتا ہے اور بسا اوقات اپنے علم کو متہم کرنے لگ جاتا ہے کہ ممکن ہے میں نے ہی شرک کا مفہوم غلط سمجھا ہو، ممکن ہے توحید کی تعریف میں اصل حقیقت سے میں ہی دور جا پڑا ہوں۔ کمرے میں بدبو تو ضرور ہے لیکن جب سب یہی کہہ رہے ہیں کہ ہر طرف خوشبو ہی خوشبو پھیل رہی ہے تو ہو نہ ہو اس وقت کچھ میرا ہی دماغ گڑبڑ ہے۔ یہ چیز کچھ دیر کے لیے اس کو مذبذب اور متردد کر دیتی ہے، لیکن جب بار بار کے تجربہ کے بعد بھی اسے اپنی ہی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے اور بدبو کے وجود سے انکار کرنا اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے تو اس وقت دو ہی راہیں اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ اگر رائے عام کی مخالفت کی جرأت اس میں نہیں ہے تو وہ مجبور ہوتا ہے کہ دوسروں کی طرح خود بھی بدبو کو خوشبو کہنے لگے اور اگر رائے عام کی پروا اتنی نہیں ہے کہ اس کی خاطر حق کو جھٹلا سکے تو وہ اپنی قوتِ شامہ کی تصدیق کرتا ہے اور دوسروں کو یا تو صاف صاف خبردار کر دیتا ہے کہ وہ کسی مصلحت سے بدبو کو خوشبو کہہ رہے ہیں یا خیال کرتا ہے کہ ان کو خوشبو اور بدبو میں امتیاز ہی نہیں ہے۔

میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں اور دوسری مدعیٔ توحید جماعتوں کے بارہ میں یہی آخری رائے رکھتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر شرک سے جو بیزاری اور توحید کے لیے جو عصبیت ہے اس کے پیچھے کوئی صحیح علم و شعور نہیں ہے وہ محض ایک پندار ہے جو ان کی مذہبی و تاریخی روایات کے توارث پر قائم ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم دنیا میں ابطالِ شرک کی ایسی شاندار تاریخ رکھتے ہیں، کیسے ہو سکتا ہے کہ اسی باطل میں خود مبتلا ہو جائیں؟ مسلمانوں کے سوا جو دوسری جماعتیں توحید کی مدعی ہیں ان کے نزدیک شرک

سے بیزاری اور توحید کی حمایت ایک علمی تفاخر کے قسم کی چیز ہے جس طرح کوپرنیکس نے قدیم خیال کے خلاف دعویٰ کیا کہ زمین کی حرکت کا مرکز سورج ہے اور گیلی لیو نے دوربین ایجاد کر کے اس دعویٰ کو حقیقت ثابت کر دیا، اسی طرح جدید تجربات و مشاہدات نے ان لوگوں کے خیال میں شرک کی تمام وہم پرستیوں کو مٹا دیا ہے اور علم و تحقیق کے اس دور میں اب ان میں گرفتار ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ ان لوگوں کو کچھ خبر نہیں کہ شرک فی الحقیقت ہے کیا؟ اس کی صورتیں اور قسمیں کیا کیا ہیں؟ ہماری علمی، اخلاقی اور سیاسی زندگی پر اس کے کیا کیا اثرات پڑتے ہیں؟ ان میں سے وہ کسی ایک بات سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک اس معاملہ کی اہمیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ یہ دنیا کی ایک علمی غلطی تھی علمِ انسانی کی ترقی نے جس کی اصلاح کر دی۔ شرک کا ایک بہت ہی تنگ مفہوم 'بت پرستی' یا 'نیچر پرستی' ان کے ذہن میں ہے' اور ان کا کہنا یہ ہے کہ جب نیچر کے اتنے اسرار منکشف ہو چکے ہیں کہ قریب ہے انسان زمین آسمان اور زمان و مکان کے خداوند ہونے کا دعویٰ کر سکے تو دریاؤں، پہاڑوں، سیاروں اور ستاروں کی بندگی کے کیا معنی؟

یہ صورتِ حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک حکیمانہ بات یاد دلاتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ سے کسی شخص کی نیکی کی تعریف کی گئی کہ وہ تو اس قدر نیک ہے کہ بدی کو جانتا بھی نہیں۔ آپ نے اس کی تعریف سن کر فرمایا: 'تب تو اس کے بدی میں پڑ جانے کا بڑا احتمال ہے؛ کیونکہ جو شخص بدی اور نیکی میں امتیاز ہی نہیں کر سکتا وہ ہر وقت بدی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ٹھیک یہی حال ابنائے زمانہ کا ہے۔ یہ لوگ دین سے اس قدر بے خبر ہیں کہ دنیا کی اس سب سے بڑی برائی سے، جس کا نام شرک ہے، اچھی طرح واقف ہی نہیں ہیں، اور جو شخص بیماری کو بیماری جانتا ہی نہ ہو وہ اگر بیماری کا کچھ اندازہ نہ کر سکے یا بیماری ہی کو صحت خیال کرنے لگ جائے، تو کیا تعجب! پس

وقت کی ایک نہایت اہم ضرورت ہے کہ اس جاہلیت کی، جس کو قرآن نے ظلم عظیم کہا ہے، تشریح کی جائے تاکہ توحید کی صحیح حقیقت اجاگر ہو اور حق و باطل کے یہ دونوں نقطے اس قدر نمایاں ہو جائیں کہ التباس کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے: لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ (الانفال۔۸: ۴۲) (تاکہ جس کو ہلاک ہونا ہے حجت دیکھ کر ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے)۔

باب ۱

شرک کی حقیقت اور اس کے اقسام

کسی شے کا صحیح تصور اس کی صحیح تعریف کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، اس وجہ سے سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم شرک کی تعریف کریں اور اس کے بعد اس کے اقسام و فروع پر بحث کریں۔

قرآن مجید اور احادیثِ رسول میں جن چیزوں کو شرک قرار دیا گیا ہے، ان کو سامنے رکھ کر، اگر شرک کی تعریف کی جائے تو اس کی تعریف یہ ہوگی:

"خدا کی ذات یا اس کی صفات میں جس مفہوم میں وہ خدا کے لیے مستعمل ہیں یا اس کے حقوق میں کسی کو ساجھی ٹھہرانا"

اس تعریف کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے کسی قدر توضیح کی ضرورت ہے۔

خدا کی ذات میں شریک کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کو کسی سے یا کسی کو خدا سے قرار دینا، کسی کو اس کی ذات برادری سمجھنا، کسی کو اس کا باپ یا بیٹا کہنا۔ مثلاً عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ مسیح خدا کے جوہر سے ہیں یا خدا نے ان کو جنا ہے یا حضرت مریم خدا کی ماں ہیں یا عربوں کا یہ عقیدہ کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ یہ ساری باتیں خدا کے قدیم اور ازلی و ابدی ہونے اور ان تمام صفاتِ کمال کے منافی ہیں جن کا ماننا عقل، فطرت اور مذہب کی رو سے لازم ہے۔ یہ شرک فی الذات ہے[1]۔

---

[1] عقیدہ وحدتُ الوجود کی تقریر مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے اس کی بعض صورتیں =

صفات میں شریک کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ جو صفاتِ کمال خدا کے لیے مخصوص ہیں، مثلاً خلق، تدبیر، قدرت، علم، حکمت وغیرہ، ان میں کسی کو ساجھی قرار دینا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ قید لگی ہوئی ہے کہ جس مفہوم میں وہ خدا کے لیے مستعمل ہیں۔ اس قید کا فائدہ یہ ہے کہ یہی صفتیں بسا اوقات ہم اپنے ہی جیسے انسانوں کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ جب ہم ان کو خدا کے لیے بولتے ہیں تو ان کا مفہوم بالکل خاص ہوتا ہے جو اس بے چہ و با چہ ذات کے شایانِ شان ہوتا ہے، اور جب ان کو انسانوں کے لیے بولتے ہیں تو خدائی مفہوم سے بالکل الگ کرکے بولتے ہیں، مثلاً حکیم کی صفت ہم خدا اور آدمی دونوں کے لیے بولتے ہیں، لیکن جب اس کو خدا کے لیے بولتے ہیں تو اس کا مفہوم اور ہوتا ہے اور جب انسان کے لیے بولتے ہیں تو اس کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے اور اگر انسان کے لیے بھی اس صفت کو اس مفہوم میں بول دیں جس مفہوم میں خدا کے لیے بولتے ہیں تو یہ شرک فی الصفات ہوگا۔

حقوق میں شریک کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کی صفاتِ کمال سے جو باتیں لازم آتی ہیں یا جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں ان میں کسی کو شریک ٹھہرانا۔ مثلاً خدا خالق ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ تمام عالم میں حکم و انتظام اسی کا ہو۔ اب فرض کیجیے کہ ہم یہ تو مانیں کہ آسمان و زمین کا خالق خدا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی مان لیں کہ ان کا انتظام خدا کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں ہے تو یہ شرک فی اللوازم ہوگا اس لیے کہ خدا کے خالق ہونے سے جو بات لازم آتی ہے اس میں ہم خدا کے سوا ایک دوسرے کو شریک کر رہے ہیں حالانکہ جس نے خلق کیا ہے امر کا حق دار بھی وہی ہے، چنانچہ فرمایا ہے: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف - ۷ : ۵۴) (آگاہ کہ خلق اور امر اسی کے لیے خاص ہے)۔

= بالکل اس کے تحت آجاتی ہیں۔ بالخصوص جس صورت میں وہ گیتا اور ہندو فلسفہ میں ہے، اس کے شرک فی الذات ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔

جب تمام کائنات کی تدبیرِ امر اسی کے ہاتھ میں ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ بندگی صرف اسی کی کی جائے، اطاعت خالص اسی کی ہو، محبتِ حقیقی کا مرکز وہی ہو۔ اب فرض کیجیے کہ ہم خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کو بھی اختیار کریں، یا اس کی اطاعت کے خلاف کسی اور کی اطاعت کو جائز قرار دے لیں یا اس کی محبتِ حقیقی کا مرکز ٹھہرائیں تو یہ ساری باتیں شرک فی الحقوق میں شمار ہوں گی چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن نے یہ مطالبہ کیا ہے: وَمَآ اُمِرُوٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (البینۃ ۹۸:۵) (ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں، اسی کی خالص اطاعت کے ساتھ)۔

دوسری جگہ فرمایا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرۃ ۲: ۱۶۵) (جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں) یعنی دوسروں کے ساتھ ان کی محبت خدا کی محبت کے تحت ہوتی ہے۔

یہ شرک کی اصلی قسمیں ہوئیں ان کے علاوہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اگرچہ فی نفسہٖ شرک نہیں ہیں اور مذکورہ بالا اقسام میں سے کسی کے تحت وہ نہیں آتی ہیں، لیکن وہ صورتِ شرک یا ذریعۂ شرک ہیں، اگر ان کو باقی رکھا جائے تو اس کا اندیشہ ہے کہ وہ اصلی شرک کا دروازہ کھول دیں گی۔ اسلامی شریعت کا اصول یہ ہے کہ وہ اصلی گناہ کے ساتھ ساتھ ان ذرائع کا بھی سدباب کرتی ہے جو اس گناہ کے محرک ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے شریعت نے ان کو بھی ناجائز قرار دیا۔ مثلاً غیر اللہ کو سجدہ، یا بقصدِ تعظیم غیر اللہ کی قسم کھانا۔ چونکہ سجدہ ہمیشہ سے انتہائی تذلّل کی نشانی خیال کیا گیا ہے اور مشرک قومیں اپنے معبودوں کی قسمیں بھی کھایا کرتی تھیں، اس وجہ سے اسلام نے جو آخری اور مکمل شریعت ہے، ان تمام صورتوں کا بھی خاتمہ کر دیا جو ذریعۂ شرک ہو سکتی تھیں۔ اس قسم کے شرک کو شرکِ شبہی کہتے ہیں۔

شرک کی ان اقسام کی توضیح کے لیے مناسب ہوگا کہ ہم قرآن مجید سے ان کی مثالیں

پیش کریں۔

قرآن نے اپنے زمانۂ نزول میں جن جماعتوں سے براہِ راست خطاب کیا ہے اور ان کے اعمال و معتقدات میں شرک کا پتا دیا ہے، وہ تین ہیں: اہلِ عرب (بنی اسماعیل)، اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ)، اور منافقین۔ ان تینوں جماعتوں میں اہلِ عرب کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ قرآن نے ان کے لیے 'مشرکین' کا لفظ بطور علم اور صفت کے استعمال کیا ہے۔ بقیہ جماعتوں کی طرف فعلِ شرک کی نسبت تو ضرور کی ہے لیکن 'مشرک یا مشرکین' کا لفظ بطریق علم یا صفت ان کے لیے استعمال نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری جماعتیں توحید کو اساس اور بنیاد کی حیثیت سے تسلیم کرتی تھیں۔ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان توحید بطور ایک مسلمہ اور قدرِ مشترک کے تھی۔ یہود اور نصاریٰ میں سے کوئی بھی توحید کا منکر نہیں تھا۔ اور منافقین تو اپنے تمام ظاہری اعمال و اعترافات میں گویا مسلمان ہی تھے۔ ان گروہوں کے اندر جو شرک تھا وہ ان کے اقرار و اعلان کے بالکل خلاف تھا۔ برعکس اس کے مشرکین شرک کو بطور ایک اساسی عقیدہ کے تسلیم کرتے تھے۔ خدائی کے اس کارخانہ میں ان کے شرکاء نہ صرف شریک تھے بلکہ وہ ناگزیر تھے۔ شرک کو تسلیم کیے بغیر ان کے نزدیک اس کائنات کا معمّہ حل ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی اس اہمیت کی وجہ سے شرک و توحید کی بحث میں قرآن نے بھی ان کو مقدم رکھا ہے اور ہم بھی ان کو مقدم رکھیں گے۔ چنانچہ ان کے اندر قرآن نے شرک کے جن اقسام کی نشان دہی کی ہے، ہم پہلے ان کو اجمال کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

باب — ۲

مشرکین کا شرک

اہلِ عرب کے متعلق سب سے پہلی بات یہ جاننی چاہیے کہ ان میں کوئی جماعت خدا کی منکر نہیں تھی۔ بعض لوگوں نے ان کے قول ﴿وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ﴾ (الجاثیۃ ۲۵:۲۴) (ہم کو تو بس گردشِ زمانہ فنا کرتی ہے) سے یہ استدلال کیا ہے کہ ان میں بعض جماعتیں خدا کی منکر یا باصطلاحِ جدید نیچری (NATURALIST) تھیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ عربوں میں نزولِ قرآن کے وقت دہریوں کی کوئی جماعت موجود نہیں تھی۔ ﴿وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ﴾ (الجاثیۃ۔ ۲۵: ۲۴) جو وہ کہتے تھے تو اس سے ان کا مقصود خدا کی ہستی کا انکار نہیں ہوتا تھا، بلکہ یہ بات وہ قرآن کے اس دعوے کی تردید میں کہتے تھے کہ قوم کے عروج و زوال کا انحصار اس کے عقائد و اعمال کے صلاح و فساد پر ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کے لیے قرآن مجید ایک اخلاقی بنیاد قرار دیتا تھا۔ وہ عاد، ثمود، قومِ لوط، اہلِ مدین اور قومِ فرعون کی تباہی کا سبب ان کے کفر و شرک، ظلم و سرکشی، فسق و عدوان اور ان کے دوسرے عملی و اعتقادی فسادات کو بتاتا تھا اور عربوں کو متنبہ کرتا تھا کہ اگر انھوں نے اپنی اعتقادی و اخلاقی غلطیوں کی اصلاح نہ کی تو اپنی قوت و جمعیت کے باوجود مذکورہ قوموں کی طرح وہ بھی تباہ ہو جائیں گے۔ یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ قوم کے عروج و زوال میں کسی اخلاقی اصول کو کارفرما نہیں مانتے تھے۔ وہ قوم کو ایک درخت کے مانند سمجھتے تھے، جو اُگتا ہے، نشوونما پاتا

ہے، پھل پھول لاتا ہے، یہاں تک کہ اپنی فطری قوتیں نچوڑ کر ایک دن گردشِ لیل ونہا کی نذر ہو جاتا ہے یا ایک فرد کے مانند سمجھتے تھے، جو پیدا ہو جاتا ہے، جوان ہوتا ہے، پھر کسی بیماری کے سبب سے، یا درازیٔ عمر سے، ایک دن مر جاتا ہے۔ موت و زیست کا جو طبیعیاتی ضابطہ کائنات کے ہر گوشہ میں کام کر رہا ہے وہ اسی ضابطہ کو قوموں کی موت و زیست میں بھی کارفرما مانتے تھے اور اپنے شعروں میں اسی نقطۂ نظر سے گزشتہ اقوام و قبائل کی تباہی کا ذکر کرتے تھے۔

قرآن مجید نے تاریخ ایک نئے نقطۂ نظر سے پیش کی جو ان کے اس مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے بالکل مختلف تھا اور دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ان سے نئے اصولِ زندگی کا مطالبہ کرتا تھا جو ان کی خواہشاتِ نفس کے بالکل خلاف تھا۔ اس وجہ سے وہ اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، اور جواب میں یہ کہتے تھے کہ 'وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ' قوم کی موت و زیست کو اصولوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قوموں کو تو صرف گردشِ روزگا فنا کرتی ہے۔ قوم کی بدی کو اس کی تباہی میں کوئی دخل نہیں ہوا کرتا۔ اٹلی کے مشہور سیاسی فلسفی میکیاولی کا مذہب بھی یہی ہے۔ وہ جب یہ کہتا ہے کہ حکومت ایک مجرد سیاسی وجود ہے' وہ نہ اخلاقی ہے نہ قانونی، فرمانروا اور مدبرینِ ملک کے تمام اعمالِ سیاسی کا محور صرف فائدہ پر ہی کو ہونا چاہیے، جس کام میں حکومت کا بھلا ہو رہا ہو یا جس بات کے لیے حکومت کی قوت و صلاحیت مقتضی ہو، وہ ان کو کر گزرنی چاہیے اس میں کسی ضابطۂ قانونی و اخلاقی کو مانع نہیں ہونا چاہیے تو وہ درحقیقت کوئی نئی بات نہیں کہتا، بلکہ ٹھیک ٹھیک عرب جاہلیت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔

الغرض اہلِ عرب نہ تو خدا کے منکر تھے اور نہ وہ خدا کی بنیادی صفات میں سے کسی صفت کے منکر تھے۔ وہ زمین و آسمان، سورج اور چاند اور ابر و ہوا کا خالق خدا ہی کو مانتے تھے۔ زندگی بخشنے والا، روزی دینے والا اور زندگی لینے والا اسی کو کہتے تھے۔ اپنی تمام قوتوں اور

قابلیتوں کو اسی کا عطیہ جانتے تھے۔ اس کائنات کا انتظام و انصرام اسی کے دست تصرف میں سمجھتے تھے، لیکن ساتھ ہی بعض ایسی باتیں بھی مانتے اور کرتے تھے جن سے یا تو خدا کی صفتوں اور ان کے مقتضیات کا انکار لازم آتا تھا، جو کفر ہے، یا خدا کی صفات اور اس کے حقوق میں دوسروں کی حصہ داری لازم آتی تھی، جو شرک ہے۔ قرآن نے ان کے اس تناقض پر ان کو جگہ جگہ متنبہ کیا ہے۔ ہم صرف دو آیات نقل کرتے ہیں، جو کافی ہوں گی:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۔ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ښ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (یونس ۱۰: ۳۱-۳۲)	ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ یا کون ہے جو سمع اور بصر پر اختیار رکھتا ہے اور کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ کون ہے جو ساری کائنات کا انتظام فرماتا ہے؟ تو جواب دیں گے: اللہ! تو ان سے کہو کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں! پس وہی اللہ تمہارا رب حقیقی ہے تو حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہے تو کہاں تمہاری عقل الٹ جاتی ہے؟

اس تناقض نے اہل عرب کو خدا کی عبادت کے ساتھ ساتھ دوسرے بہت سے خداؤں کی پرستش میں مبتلا کر دیا تھا جس سے خدا کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق میں شرک کی بہت سی قسمیں پیدا ہو گئیں اور وہ آہستہ آہستہ ان پر چھاتی چلی گئیں۔

قرآن کی روشنی میں اگر ان کی مشرکانہ پرستشوں کی تحلیل کی جائے تو ان کی پانچ قسمیں نکلیں گی: ملائکہ پرستی، جنات پرستی، کواکب پرستی، آباد پرستی اور خود پرستی۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک پر، اختصار کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

۱۔ ملائکہ پرستی:

اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں اور اس کی اولاد قرار دیتے تھے، جو صریحاً شرک فی الذات ہے اور اس سے اس کی شانِ بے ہمگی اور اس کے استغناء کی نفی لازم آتی ہے جو کھلا ہوا کفر ہے۔ قرآن نے ان کے اس عقیدہ کی تردید اس طرح فرمائی ہے:

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ	یہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہے۔ وہ ایسی
هُوَ الْغَنِيُّ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ	باتوں سے پاک ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ جو
وَمَا فِي الْاَرْضِ اِنْ عِنْدَكُمْ	کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا
مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا اَتَقُوْلُوْنَ	ہے۔ تمہارے پاس اس بات کی کوئی دلیل
عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝	نہیں ہے۔ کیا تم اللہ پر وہ بات لگاتے
(یونس ۱۰: ۶۸)	ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے؟

ان فرشتوں کو وہ خدا سے قربت کا وہ مقام دیتے تھے جو عبدیت و بندگی کے مقام سے بالاتر اور الوہیت کے مقام سے قریب تر ہے اور یہ کھلا ہوا شرک فی الصفات ہے۔ قرآن نے اس کی تردید فرمائی:

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ	اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جتنے آسمانوں
وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ	اور زمین میں جاندار ہیں اور فرشتے
وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ	بھی، وہ سرتابی نہیں کرتے۔ وہ
يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ	اپنے اوپر رب سے ڈرتے ہیں اور
وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝	وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ملتا ہے۔

(النحل ۱۶: ۴۹-۵۰)

(تکبر نہیں کرتے) یعنی اپنے تئیں بندگی سے بالاتر نہیں سمجھتے، اپنے رب سے

ڈرتے ہیں اپنے اوپر سے۔ یعنی قربت حاصل ہونے کے باوجود خدا کے ساحت جلال تک ان میں سے کسی کی رسائی نہیں ہے۔ بس اوپر سے جو حکم نازل ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ یُؤْمَرُوْنَ عربی زبان میں مجہول کا صیغہ ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ حکم دینے والے کا مقام ان کی پہنچ سے بالاتر ہے۔ اس وجہ سے بجائے اس کے کہ وہ اپنی اس قربت پر فخر کریں اور یہ گمان کرنے لگ جائیں کہ اب وہ جو چاہیں خدا سے کرا سکتے ہیں۔ جیسا کہ مشرکین کا ان کے بارہ میں خیال ہے، وہ ہر وقت خدا کی بندگی و اطاعت میں سرگرم اور اس کی خوشنودی اور قربت کے طلب گار رہتے ہیں: یَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ (بنی اسرآئیل - ۱۷ : ۵۷) (وہ تو خود ہی اپنے رب کے قرب کی طلب میں سرگرم ہیں کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ قرب حاصل کرتا ہے)۔

مشرکین اپنے لیے بلا کسی واسطہ کے خدا کی قربت ناممکن خیال کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان فرشتوں کو خدا تک رسائی کا وسیلہ بناتے تھے اور ان کی بندگی کرتے تھے اور اس طرح شرک فی اللوازم یا شرک فی العبادت کی بدعت شروع ہوئی۔ قرآن مجید نے خود ان کی زبان سے ان کی ملائکہ پرستی کی یہی توجیہ پیش کی ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ	اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے
دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ	کارساز بنا رکھے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم
اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط	تو ان کی عبادت صرف اس لیے
(الزمر - ۳۹ : ۳)	کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے قریب تر کر دیں

دنیا کی فارغ البالی اور خوش حالی ان فرشتوں کی بندگی کی برکت سمجھتے۔ ان کے خیال میں اولاد ان کی عنایت سے ملتی تھی۔ چنانچہ قرآن نے ان کے اس خیال کا اظہار کر کے اس کی تردید فرمائی ہے:

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا	تو جب اللہ ان کو تندرست اولاد

جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ
فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝
اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا
وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ ۖ
(الاعراف - ۷ : ۱۹۰ - ۱۹۱)

دے دیتا ہے تو اس کی بخشی ہوئی چیزوں میں وہ اس کے لیے دوسرے شریک ٹھہراتے ہیں۔ اللہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں کیا وہ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں۔

اسی طرح روزی، ان کے خیال میں، فرشتوں کی عنایت سے ملتی تھی۔ قرآن نے ان کے اس گمان کی تردید فرمائی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ
رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ
الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا
لَهٗ ۭ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝
(العنکبوت - ۲۹ : ۱۷)

جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو یہ تمہارے لیے رزق پر کوئی اختیار نہیں رکھتے تو اللہ ہی کے پاس رزق کے طالب بنو اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کے شکر گزار رہو۔ اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اہل عرب موت کے بعد کی زندگی اور حساب و کتاب کو اگرچہ مستبعد خیال کرتے تھے، لیکن کہتے تھے کہ بالفرض مرنے کے بعد اٹھنا ہی پڑا اور حساب و کتاب کی نوبت ہی آئی تو یہ فرشتے جن کو ہم پوجتے ہیں ہماری سفارش کریں گے اور ہم پر کوئی آنچ نہ آنے دیں گے۔ ان کے اس عقیدہ سے ایک طرف خدا کی صفت علم و عدل اور حکمت کا انکار لازم آتا ہے جو کفر ہے[1] اور دوسری طرف یہ خدا کی صفتوں میں غیر اللہ کو شریک کرنا ہے جو کھلا ہوا

[1] اس عقیدہ سے خدا کی صفات علم، عدل و حکمت کا انکار کس طرح لازم آتا ہے؟ اس سوال کا تفصیلی جواب 'حقیقت توحید' میں ملے گا۔ ہم یہاں صرف بالاجمال اہل عرب کے مشرکیہ عقائد کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

شرک ہے۔ قرآن نے اس کی مختلف پہلوؤں سے تردید کی ہے۔ ہم بعض آیتیں یہاں نقل کرتے ہیں، جن سے ان کے عقیدہ کا اصل پہلو بھی واضح ہوجائے گا اور قرآن نے جس پہلو سے اس کی تردید کی ہے، وہ بھی سامنے آجائے گا:

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ۝ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ۝ أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۙ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ۝ سَلْهُمْ أَيُّهُمْ بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ ۝ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ ۝

(القلم - ۶۸ : ۳۵ - ۴۱)

کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر کردیں گے! تمھیں کیا ہوا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو! کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو، اس میں تمھارے لیے وہی کچھ ہے جو تم پسند کرو گے! کیا تمھارے لیے ہمارے اوپر قسمیں ہیں قیامت تک باقی رہنے والی کہ تمھارے لیے وہی کچھ ہے جو تم فیصلہ کرو گے! ان سے پوچھو ان میں سے کون اس کا ضامن بنتا ہے! کیا ان کے کچھ شرکاء ہیں! تو وہ لائیں اپنے شریکوں کو اگر وہ سچے ہیں!

سورۂ نجم میں ان فرشتوں کے نام بھی قرآن نے گنا دیے ہیں جن کی شفاعت پر اہل عرب کو بڑا اعتماد تھا اور ایک دوسرے پہلو سے ان کے شریک خدا یا شفیع ہونے کی تردید بھی کردی ہے:

أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ ۝ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ۝ أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثَىٰ ۝ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ ۝ إِنْ هِيَ

بھلا، کبھی غور کیا ہے لات اور عزیٰ اور منات پر جو تیسری اور درجے کے اعتبار سے دوسری ہے! تم اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں!

إِلَّآ أَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُم مَّآ أَنزَلَ ٱللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَٰنٍ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا ٱلظَّنَّ وَمَا تَهْوَى ٱلْأَنفُسُ ۖ وَلَقَدْ جَآءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ ٱلْهُدَىٰٓ

(النجم۔ ۵۳: ۱۹-۲۳)

یہ تو بڑی ہی بھونڈی تقسیم ہوئی! یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں، اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری، یہ لوگ محض گمان اور نفس کی خواہش کی پیروی کر رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے نہایت واضح ہدایت آچکی ہے۔

ان آیتوں میں لات، منوٰۃ اور عزیٰ کا جو ذکر آیا ہے، یہ تینوں فرشتوں کے بت تھے اور تینوں کے نام عورتوں کے نام پر تھے ان کی شفاعت پر مشرکین کو بڑا اعتماد تھا۔ اہلِ عرب ان کا طواف کرتے تھے اور طواف کے وقت یہ الفاظ دہراتے تھے: "تلک الغرانیق العلی وان شفاعتهن لترتجی" (یہ بلند مرتبہ ہیں اور ان کی شفاعت کی امید ہے) آگے کی آیات میں ان کے اسی خیال کی تردید ہو رہی ہے:

أَمْ لِلْإِنسَٰنِ مَا تَمَنَّىٰ ۝ فَلِلَّهِ ٱلْءَاخِرَةُ وَٱلْأُولَىٰ ۝ وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ لَا تُغْنِى شَفَٰعَتُهُمْ شَيْـًٔا إِلَّا مِنۢ بَعْدِ أَن يَأْذَنَ ٱللَّهُ لِمَن يَشَآءُ وَيَرْضَىٰٓ ۝ إِنَّ ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِٱلْءَاخِرَةِ لَيُسَمُّونَ ٱلْمَلَٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ ٱلْأُنثَىٰ ۝

(النجم۔ ۵۳: ۲۴-۲۷)

کیا انسان وہ سب کچھ پالے گا جو وہ تمنا رکھتا ہے! سو یاد رکھو کہ آخرت اور دنیا سب خدا ہی کے اختیار میں ہے اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش ذرا بھی کام آنے والی نہیں مگر بعد اس کے کہ اللہ اجازت دے جس کو چاہے اور جس کے لیے پسند کرے، جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انہی نے فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھ چھوڑے ہیں۔

اس کے بعد شفاعت کے ابطال کی دلیل بیان فرمائی ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ شفاعت "

نیک کو بد اور بد کو نیک بنا دے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے عدل اور حکمت کے بالکل خلاف ہے۔ ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پائے گا۔ خدا کی رحمت کے مستحق وہی ٹھہریں گے جو بھلے کام کریں گے۔ گناہوں اور بدکاریوں سے بچیں گے۔ ہاں کبھی لغزش اور خواہش نفس کے غلبہ سے کسی بدی میں آلودہ ہو جائیں گے تو یہ علیحدہ چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا دامن بہت وسیع ہے۔ وہ بڑی برائیوں سے بچنے والوں کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں سے درگزر فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۚ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۚ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۚ

(النجم — ۵۳: ۳۱-۳۲)

اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے کہ وہ بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے بُرے کام کیے ہیں، ان کے کیے کا، اور بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے اچھے کام کیے ہیں اچھا۔ یعنی ان لوگوں کو جو بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائی سے بچتے رہے بجز یہ کہ کبھی کسی برائی پر پاؤں پڑ گئے۔ بے شک تیرے رب کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔

جن فرشتوں سے یہ امیدیں وابستہ کی گئیں لازماً وہ اس درجہ کی محبت کے بھی سزاوار قرار پائے جو صفاتِ الٰہی کے مقتضیات و لوازم اور اللہ تعالیٰ کے خاص حقوق میں سے ہے اور جو اسی کے لیے مخصوص ہونی چاہیے۔ قرآن مجید ان کے اس شرک فی الحقوق کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے ہمسر ٹھہراتے ہیں جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے لیکن

اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝

(البقرۃ - ۲ : ۱۶۵)

جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں اور اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اس وقت کو دیکھ سکتے جب کہ یہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی کہ سارا زور اور اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اللہ بڑا ہی سخت عذاب دینے والا ہے۔

'یُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ' (جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے) کا مطلب یہ ہے کہ ان فرشتوں کے ساتھ ان کی یہ محبت مستقل محبت ہے۔ خدا کی محبت کے تابع نہیں ہے، اور جو محبت خدا کی محبت کے تابع نہ ہو وہ شرک ہے۔ اہلِ ایمان کی محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی ہوتی ہے کہ دوسری تمام محبتیں اس کے تابع ہو جاتی ہیں جہاں کوئی محبت خدا کی محبت سے متصادم ہوئی انہوں نے فوراً اس سے استعفا دے دیا۔ یہ نہیں ہے کہ اس کی خاطر خدا اور اس کی شریعت کو نظرانداز کر بیٹھے۔ یہی مفہوم ہے 'وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ' کا۔

ان تمام امیدوں اور نیاز مندیوں کے بعد ان فرشتوں کی نسبت یہ عقیدہ رکھنا بھی لازم ہو گیا کہ وہ ان ساری دعاؤں اور عبادتوں اور اپنی بندگی کرنے والوں کے حالات سے باخبر بھی ہیں، کیونکہ اس کے بغیر ان کی بندگی کرنے اور ان سے محبت کرنے کا فائدہ کیا؟ چنانچہ صفتِ علم کے اس مفہوم میں وہ شریک ہوتے جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے قرآن نے اس کی تردید کی ہے:

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ

اور یاد کرو اس دن کو جس دن ہم سب

نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ۝

(یونس - ۱۰: ۲۸-۲۹)

کو اکٹھا کریں گے پھر ہم شرک کرنے والوں کو حکم دیں گے کہ تم اور تمہارے شرکاء اپنی جگہ ٹھہرو پھر ہم ان کے درمیان تفریق کریں گے اور ان کے شریک کہیں گے، تم ہم کو تو نہیں پوجتے تھے، اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے ہم تمہاری عبادت سے بالکل ہی بے خبر رہے۔ اُس وقت ہر شخص اپنے اس عمل سے دوچار ہوگا جو اس نے کیا ہوگا اور لوگ اپنے مولائے حقیقی کے حضور پیش ہوں گے اور افترا کرکے انہوں نے جو معبود بنا رکھے تھے وہ سب ہوا ہو جائیں گے۔

۲ - جنات پرستی:

ملائکہ کی طرح جنات کو بھی اہلِ عرب بندگی سے مافوق اور زمرۂ الوہیت سے نسبت رکھنے والی مخلوق خیال کرتے تھے۔ قرآن نے ان کے اس خیال کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ ۝ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝

(الصّٰفّٰت - ۳۷: ۱۵۸-۱۵۹)

اور انہوں نے خدا اور جنوں کے درمیان بھی رشتہ جوڑ رکھا ہے اور جنوں کو خوب پتا ہے کہ وہ عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔

اس نسبتِ بندگی کی وجہ سے لازماً خدائی میں یہ جنات بھی شریک قرار دیے گئے:

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ۔ (الانعام - ۶ : ۱۰۱)

اور انہوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا۔

ان جنوں کو بالکل اس مفہوم میں نافع وضار خیال کیا جانے لگا جس مفہوم میں خدا کو نافع وضار خیال کیا جانا چاہیے۔ یعنی یہ سمجھا جانے لگا کہ اگر یہ کسی کو نقصان پہنچائیں تو کوئی ان کو روکنے والا نہیں اور اگر کسی کو نفع پہنچائیں تو کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض اوقات ان کے جوش غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے انسانی جانوں کی قربانی کی جانے لگی جو تذلل اور نیاز کا آخری درجہ ہے اور خدا کے سوا کوئی نہیں ہے جو اس کا حقدار ہو سکے۔ اگرچہ اس نے بھی بندوں سے اس صورت میں اس کا مطالبہ نہیں کیا ہے جس صورت میں مشرکین اپنے ان شرکاء کے لیے جانی قربانیاں پیش کرتے تھے۔ قرآن اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے :

زَیَّنَ لِکَثِیْرٍ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ قَتْلَ اَوْلَادِھِمْ شُرَکَآؤُھُمْ (الانعام - ۶ : ۱۳۷)

بہت سے مشرکین کی نظر میں ان کے شرکاء نے ان کی اولاد کے قتل کو ایک مستحسن فعل بنا دیا ہے۔

مصائب وآفات میں ان کی دہائی دی جاتی اور پناہ بھی پکڑی جاتی :

وَاَنَّهٗ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ۔ (الجن - ۷۲ : ۶)

اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو جنوں میں سے بعض کی دہائی دیتے رہے ہیں۔

زمرۂ الوہیت میں سے خیال کیے جانے کی وجہ سے یہ بھی خیال کیا جانے لگا کہ ان کی رسائی ملاء اعلیٰ تک ہے۔ وہاں سے غیب کی خبریں لاتے ہیں اور کاہنوں کو پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ کہانت کے بازار کی ساری رونق انہیں کے دم سے تھی۔ قرآن نے اس

کی تردید کی:

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ۝ لَا يَسَّمَّعُونَ إِلَى الْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ وَيُقْذَفُونَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُورًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ ۝ إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝

(الصّٰفّٰت — ۳۷ : ۶-۱۰)

بے شک ہم ہی نے سجایا ہے سماءِ دنیا کو ستاروں کی زینت سے اور اس کو محفوظ کیا ہے اچھی طرح ہر سرکش شیطان کی دراندازی سے اور وہ ملاءِ اعلیٰ کی طرف کان نہیں لگانے پاتے اور وہ ہر جانب سے دھتکارے جاتے ہیں، کھدیڑنے کے لیے اور ان کے لیے ایک دائمی عذاب ہے۔ مگر یہ کہ کوئی اچک لے کوئی بات تو ایک دہکتا شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔

غیب دانی کے شوق میں کاہنوں نے ان سے تعلق پیدا کیا اور اس راستے ایک خلقِ کثیر کو انہوں نے سفلی علوم کے فتنوں میں مبتلا کر دیا اور جنوں کی پرستش شروع ہو گئی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے:

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُم مِّنَ الْإِنسِ ۖ

(الانعام — ۶ : ۱۲۹)

اے جنوں کے گروہ، تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا لیا۔

یہ کاہن لوگ عبدیت و نیاز کے تمام لوازم ان کے لیے پورے کرتے اور غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے ان کا مراقبہ کرتے اور پھر جاہل عوام غیب کی باتیں معلوم کرنے کے شوق میں جب ان کے پاس آتے تو ان کی جھوٹی سچی باتیں بتا کر ان کو اُلّو بناتے۔ قرآن نے ان کی مکاری کا ذکر کیا ہے:

يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ۝

(الشعراء — ۲۶ : ۲۲۳)

وہ کان لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

قرآن مجید چونکہ مسجع اور مقفّیٰ ہے اور کاہنوں کا کلام بھی مسجع اور مقفّیٰ ہوتا تھا۔ نیز قرآن مجید میں پیشین گوئیاں اور کاہنوں کے کلام میں بھی پیشین گوئیاں ہوتی تھیں، اس وجہ سے اس ظاہری مشابہت کی بنا پر ابتدائے نبوت میں قریش نے طعنہ دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کاہن ہیں اور یہ وحی فرشتوں کی لائی ہوئی وحی نہیں ہے بلکہ جس طرح کاہنوں پر جنّات وحی لاتے ہیں اسی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بھی جنّات وحی لاتے ہیں۔ قرآن نے اس کی تردید کی:

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝	اور اس کو شیاطین لے کر نہیں اترے
وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝	ہیں۔ نہ یہ ان کے لیے لائق ہے اور
اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۝	نہ یہ ان کے بس کا ہے۔ وہ سن گن لینے
(الشعراء – ۲۶: ۲۱۰ – ۲۱۲)	سے معزول کیے جا چکے ہیں۔

قرآن نے جو پہلا جواب قریش کو دیا ہے، بعینہٖ وہی جواب اس سے پہلے اس طرح کے شبہ کے جواب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے معترض فریسیوں کو دیا تھا۔ فریسیوں نے جب حضرت مسیح علیہ السلام کے پُرتاثیر کلام کو سنا اور ان کے معجزوں اور کارناموں کو دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ لوگ برابر ان کے گرویدہ ہوتے چلے جا رہے ہیں تو ان کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے اور عوام کو ان سے بدگمان کرنے کے لیے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ انہوں نے بڑے شیطان بعلزبول کو کسی عمل کے ذریعہ سے اپنے قابو میں کر لیا ہے اور اسی کی مدد سے یہ معجزے دکھاتے ہیں اور رعب جمانے کے لیے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ وہ خدا کی مدد سے کر رہے ہیں۔ انجیل میں ہے:

"فریسیوں نے سن کر کہا: یہ بدروحوں کے سردار، بعلزبول کی مدد کے بغیر بدروحوں کو نہیں نکالتا۔ اس نے (مسیح نے) ان کے خیالوں کو جان کر ان سے کہا: جس بادشاہی میں پھوٹ پڑتی ہے وہ ویران ہو جاتی ہے۔ اور جس شہر یا گھر میں پھوٹ پڑے گی وہ قائم نہ رہے گا۔ اور اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنا مخالف

ہو گیا۔ پھر اس کی بادشاہی کیونکر قائم رہے گی؟[1]

قرآن نے بھی 'وَمَا يَنْبَغِيْ لَهُمْ' کے الفاظ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ وحی جس کا ایک ایک حرف شیطان اور اس کے سارے مقاصد و محبوبات کے بالکل خلاف ہے، شیطان کی مدد سے کیسے ہو سکتی ہے؟ وہ خود اپنے کاروبارِ ضلالت کو درہم برہم کرنے کے لیے ایسا مبارک صحیفۂ ہدایت کیسے نازل کر سکتا ہے؟ اگر وہ ایسا کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنی سلطنت خود اپنے ہاتھوں برباد کر ڈالی اور آپ اپنا دشمن بن گیا۔

دوسرا ٹکڑا 'وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ' (اور نہ یہ ان کے بس کا ہے۔ وہ سن گن لینے سے معزول کیے جا چکے ہیں) اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کا سورۂ صافات والی آیات میں اوپر ذکر آ چکا ہے اور جس کا جنات نے خود، سورۂ جن میں اعتراف کیا ہے:

وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ	اور ہم اس کے بعض ٹھکانوں میں کچھ
لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ	سن گن لینے کو بیٹھا کرتے تھے۔ اب جو
يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا	سنے گا تو وہ ایک شہاب کو اپنی گھات
(الجن - ۷۲ : ۹)	میں پائے گا۔

ملاءِ اعلیٰ سے جنات کے اس تعلق کی قرآن نے جگہ جگہ تردید کی ہے اور بار بار یہ بات بیان فرمائی ہے کہ قرآن شیطانی تصرف سے بالکل پاک ہے اور ایسے مواقع پر بالعموم ستاروں کے گرنے، ان کے ٹوٹنے اور ان کے پھینکے جانے کی بطورِ شہادت قسم بھی کھائی ہے جس سے شہابِ ثاقب کا گرنا اور شیاطین کا دھتکارا جانا مراد ہے۔ سورۂ واقعہ سورۂ حاقہ، سورۂ تکویر اور سورۂ نجم میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ سورۂ شعراء میں ایک

---

[1] انجیل متی۔ باب ۱۲: ۲۲-۲۶

دوسرے پہلو سے اس کی تردید کی ہے۔ فرمایا کہ پیغمبر پر شیاطین نہیں آسکتے۔ جس طرح مکھی صرف غلیظ اور نجس چیزوں پر بیٹھتی ہے۔ اسی طرح جنات و شیاطین صرف گندی اور نجس روحوں پر ہی اترتے ہیں، وہ خدا کے رسولوں اور نبیوں پر آنے کی جرأت نہیں کرسکتے اور نہ ان کے کلام میں اپنی باتوں کی کوئی ملاوٹ کرسکتے ہیں:

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ	کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کن
الشَّيَاطِينُ ۝ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ	پر اترتے ہیں! وہ ہر جھوٹے، بدکار
أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يُلْقُونَ السَّمْعَ	پر اترتے ہیں، جو کان لگاتے ہیں اور ان
وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ۝	میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

(الشعراء ۲۶: ۲۲۱-۲۲۳)

۳۔ کواکب پرستی

دنیا کی تقریباً تمام بت پرست قوموں میں سورج اور چاند کی پرستش رائج رہی ہے۔ اہل عرب بھی ان کو زہرہ اور بیت میں خیال کرتے تھے۔ قرآن نے اس کی تردید کی:

وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ	اور اسی کی نشانیوں میں سے رات اور
وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۚ لَا تَسْجُدُوا	دن، سورج اور چاند بھی ہیں۔ نہ سجدہ
لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا	کرو سورج کو اور نہ چاند کو، بلکہ سجدہ
لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِنْ كُنْتُمْ	کرو اس اللہ کو جس نے ان ساری
إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝	چیزوں کو پیدا کیا ہے اگر تم اسی کی
(حٰمٓ السجدۃ ۴۱: ۳۷)	بندگی کرتے ہو۔

اہل عرب نچھتروں کی تاثیر کے بھی معتقد تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انواء (نچھتروں) کو زمین کی خوش حالی میں بڑا دخل ہے۔ بارش انہی کے جود و کرم کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ بارش

ہوتی تو کہتے 'مطرنا بنوء کذا' فلاں نچھتر خوب برسی۔ اور یہ نسبت ان کے نزدیک مجازی نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ فی الحقیقت اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ پانی برسانا نچھتروں کا کام ہے۔

مشہور ستارہ شعریٰ بھی اہلِ عرب کا معبود تھا۔ یہ گرمیوں کے زمانہ میں طلوع ہوتا تھا۔ تابط شرّاً کا شعر ہے:

شامس فی القرحتیٰ اذا ما
ذکت الشعریٰ فبرد وظل

(ممدوح) سردیوں میں گرمی پہنچاتا ہے، یہاں تک کہ جب شعریٰ طلوع ہوتا ہے (گرما میں) تو وہ ٹھنڈک اور سایہ بن جاتا ہے۔

عرب میں جاڑوں کا موسم قحط و افلاس کا موسم ہوتا تھا۔ شمال کی ٹھنڈی ہوائیں اس زمانے میں پورے ملک کی تمام کاروباری سرگرمیوں کو سرد کر دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے اہلِ عرب جاڑے کے موسم کو 'ایام نحسات' کہتے تھے۔ آمدورفت اور تجارت کی چہل پہل زیادہ تر گرمیوں کے موسم کے ساتھ مخصوص تھی اور چونکہ یہی زمانہ شعریٰ کے طلوع ہونے کا زمانہ ہوتا تھا۔ اس وجہ سے یہ ساری خیر و برکت اسی کی طرف منسوب ہوتی تھی۔ قرآن نے سورۂ نجم میں اسی وہم کی تردید کی ہے:

وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی ۙ — اور اسی نے غنی اور سرمایہ دار کیا اور
وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی ۙ — وہی شعریٰ کا بھی رب ہے۔

(النجم۔ ۵۳: ۴۸، ۴۹)

اہلِ عرب کے تصورِ مذہبی نے ان مختلف عناصر کو جوڑ توڑ کر دیوتاؤں کی ایک بزم سجائی (CONSTELLATION OF GODS) جس میں خدا کی حیثیت ایک عرش والے (ذوالعرش) یا مہادیو کی قرار دی اور ان دیوتاؤں کو مقربینِ بارگاہ اور ارکانِ سلطنت

کی حیثیت بخشی۔ پھر اس تصور میں تشبیہ نے جو ہمیشہ سے شرک کے نہایت اہم اسباب و عوامل میں سے رہی ہے، رنگ آمیزی کی اور یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طرح زمین کے ملوک و سلاطین اپنے دور دراز کے علاقوں کا انتظام اپنے حکام و عمال کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اسی طرح خدائے عرش نشین نے بھی زمین کے معاملات کا انتظام و انصرام ان دیوتاؤں کے سپرد کر چھوڑا ہے۔ اس نے اپنا تعلق صرف آسمان کے نظم و اہتمام سے رکھا ہے، جس کو دارالسلطنت کی حیثیت حاصل ہے۔ باقی رہی زمین، تو اس کے معاملات میں اس کی حیثیت بس ایک گوشہ نشین علۃ العلل کی ہے۔ اس کی عام تدبیر و سیاست سے وہ بذاتِ خود متعلق (Involved) نہیں ہے۔ یہ تصور ایک تنزیہی تصور ہے جو بعض مشرک اقوام میں پایا جاتا ہے، لیکن یہ تنزیہ ایک طرف تو خدا کی قدرت اور علم کی نفی ہے، دوسری طرف اس سے خدا کی خدائی اور اس کی حاکمیت کی تقسیم لازم آتی ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کی تردید فرمائی ہے۔

اس تقسیم سے خدا کی قدرت اور اس کے علم کی جو نفی ہوتی ہے اور اس پر عجز اور ناواقفیت کا جو عیب لگتا ہے اس کی تردید اس طرح فرمائی ہے:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ .... وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَــٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا (البقرۃ - ۱۲ - ۲۵۵)	اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ زندہ ہے، سب کا قائم رکھنے والا ہے۔ نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے..... اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پر چھایا ہوا ہے اور ان کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ
اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى
الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ

(یونس - ۲ : ۳)

بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ادوار میں پیدا کیا، پھر وہ معاملات کا انتظام سنبھالے، عرش پر متمکن ہوا۔

اس تقسیم سے خدا کی بادشاہی میں بٹوارے کی جو شکل پیدا ہوتی ہے اس کی تردید اس طرح فرمائی ہے:

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا
اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ
اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ
فَارْهَبُوْنِ ۝

(النحل - ۱۶ : ۵۱)

اور اللہ نے فرمایا کہ دو معبود نہ بناؤ، وہ ایک ہی معبود ہے تو مجھ سے ڈرو۔

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ
وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ وَهُوَ
الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝

(الزخرف - ۴۳ : ۸۴)

اور وہی اکیلا آسمانوں میں بھی خداوند ہے، اور وہی زمین میں بھی خداوند ہے اور وہی حقیقی علیم و حکیم ہے۔

اسی تصور کی تردید ان آیات میں بھی ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا
يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي
الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝

(بنی اسرائیل - ۱۷ : ۴۲)

کہہ دو کہ اگر کچھ اور اللہ بھی اس کے شریک ہوتے، جیسے یہ دعویٰ کرتے ہیں تو وہ عرش والے پر ضرور چڑھائی کر دیتے۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا	اگر ان دونوں کے اندر اللہ کے سوا
اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ	الگ الگ الٰہ ہوتے تو یہ دونوں
(الانبیآء ۔۔۔ ۲۱ : ۲۲)	درہم برہم ہو کے رہ جاتے۔

زمین کے معاملات میں براہِ راست متصرّف ماننے کی وجہ سے اہلِ عرب نے ان دیوتاؤں کو عبادت و تعظیم کے ان تمام لوازم کا مستحق ٹھہرایا جو خدا کے لیے مخصوص تھے۔ خدا کے لیے کعبہ تھا، ان کے لیے بھی الگ الگ استھان اور معبد بنائے گئے، خدا کے لیے حج اور قربانی کے طریقے تھے، ان کے لیے بھی حج اور قربانی کے مراسم اختیار کیے گئے۔ خدا نے اپنے لیے شعائر اور قربانی و نیاز کے جانور مقرر کیے، مشرکین نے اپنے معبودوں کے لیے بھی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام مخصوص کر دیئے[1]۔ خدا کے لیے زمین کی پیداوار اور چوپایوں میں سے ایک متعیّن حصّہ تھا، ان کے دیوتا بھی اس حصّے کے مستحق ٹھہرے، اور چونکہ زمین کے نظم و اہتمام کے اصلی ذمّہ دار، ان کے خیال کے مطابق، یہی تھے اس وجہ سے خدا کے مقابل میں ان کا حق کچھ زیادہ ہی رہا: وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۞[2] (الانعام ۔ ۶ : ۱۳۷)

---

[1] بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام، یہ جانوروں کی مختلف قسمیں ہیں جن کو اہلِ عرب اپنے دیوتاؤں کے نام پر چھوڑتے تھے اور ان کو ہدی کے جانوروں کی طرح مقدّس سمجھتے تھے۔

[2] (اور خدا نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے اس میں انھوں نے اللہ کا ایک حصّہ مقرر کیا ہے پس کہتے ہیں: یہ حصّہ تو اللہ کا ہے، ان کے گمان کے مطابق، اور یہ حصّہ ہمارے شرکا کا ہے تو جو حصّہ ان کے شرکا کا ہوتا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچ سکتا اور جو حصہ اللہ کا ہوتا ہے وہ ان کے شرکا کو پہنچ سکتا ہے۔ کیا ہی بُرا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں)۔

خدا کا حصہ ان کے شرکاء کی طرف منتقل ہو سکتا تھا، لیکن شرکاء کا حصہ خدا کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا تھا۔ خدا کے لیے صرف جانوروں کی قربانی تھی، لیکن شرکاء کے لیے جیسا کہ اوپر گزرا، بعض حالات میں اولاد تک کی قربانی پیش کی جاتی تھی۔ خدا نے صرف چند چیزیں حرام کی تھیں، لیکن ان دیوتاؤں کے تعلق سے بہت سی چیزیں حرام (TABOO) ہو گئیں۔ خدا وحی و الہام نازل کرتا تھا، یہ دیوتا بھی فال کے تیروں کی زبان سے اپنے فیصلے صادر کرنے لگے۔

خواص یہ ساری نیاز مندیاں ملائکہ، جنات اور کواکب کے لیے بجا لاتے تھے، لیکن عوام کو اتنی پرواز بھی نصیب نہیں تھی۔ وہ مٹی، پتھر اور لکڑی وغیرہ کے بنے ہوئے بتوں ہی کو اصل کارفرما مانتے تھے۔ اسی وجہ سے قرآن نے بت پرستی کی تردید میں خواص و عوام دونوں کی ذہنیت کو سامنے رکھا۔ مثلاً سورۂ اعراف میں پہلے فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝	جن کو تم اللہ کے ماسوا پکارتے ہو یہ تو تمہارے ہی جیسے بندے ہیں۔ پس ان کو پکارو، دیکھو، وہ تمہیں جواب دیں اگر تم سچے ہو۔

(الاعراف - ۷ : ۱۹۴)

پھر فرمایا:

أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا	کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں، کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں، کیا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں، کیا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں؟

(اعراف - ۷ : ۱۹۳)

۴ - آباء پرستی:

دیوتاؤں کی اس بزم میں انہوں نے اپنے آباء و اجداد میں سے ان بزرگوں کو جگہ دی، جن کے مذہبی تقدس کی روایات ان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کی قبریں اور ان کے آثار حصولِ برکت و قبولیتِ دعا کے مرکز بنتے بنتے بالآخر معبد بن گئے اور آہستہ آہستہ ان کے متعلق بھی انہوں نے اسی طرح کے عقائد و تصورات قائم کر لیے جس طرح کے عقائد و تصورات انہوں نے جنات اور ملائکہ سے متعلق قائم کر لیے تھے اور جن کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ قرآن نے اس کی تردید فرمائی:

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ	اور جن کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں
اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ	وہ کچھ پیدا نہیں کرتے، وہ تو خود مخلوق
يُخْلَقُونَ ۝ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ ۖ	ہیں، مردہ غیر زندہ، اور ان کو احساس
وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ۝	بھی نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے

(النحل — ۱۶: ۲۰-۲۱)

اس آباء پرستی کی سب سے زیادہ منحوس شکل یہ تھی کہ آباؤ اجداد کے رواج اور چلن کو انہوں نے دین اور شریعت کی حیثیت دے دی، چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی مخالفت میں سب سے زیادہ قوی محرک ان کا یہی آباء پرستی کا خبط تھا جب ان کو اللہ کے رستہ پر چلنے کی دعوت دی جاتی اور خدا کے احکام و قوانین بتائے جاتے تو کہتے: کیا ایک مجنون شاعر کے کہنے سے ہم اپنے آباؤ اجداد کا طریقہ چھوڑ دیں؟ یہ نہیں ہو سکتا:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ	اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے
مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ	کہ اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے
قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا	اتاری ہے اور رسول کی طرف آؤ تو

عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ○

(المائدۃ ۔ ۵ : ۱۰۴)

جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ جانتے رہے ہوں نہ ہدایت پر رہے ہیں؟

اس آیت کے آخری حصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ دادا کا چلن اس اعتبار سے تو اچھی چیز ہے کہ طبیعت کو اس سے انس اور لگاؤ ہوتا ہے، لیکن کسی چلن کی اچھائی کے لیے مجرد اتنی بات کافی نہیں ہو سکتی کہ وہ آباء و اجداد سے چلا آ رہا ہے۔ اس کے متعلق سب سے مقدم سوال یہ ہے کہ وہ عقل کے خلاف تو نہیں ہے، فطرت انسانی سے بعید تو نہیں ہے، اخلاق کے منافی تو نہیں ہے، بالاجمال یہ کہ خدا کے بتائے ہوئے طریقہ سے الگ تو نہیں ہے؟ اگر ان کسوٹیوں پر وہ صحیح اتر جائے تو بے شک وہ صحیح ہے اور آباء و اجداد کا طریقہ ہونا اس کی صحت کے لیے ایک مزید سفارش ہے اور اگر ان کسوٹیوں پر وہ کھوٹا ثابت ہو جائے تو وہ باطل ہے اور کسی باطل کا موروثی ہونا اس کی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔

اس معاملہ میں دنیا ہمیشہ سے افراط و تفریط میں مبتلا رہی ہے۔ جاہلیتِ قدیمہ کا نظریہ تو، جیسا کہ اوپر گزرا، یہ تھا کہ آباء و اجداد کا طریقہ بہر صورت حق ہے۔ اس کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ آباء و اجداد سے چلا آ رہا ہے۔ جاہلیتِ جدیدہ اس معاملہ میں جو نقطۂ نظر رکھتی ہے اس کی بہترین ترجمانی مشہور شاعر ٹینی سن کے لفظوں میں یوں کی جا سکتی ہے کہ "اگر بہتر سے بہتر چلن بھی ہمیشہ باقی رہے تو دنیا کو بگاڑ ڈالے"۔ یہ دونوں راہیں افراط و تفریط کی راہیں ہیں۔ ایک کی بنا تقلیدِ اعمیٰ پر ہے، جو عقل سے کام نہ لینے کا نتیجہ ہے۔ دوسری کی بنا خیرہ سری اور بد دماغی پر ہے، جو عقل کو اس کی

حد سے بڑھانے کا نتیجہ ہے۔ ایک شرک وبت پرستی کی ایک خاص قسم آباء پرستی (ANCESTOR WORSHIP) کی طرف رہبری کرتی ہے، دوسری الحاد و زندقہ کی طرف لے جاتی ہے جو خود پرستی کا دروازہ ہے اور ان دونوں ہی راہوں میں انسان خدا پرستی کی حقیقت سے محروم اور عاقبت بینی کی ذمہ داریوں سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی عقل و تمیز پر مہر لگا کر چوپایوں کے گلہ میں داخل ہو جائے تو یہ بات بھی جائز نہیں ہو سکتی کہ ایک راستہ کی غلطی اور دوسرے کی صحت کا فیصلہ کیے بغیر وہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے پر چل کھڑا ہو۔

ان دونوں راہوں میں انسان شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کا مجرم ہے۔ عقل و فطرت کا راستہ وہ ہے جس کی شہادت دنیا کے اچھے انسانوں اور انبیاء علیہم السلام کی قبل بعثت کی زندگیوں سے ملتی ہے۔ ان کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جونہی حق و رشد کی کرنیں ان پر چمکیں انہوں نے سب سے پہلے اپنے اس ذہنی ورثہ کا جائزہ لیا جو انہیں آباؤ اجداد سے پہنچا تھا، اور اس سے جو چیز بھی انہیں عقل و فطرت سے متناقض نظر آئی اس کو انہوں نے بے درنگ چھوڑ دیا۔ اس راہ میں انہیں خلق کی طرف سے بے شمار مصیبتیں بھی جھیلنی پڑیں، لیکن اس کی انہوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ یہی لوگ نوعِ انسانی کے گلِ سرسبد تھے اور اپنے اس جوہر کی وجہ سے حق سے مستفید ہونے میں ہمیشہ سب سے آگے رہے جس طرح سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی کرنیں سب سے پہلے اونچی منڈیروں ہی پر چمکتی ہیں، اسی طرح جب کبھی دنیا میں آفتابِ حق طلوع ہوا انہی کے دل و دماغ اس سے سب سے پہلے نورانی ہوئے۔ اس کی ایک عمدہ مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی ہے۔ آپ نے فرمایا:

إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا — میں نے ان لوگوں کے مذہب کو چھوڑا

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ○ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ

ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے یہی لوگ منکر ہیں اور میں نے اپنے بزرگوں، ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے مذہب کی پیروی کی۔

(یوسف - ۱۲: ۳۷ - ۳۸)

حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق معلوم ہے کہ ظاہر میں نہ انہوں نے کسی مذہب کو اختیار کیا اور نہ کسی مذہب کو ترک کیا۔ جس مذہب پر پیدا ہوئے تھے روزِ اوّل سے اپنی حیاتِ پاک کے آخری انفاس تک اسی مذہب پر رہے۔ نبوت کے بعد اسی مذہب کی ان پر وحی ہوئی۔ مصر میں انہیں قبطیوں کے مذہب سے سابقہ پڑا، لیکن ان کا پاک دل ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی نجاستوں سے آلودہ نہیں ہوا۔ تاہم وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک قوم کے مذہب کو جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتی تھی، چھوڑا اور اپنے آباؤ اجداد ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام کے مذہب کو اختیار کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ ترک و اختیار عقلی اور باطنی ہے۔ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کو محض میراثِ پدر سمجھ کر نہیں اپنا رکھا تھا، بلکہ ایک پاکیزہ فطرت اور متقی دل کی تمام کاوشوں اور کاوشوں کے ساتھ اس کی صداقت و حقانیت کو جانچا پرکھا تھا۔ وہ طریقہ ان کے لیے خود ان کا اپنا انکشاف تھا اس لیے اپنا بن چکا تھا اور ان کے دل کے ریشہ ریشہ میں اترا ہوا تھا۔ اس کی صحت پر ان کی عقل گواہ تھی اور اس کے فطری اور خدائی ہونے پر ان کا دل بالکل مطمئن تھا۔ وہ اس کے ساتھ اس لیے نہیں لگ لیے تھے کہ باپ دادا کی عصبیت میں گرفتار تھے، بلکہ تمام جہان میں اگر ایک متنفس بھی اس راستہ پر نہ ہوتا۔ جب بھی ان کا راستہ وہی ہوتا البتہ یہ اللہ کا ایک مزید فضل تھا کہ وہی راستہ ان کے آباؤ اجداد کا بھی تھا۔ اس کی شہادت ان کی مصر

کی پُرامن زندگی سے ملتی ہے۔ آزمائشوں کی کیسی کیسی گھٹائیں امنڈ امنڈ کے آتی ہیں لیکن ان کے قدم کو لغزش نہیں ہوتی، بلکہ تاریکی جتنی بڑھتی جاتی ہے ان کا اطمینان اتنا ہی مضبوط ہوتا جاتا ہے اور جتنا ہی ان کو جلانے کی کوشش کی جاتی ہے ان کے حق میں اتنے ہی زیادہ استوار ہوتے جاتے ہیں۔ دنیا میں جو لوگ بھی کسی راستہ کو اس نور بصیرت کی رہنمائی میں اختیار کرتے ہیں وہ اس کو فی الحقیقت اختیار کرتے ہیں اس کی تقلید نہیں کرتے، اگرچہ وہ راستہ ان کے آباؤ اجداد ہی کا راستہ ہو اور ایسے لوگ دوسری راہوں کو جو چھوڑتے ہیں تو درحقیقت وہ چھوڑتے ہیں اگرچہ ایک قدم بھی وہ ان پر چلے نہ ہوں۔ یہی بصیرت و اجتہاد روحِ دین ہے۔ یہ نہ ہو تو تمام ادیان بے جان و بے روح ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ایک شخص کسی حق کو بھی اختیار کرے، مگر اس لیے نہیں کہ وہ حق ہے اور خدا کی طرف سے ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے آباؤ اجداد کا طریقہ ہے، تو یہ بھی عرب جاہلیت کی اسی آباء پرستی میں داخل ہے، جو شرک ہے۔

۵۔ خود پرستی :

دیوتاؤں کی اس بزم میں مشرکینِ عرب خود بھی شریک تھے، لیکن وحیِ الٰہی کی تنبیہ سے پہلے جس طرح انہیں اپنے بہت سے دوسرے مشرکانہ اعمال و عقائد کا شعور نہیں تھا اسی طرح اس چیز کے شعور سے بھی وہ محروم تھے۔ وہ اپنے تئیں خدا کا بندہ تو کہتے تھے، لیکن بندگی کے مقتضیات و لوازم سے بے خبر تھے اس وجہ سے حدودِ بندگی سے تجاوز کر کے حدودِ الوہیت میں داخل ہو گئے تھے۔ قرآن نے ان کی اس طرح کی تعدیوں کی جو صورتیں بیان کی ہیں ہم ان کا بالاجمال ذکر کریں گے، اور یہ بحث نہایت قابلِ توجہ ہے۔

۱۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اہلِ عرب کو اپنی عبدیت اور خدا کی خالقیت و ربوبیت

سے انکار نہیں تھا، لیکن اس کے لوازم یعنی خدا کی بندگی اور پھر بندگی کے لوازم یعنی تنہا اللہ ہی کی اطاعت میں وہ جادۂ حق سے منحرف تھے وہ اطاعت میں دوسروں کو بھی شریک کرتے تھے۔ عبادت اور بندگی کا مفہوم ان کے ہاں 'پوجا پاٹ' سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ اس بات میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے کہ عبادت خدا کی ہوتی رہے اور اطاعت اپنی یا کسی اور کی ——— وہ اللہ کی ہدایت کی جگہ اپنے نفس، اپنے آباء و اجداد اور اپنے سرداروں اور لیڈروں کی خدا کے احکام کے خلاف پیروی کرکے بھی یہی خیال کرتے تھے کہ اس سے اللہ کی بندگی میں کوئی فرق نہیں آیا، لیکن قرآن نے متنبہ کیا کہ خدا کی عبادت اس کی اطاعت کے بغیر بے معنی ہے۔ خدا کی بندگی کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ صرف اسی کی اطاعت کی جائے:

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ فَٱعْبُدِ ٱللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ ٱلدِّينَ ۝ أَلَا لِلَّهِ ٱلدِّينُ ٱلْخَالِصُ ۝ (الزمر - ۳۹ : ۲ - ۳)	بے شک ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف قولِ فیصل کے ساتھ اتاری ہے تو تم اللہ ہی کی بندگی کرو، اسی کی خالص اطاعت[1] کے ساتھ۔ یاد رکھو کہ اطاعتِ خالص کا سزاوار اللہ ہی ہے۔

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں کئی جگہ ہیں، سب کو نقل کرنے میں طوالت ہے۔ ان سب کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے جو دین نازل کیا تھا اس میں تحریف و تبدیل نے بہت سے اختلافات ڈال دیے تھے اور بے شمار بدعتیں داخل کر دی تھیں۔ اس

---

[1] دین کے معنی یہاں اطاعت کے ہیں: الدين الطاعة وقد دنته ودنت له اطعته - قال عمرو بن كلثوم:

دایاما لنا غرا کراما — عصینا الملك فیها ان ندینا

وجہ سے خدا کی خالص عبادت و بندگی کی راہ مسدود ہو گئی تھی۔ ان بدعات کی موجودگی میں جو لوگ بھی عبادت کر رہے تھے وہ خدائے واحد کی عبادت سے محروم تھے، وہ نام تو اللہ کا ضرور لیتے تھے، لیکن ہر قدم پر غیر اللہ کی اطاعت سے دوچار تھے۔ اس کتاب نے یہ اختلافات مٹادیے اور شریعت کو غیر الٰہی عناصر سے پاک کر دیا۔ یہ حق و باطل کے درمیان ایک قول فیصل کی حیثیت سے نمودار ہوئی۔ اب خدا کی اطاعت و بندگی کی سیدھی راہ باز ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو تنہا اسی کی اطاعت کرتے ہوئے یعنی بندگی وہی معتبر ہے جو خالص اطاعت کے ساتھ ہو۔ اگر محض مخصوص اوقات میں خدا کا نام جپ لیا جائے اور اطاعت میں اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کیا جائے، خواہ وہ شریک انسان کا اپنا ہی نفس ہو، تو یہ بندگی نہیں، نمرود کی خدائی ہے جس سے کسی بھلائی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے:

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝	بھلا یہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے تم اس کے ذمہ دار ہو گے!

(الفرقان - ۲۵: ۴۳)

خدا کی اطاعت کا راستہ یہ ہے کہ اس کے انبیاء کی پیروی کی جائے،

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔	اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

(النساء - ۴: ۸۰)

یہی وجہ ہے کہ ہر نبی کی دعوت یہ رہی ہے کہ اللہ کی بندگی کرو اور میری بات مانو

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ	کہ اللہ کی بندگی کرو، اس کے حدود کی پابندی کرو اور میری بات مانو۔

(نوح - ۷۱: ۳)

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی عبادت و بندگی کی راہ یہ ہے کہ نبی کی اطاعت کی جائے اور ساتھ ہی ان لوگوں کے راستہ کی پیروی سے انکار کیا جائے جو اللہ کے راستہ سے منحرف ہیں۔ چنانچہ انبیائے کرام علیہم السلام نے بھی اس کی تصریح فرما دی کہ: 'وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ' (الشعراء - ۲۶ : ۱۵۱) (اور حدود سے گزر جانے والوں کی بات نہ مانو) ہماری اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کرو جنہوں نے حدودِ الٰہی سے تجاوز کیا ہے اور خدا کے باغی ہیں۔

توحید کا یہی وہ مقام ہے جہاں موحدین اور مشرکین میں اصل نزاع برپا ہوتی ہے۔ جب خدا کی عبادت صرف 'پوجا پاٹ' پر قناعت نہیں کرتی، بلکہ یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ جو خدا کے بندے ہیں وہ صرف خدا ہی کی اطاعت بھی کریں اور اس کی اطاعت کے سوا ہر اس اطاعت کو شرک قرار دیں جو خدا کی اطاعت کے خلاف ہے تو اس بات کو وہ لوگ نہیں برداشت کر سکتے جو خود اپنی خدائی کے دعویدار ہوتے ہیں۔ علمائے اسلام میں سے علامہ ابنِ تیمیہؒ نے اس بحث پر 'العبودیۃ' کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے جو نہایت مفید مباحث پر مشتمل ہے۔ اس سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ 'عبادت' صرف چند رسوم کا نام نہیں ہے، بلکہ پورا دین اس کے مفہوم میں داخل ہے اور یہ کہ اطاعت کے بغیر خدا کی عبادت کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔

ب - اسی بنیاد پر قرآن نے وضعِ قانون مخصوص اللہ تعالیٰ کا حق قرار دیا اور کسی کے لیے اس میں ادنیٰ شرکت بھی گوارا نہیں فرمائی۔ چنانچہ اکثر جگہ توحید کے بیان کے ساتھ اس امر کا بھی ذکر کیا کہ کسی شے کو حرام اور کسی چیز کو حلال قرار دینا اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ وہ ہی بادشاہ ہے۔ اسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی رعیت اور اپنی مملکت کے لیے قانون بنائے۔ اس کے قانون کے خلاف قانون سازی توحید کی خلاف ورزی، خطواتِ شیاطین کی پیروی اور خدا کی عبادت کی نفی ہے۔ جو شخص اللہ کے قانون

کے خلاف قانون بناتا ہے وہ اپنے تئیں اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتا ہے اور اگر دوسرے کے لیے اس حق کو تسلیم کرتا ہے تو اس کو اللہ کے سوا رب بناتا ہے اور اگر اس امر کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو یہ شرک کے ساتھ خدا پر افترا بھی ہے۔ سورۂ بقرہ میں آیات ۱۶۳ - ۱۷۳ پڑھیے۔ شروع کی پانچ آیتوں میں توحید کا بیان ہے پھر اسی کے ذیل میں یہ آیت آئی ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّهٗ لَـكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال طیب ہیں ان کو کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

(البقرۃ - ۲ : ۱۶۸)

شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ سے اس کی اس دعوتِ شرک کی طرف اشارہ ہے جس کا اس نے روز اوّل ہی میں اعلان کر دیا تھا: "وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ" (النساء - ۴ : ۱۱۹) (میں ان کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا، ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنساؤں گا، ان کو سجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ خدا کی بنائی ساخت کو بگاڑیں گے)۔

اس کے بعد شیطان کی دعوت کا اصل مقصد واضح کیا ہے کہ وہ برائی اور بے حیائی کی دعوت دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ انسان خود اپنے جی سے حلال و حرام کرے اور اپنا شارع آپ بنے اور پھر بلا سند اس کو خدا کی طرف منسوب کرے: "اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۤءِ وَالْفَحْشَاۤءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" (البقرۃ - ۲ : ۱۶۹)۔

وہ تو بس تمہیں برائی اور بے حیائی کی راہ سوجھائے گا اور اس بات کی کہ تم خدا کی طرف وہ

انہیں منسوب کرو جن کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اگر انسان کو قانونِ الٰہی کی پیروی کی دعوت دی جاتی ہے تو باپ دادا کی روایات کی سند لاتا ہے، حالانکہ باپ دادا کی روایت کوئی سند نہیں ہے جب تک ان کے اقوال و اعمال کی بنیاد شرعِ الٰہی پر نہ ہو۔ باپ دادا کے طریقہ پر شریعت کی سند کے بغیر جم جانا اپنے آپ کو انسانوں کی صف سے نکال کر چوپایوں کے گلہ میں داخل کر دینا اور گونگوں، بہروں اور اندھوں کے زمرہ میں شامل ہو جانا ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا
أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ
مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ
أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ
شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ وَ
مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ
الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ
إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ
عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝

(البقرۃ ۲: ۱۷۰-۱۷۱)

اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے
کہ خدا کی اتاری ہوئی چیز کی پیروی کرو تو
وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی
پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ
دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب
ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ
راہِ ہدایت پر رہے ہوں۔ ان کافروں کی مثال
ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسی چیزوں کو پکارے
جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سنتی سمجھتی ہوں۔
یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، یہ کچھ نہیں سمجھتے

پھر فرمایا کہ جو لوگ خدا کی عبادت کے مدعی ہیں تو اس کی عبادت صرف اس طرح نہیں ہو سکتی کہ عبادت تو اس کی کریں، لیکن حرام و حلال اپنے جی سے کریں۔ اس کی عبادت کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ وضعِ قانون اور تشریع کا حق خالص اسی کے لیے تسلیم کریں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن
طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا

اے ایمان والو جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم
کو بخشی ہیں ان کو کھاؤ اور اللہ ہی کے

لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ شکر گزار ہو اگر تم اس کی بندگی

(البقرۃ - ۲ : ۱۷۲) کرنے والے ہو۔

اسی بنیاد پر اللہ کے ایمان اور اس کی بندگی کے لیے تمام خدائی ادیان میں اس بات کو ایک لازمی شرط قرار دیا گیا ہے کہ زندگی کے معاملات اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق چلائے جائیں اور شریعت کو چھوڑ کر کسی اور چیز کو رہنما نہ بنایا جائے۔ قرآن سابق امتوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے خبر دیتا ہے کہ یہی حکم یہود کو دیا گیا تھا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

(المائدۃ - ۵ : ۴۴)

بے شک ہم ہی نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی کے مطابق خدا کے فرمانبردار انبیاء، ربانی علماء اور فقہاء یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے، بوجہ اس کے کہ وہ کتاب الٰہی کے امین اور اس کے گواہ ٹھہرائے گئے تھے کہ لوگوں سے نہ ڈرو، مجھی سے ڈرو اور میرے احکام کو دنیا کی متاع حقیر کے عوض نہ فروخت کیجیو اور جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہ کریں تو یہی لوگ کافر ہیں۔

پھر قرآن مجید خبر دیتا ہے کہ بعینہٖ یہی حکم نصاریٰ کو بھی دیا گیا تھا کہ وہ بھی اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق معاملات زندگی کو چلائیں، ورنہ فاسق ٹھہریں گے:

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اور واجب ہے کہ اہل انجیل بھی

اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (المائدۃ - ۵ : ۴۷)	فیصلہ کریں اس کے مطابق جو اللہ نے اس میں اتارا اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔

پھر بتایا کہ جو حکم ان امتوں کو دیا گیا تھا بعینہ وہی حکم مسلمانوں کو بھی دیا جاتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات کو اس کتاب کی راہنمائی میں چلائیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ (المآئدۃ - ۵ : ۴۸)	اور ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری حق کے ساتھ، مصداق اس سے پیشتر سے موجود کتاب کی اور اس کے لیے کسوٹی بنا کر، تو ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا اور اس حق سے ہٹ کر، جو تمہارے پاس آچکا ہے، ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔

بعینہ یہی مضمون اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ، سورۃ انعام کی آیات ۱۳۶ سے لے کر ۱۵۳ تک بیان ہوا ہے، اور آخری آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جماعت کی شیرازہ بندی اور تنظیم قانون و شریعت سے ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وضع قانون و شرع کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا جائے جو سب کا خالق اور سب کا بادشاہ ہے۔ اگر اس حق میں دوسرے بھی شریک ہو جائیں اور ہر قوم و جماعت اپنے لیے قانون بنانے کی مجاز ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ بدنظمی، انتشار اور فساد فی الارض ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (الانعام - ۶ : ۱۵۳)

(اور یہی میرا راستہ سیدھا راستہ ہے تو اس کی پیروی کرو اور دوسری پگ ڈنڈیوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں اس کی راہ سے الگ کردیں۔ یہ باتیں ہیں جن کی تمہیں ہدایت فرمائی تاکہ اس کے غضب سے بچو)۔

توحید اور تشریع کا یہی تلازم سورۂ نحل کی آیات ۵۴ - ۵۵ میں موجود ہے لیکن یہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

ج۔ خود پرستی کی ایک نہایت اہم اور عام شکل یہ ہے کہ جو لوگ ایک مدت تک فارغ البالی اور خوش حالی کی زندگی بسر کرچکے ہوتے ہیں اور دولت و ثروت اور اکتساب علم و فن کے وسائل پر قابض رہتے چلے آتے ہیں، کچھ عرصہ کے توارث کے بعد، اس حالتِ امن و اطمینان کو وہ اپنا استحقاقِ ذاتی اور اپنے علم و قابلیت کا ثمرہ سمجھنے لگ جاتے ہیں یہ ذہنی حالت فردکی ہو یا جماعت کی، بس کی گانٹھ ہے، جس سے بے شمار مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی تہ میں اتر کر غور کیا جائے تو یہ صریح شرک ہے۔ کیونکہ اس دنیا کے اندر جو کچھ ہے سب کا خالق اللہ ہے۔ تمام وسائل و ذرائع اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور ان وسائل و ذرائع پر ہم اپنے جن اعضاء اور جن قوتوں اور قابلیتوں کے ذریعے سے تصرف کرتے ہیں وہ سب بھی خدا ہی کا عطیہ ہیں:

قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ	کہہ دو کہ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔ پر تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو!
(الملک - ۶۷ : ۲۳)	

ہمارے عروج و کمال کا کوئی درجہ ہمارے علم و فضل کا کوئی مرتبہ اور ہماری عظمت و سطوت کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے جو ہمیں اس کی بندگی اور غلامی سے بے نیاز کرسکتا ہو۔ ہم سلیمانؑ و ذوالقرنین ہو کر بھی اس کے آگے ویسے ہی محتاج اور فقیر

ہیں جیسے سلمان اور ابوذر ہو کر رضی اللہ عنہما۔ احتیاج و افتقار ہماری ایک صفتِ ذاتی ہے جو کسی حال میں بھی ہم سے جدا نہیں ہو سکتی، خواہ ہم کتنے ہی بلند مرتبہ پر پہنچ جائیں اور قوت و سطوت کی کتنی ہی بڑی مقدار فراہم کر لیں۔

عرب جاہلیت میں شرک کی یہ قسم بھی موجود تھی۔ وہ اپنی خوش حالی اور فارغ البالی کو اپنے علم و تدبر کا نتیجہ اور اپنے استحقاقِ ذاتی کا ثمرہ سمجھتے تھے۔ آخرت کے اولاً تو قائل نہیں تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں اس کو مانتے بھی تھے تو اس کے لیے عمل و اطاعت کی کسی سرگرمی کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح ہم دنیا میں بہتر حالت میں ہیں اسی طرح آخرت میں بھی بہتر حالت میں رہیں گے۔ یہ بہتر حالت میں رہنا ہمارا ایک ذاتی حق ہے جو کسی حال میں ہم سے چھین نہیں سکتا۔ قرآن نے اسی ذہنی حالت کی تصویر کھینچی ہے:

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِنَّا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔

(الزمر - ۳۹ : ۴۹)

پس جب انسان کو کوئی دکھ پہنچتا ہے تو ہم کو پکارتا ہے، پھر جب ہم اس پر اپنی طرف سے فضل کر دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو میری تدبیر کی بدولت حاصل ہوا، بلکہ یہ ایک آزمائش ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

یعنی انسان کوئی چیز اپنے علم و قابلیت سے نہیں پاتا۔ جو کچھ بھی پاتا ہے خدا کے فضل سے پاتا ہے اور اس سے مقصود اس کی آزمائش ہوا کرتی ہے کہ وہ شکر کرتا ہے یا ناشکری۔ لیکن اکثر اس آزمائش سے ناواقف ہیں اور وہ ناشکری ہی کرتے ہیں اور جو چیز خدا کی عنایت سے ملتی ہے اس کو اپنے علم و قابلیت کا ثمرہ اور اپنا ذاتی استحقاق سمجھنے لگتے ہیں اور اس طرح خدا کی ربوبیت اور رزاقیت میں شریک بن بیٹھتے ہیں۔ یہ چیز

استکبار اور فساد فی الارض کی جڑ ہے۔ اسی متکبرانہ ذہنیت کی تصویر دوسری جگہ اس طرح کھینچی ہے:

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ (حٰمٓ السجدة - ۴۱ : ۵۰)	اور اگر ہم اس کو اپنی رحمت کا مزا چکھا دیتے ہیں، اس تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی ہوتی ہے تو کہتا ہے: یہ تو میرا حق ہی ہے اور میں قیامت کے ہونے کا گمان نہیں رکھتا اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا ہی گیا تو میرے لیے اس کے پاس بھی بہتری ہی ہے۔

یہی ذہنیت ہے جس کا ذکر سورۂ مدثر میں ہے:

وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۙ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۙ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۙ (المدثر - ۷۴ : ۱۲-۱۵)	اور اس کو بخشا مال فراواں، اور بیٹے دیئے حاضر باش۔ اور اس کے لیے خوب راہ ہموار کی۔ پھر وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کے لیے اور زیادہ کروں گا۔

آخری ٹکڑے: ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ (پھر وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ میں اس کے لیے اور زیادہ کروں گا) کا مطلب یہ ہے کہ وہ خیال کرتا ہے کہ اگر بالفرض خدا کے ہاں جانا ہی ہوا تو مجھے دنیا میں جو کچھ حاصل ہے اس سے زیادہ وہاں حاصل ہوگا، کیونکہ وہ اس تمام عظمت و ثروت کو اپنے استحقاق کا نتیجہ سمجھتا ہے، اس کو خدا کی بخشش اور آزمائش نہیں سمجھتا۔

اسی ذہنیت کی تصویر سورۂ معارج میں ہے:

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ۙ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۝ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ۙ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

(المعارج - ۷۰ : ۳۶ - ۳۹)

تو ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ تمہاری طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں، دائیں اور بائیں سے، تم پر پلے پڑ رہے ہیں گروہ در گروہ! کیا ان میں سے ہر ایک یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ جنتِ نعیم میں داخل کر دیا جائے گا! ہرگز نہیں! ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں!

یہ تصویر ہے اس حالت کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ قرآن کے وقت پیش آئی۔ آخرت میں اربابِ اقتدار کی ذلت اور جزا و سزا کی آیتیں جب آپ سناتے تو قریش کے سرداروں کو سخت چوٹ لگتی۔ ان کے لیے یہ تصور بہت شاق تھا کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جس میں بلندی اور پستی کی میزان ایمان اور عملِ صالح کے ہاتھ میں ہو گی اور ایک غریب سے غریب کسان اور ادنیٰ سے ادنیٰ مزدور بھی اپنی بندگی اور اطاعت کے صلہ میں بڑے بڑے سرداروں کے لیے قابلِ رشک ہو گا۔ وہ جب قرآن کی یہ آیتیں سنتے تو ان کی تردید کرتے اور ان کا مذاق اڑانے کے شوق میں ہر چہار طرف سے آپ پر پل پڑتے اور استحقاقِ ذاتی کے گھمنڈ میں جو ایک متوارث خوش حالی اور سیادت کا قدرتی نتیجہ ہے، یہ کہتے کہ اگر ہم خدا کے ہاں جائیں گے بھی تو وہاں بھی ان کمینوں سے اچھے ہی رہیں گے۔ ہمیں جو کچھ حاصل ہے ہمارے استحقاقِ ذاتی کا ثمرہ ہے۔ یہ کسی جگہ بھی ہم سے چھن نہیں سکتا، نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ ہم پیدا ہی اسی لیے ہوئے ہیں کہ حکومت کریں، عیش و آرام کریں اور لوگوں پر بلند و بالا رہیں۔ قرآن نے اس کا جواب دیا: كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ (المعارج - ۷۰ : ۳۹) (ہرگز نہیں! ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اس

چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں، (جس کو وہ جانتے ہیں، یعنی بتلانے کی ضرورت نہیں ہے) اس کی بے حقیقتی اور کم قدری ان پر اچھی طرح واضح ہے۔ نجس پانی کی ایک بوند کے لیے برتری اور پاکیزگی، اپنے استحقاقِ ذاتی و موروثی اور اپنے شرفِ نسبی و حسبی کا یہ غرور زیب نہیں دیتا اور جس انسان کی یہ تمام توانائیاں اور قوتیں اور تمام قابلیتیں بچپنے اور بڑھاپے کی دو ناتوانیوں کے درمیان گھری ہوئی ہیں:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ	اللہ ہی ہے جس نے تم کو ناتوانی سے
ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ	پیدا کیا، پھر ناتوانی کے بعد قوت بخشی
ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ	پھر قوت کے بعد ضعف اور بڑھاپا
بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَیْبَةً	طاری کر دیا۔

(الروم - ۳۰ : ۵۴)

اس انسان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے تئیں بندگی سے بالاتر، عمل و اطاعت سے بے نیاز اور خدا کی خدائی میں حصے دار خیال کرنے لگے۔

یہی حقیقت سورۂ نجم میں نہایت لطیف اسلوب سے بیان ہوئی ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ	اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ
مَا فِی الْاَرْضِ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ	آسمانوں اور جو کچھ زمین ہے کہ وہ بدلہ
اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَیَجْزِیَ	دے ان لوگوں کو جنہوں نے اچھے کام
الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰىۚ	کیے ہیں اچھا۔ یعنی ان لوگوں کو جو بڑے
اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ	گناہوں اور کھلی بے حیائیوں سے بچتے
الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ	رہے مگر یہ کہ کبھی کسی برائی پر پاؤں
اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِؕ	پڑ گئے۔ سو تیرے رب کا دامنِ مغفرت
هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ	بہت وسیع ہے۔ وہ تم کو خوب جانتا

مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝

(النجم - ۳۱:۵۳ - ۳۲)

ہے جب کہ اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور جب کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں رہے۔ تو تم اپنے کو پاکیزہ نہ ٹھہراؤ۔ وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے۔

اس سے اوپر والی آیت میں ملائکہ کی شفاعت کی تردید تھی اس کے بعد جزا و سزا کا حق ہونا بیان کیا اور فرمایا کہ اللہ کے ہاں کی کامیابی صرف۔ ان لوگوں کے لیے ہے جو کبائر اور فواحش سے بچتے رہیں اور اگر کبھی اس طرح کی گندگی کا کوئی چھینٹا دامن پر پڑ جائے تو توبہ واستغفار کے اشکِ ندامت سے اس کو دھو ڈالیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو استحقاقِ ذاتی کے گھمنڈ میں مبتلا ہیں اور اپنے آپ کو بڑی چیز، بلکہ پیدائشی حقدارِ جنت سمجھ رہے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ خدا ان کے اس وقت سے بھی واقف ہے جب اس نے ان کو خاک سے پیدا کیا اور اس وقت سے بھی واقف ہے جب وہ پانی کی ایک بوند کی شکل میں اپنی ماؤں کے پیٹوں پڑے اور پھر مضغہ، گوشت اور جنین کی صورت اختیار کی۔ ایسے ناتواں اور حقیر وجود کے لیے جس کی ابتدا، اتنی ناچیز ہے، زیبا نہیں کہ وہ اپنی برتری کے غرور میں مبتلا ہو۔ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب خدا کی بخشش ہے، ایک ذرہ بھی اس کی قدرت وقابلیت کا نتیجہ نہیں ہے:

اسی مشرکانہ ذہنیت کی تصویر سورہ کہف میں ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۭ كِلْتَا

اور ان کو دو شخصوں کی تمثیل سناؤ۔ ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگوروں کے دو باغ بنائے، ان کو کھجوروں کی قطار سے گھیرا اور ان کے درمیان کھیتی

الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ
تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْــًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا
خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۙ وَّكَانَ لَهٗ
ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ
يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا
وَّاَعَزُّ نَفَرًا ۝ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ
وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ
اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۙ
وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ
وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ
لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝
قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ
يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِىْ
خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ
مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰٮكَ
رَجُلًا ۝ لٰكِنَّا۠ هُوَ
اللّٰهُ رَبِّىْ وَلَاۤ اُشْرِكُ
بِرَبِّىْۤ اَحَدًا ۝

(الکہف - ۱۸ : ۳۲-۳۸)

کے قطعات بھی رکھے۔ دونوں باغ خوب پھل لائے، ان میں ذرا کمی نہیں کی، اور ان کے بیچ بیچ میں ہم نے نہر بھی دوڑا دی اور اس کے پھلوں کا موسم ہوا تو اس نے اپنے ساتھی سے بحث کرتے ہوئے کہا: میں تم سے مال میں بھی زیادہ اور تعداد کے اعتبار سے بھی زیادہ طاقتور ہوں اور وہ اپنے باغ میں اس حال میں داخل ہوا کہ وہ اپنی جان پر آفت ڈھا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ میں یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ کبھی برباد ہو جائے گا اور میں قیامت کے آنے کا بھی گمان نہیں رکھتا اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا ہی گیا تو اس سے بھی بہتر مرجع پاؤں گا اس کے ساتھی نے بحث کرتے ہوئے کہا: کیا تم نے اس ذات کا انکار کیا جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے، پھر تم کو ایک مرد بنا کر کھڑا کیا۔ لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔

یہ ایک معاشرت کی تصویر ہے جو عرب کی اجتماعی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی

تھی اور جس کے لیے عربی ادب میں اصطلاحی لفظ 'منافرت' ہے۔ اس پر غور کیجیے تو ایک ایسے ذہن کے تمام مفاسد اس میں عریاں ہو گئے ہیں جو استحقاقِ ذاتی کے گھمنڈ میں مبتلا ہو۔ اس کے جواب میں دوسرے بندہ موحّد نے بعینہٖ وہی بات کہی ہے جو اوپر سورہ نجم اور سورہ معارج والی آیتوں میں گزر چکی ہے یعنی اس کو خلقت اور اس کی اصل کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس انسان کی اصل مٹی ہے جو اپنی ابتدا میں صرف نجس پانی کی ایک بوند ہے، اس کے لیے استحقاقِ ذاتی کا لفظ بالکل بے معنی ہے اور پھر نہایت خوبی کے ساتھ اس امر کو واضح کیا ہے کہ یہ استکبار اور استحقاقِ ذاتی کا گھمنڈ درحقیقت شرک ہے۔ جو شخص اس غرور میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو خدائی میں شریک بناتا ہے اور پھر اپنے آپ کو اس شرک سے بری کیا ہے: 'لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا' (لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا) بعد کی آیت میں اس بد خو و غلط مغرور کے باغ کی تباہی کا ذکر ہے اور اس کی حسرت ان الفاظ میں بیان کی گئی: 'يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا' (الکہف - ۱۸: ۴۲) (اے کاش! میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بناتا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک دولت و ثروت کی چکا چوند باقی رہی آنکھیں بند رہیں، اس وقت تک اپنی قوت و تدبیر پر ناز تھا، اپنی جمعیت و عصبیت پر فخر تھا، اپنے خدم و حشم کی کارفرمائیوں پر غرور تھا، لیکن جب باغ ویران ہو گیا اور جمعیت و عصبیت کچھ کام آئی نہ خدم و حشم کچھ کام آئے، 'وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا' (الکہف - ۱۸: ۴۳) (اور اس کے پاس نہ تو کوئی جتھا تھا جو خدا کے مقابلے میں اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود ہی انتقام لینے والا بن سکا)۔ تو ان اصنام کی بے حقیقتی اس پر واضح ہو گئی اور پھر اس نے افسوس کیا کہ ہائے میری کم بختی میں نے ان کو کیوں اپنے پروردگار کا شریک ٹھہرایا!

جن ذہنوں کے اندر یہ گھمنڈ بسا ہوا ہے ان پر مایوسی و دل شکستگی چھا جاتی ہے لیکن جوں ہی حالات بدل جاتے ہیں، سر و سامان پھر بہم ہو جاتا ہے، قوت و شوکت کے جلوے پھر نظر آنے لگتے ہیں، نفس کے اندر کی دبی ہوئی خدائی پھر جاگ اٹھتی ہے اور وہ قرآن کے لفظوں میں "فرح فخور" (اکڑنے والے اور فخر کرنے والے) بن کر زمین میں پھر فساد پھیلانے اور خدا کی خدائی کی بجائے خدا کے بندوں سے اپنی خدائی منوانے میں اپنا سارا زور صرف کرنے لگتے ہیں:

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ

(یونس – ۱۰: ۲۲-۲۳)

وہی ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتیاں ہوائے موافق سے چل رہی ہوتی ہیں اور وہ اس میں مگن ہوتے ہیں کہ دفعتاً ایک باد تند آتی ہے اور ان پر ہر جانب سے موجیں اٹھنے لگتی ہیں اور وہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ہم ہلاک ہوئے تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں، خالص اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہمیں اس آفت سے نجات دی تو ہم تیرے شکر گزار بندوں میں سے ہو کر رہیں گے۔ تو جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے وہ نجات پاتے ہی زمین میں ناحق کے، سرکشی کرنے لگتے ہیں۔

یہی متکبرانہ ذہنیت ہے جس کا ذکر سورۂ قصص میں ہے:

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۔ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي ۚ

(القصص - ۲۸ : ۷۷ - ۷۸)

اور جو کچھ خدا نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں آخرت کے طالب بنو اور دنیا میں سے اپنے حصّہ کو نہ بھولو اور جس طرح خدا نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے اسی طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان کرو اور زمین میں فساد کے طالب نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ فساد چاہنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے یہ جو کچھ ملا ہے میرے ذاتی علم کی بدولت ملا ہے۔

سورۂ فجر میں ہے:

فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۚ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۚ

(الفجر - ۸۹ : ۱۵ - ۱۶)

لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا خداوند اس کا امتحان کرتا اور اس کو عزت و نعمت بخشتا ہے تو وہ خیال کرتا ہے کہ میرے رب نے میری شان بڑھائی ہے اور جب اس کو جانچتا اور رزق میں کمی کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے خداوند نے مجھے ذلیل کر ڈالا۔

یعنی یا تو یہ سمجھ کر کہ میں لائقِ عزت ہوں اور مجھے جو کچھ ملا ہے میرے استحقاق کا نتیجہ ہے مغرور و متکبر ہو جاتا ہے اور زمین میں اکڑنے اور فساد پھیلانے لگتا ہے یا بحالتِ دیگر یہ سمجھ کر کہ خدا نے مجھے بالکل تنگ اور ذلیل بنا دیا، ذلیل و نامراد ہو جاتا ہے۔

اور عزتِ نفس کا وہ جوہر بھی کھو بیٹھتا ہے جو سوسائٹی کے اندر اس کو ایک خوددار اور باوقار انسان کی جگہ دلاتے۔ یہ عدم توازن محض اس غلطی کا نتیجہ ہے کہ انسان اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنے استحقاقِ ذاتی اور اپنی تدبیر و قابلیت کا ثمرہ خیال کرنے لگتا ہے۔ یہ تصور ایک مشرکانہ تصور ہے۔ موحدانہ تصور یہ ہے کہ انسان عسر اور یسر، تنگی اور فراخی دونوں کو خدا کی طرف سے سمجھے، دونوں میں اپنے لیے آزمائش خیال کرے۔ فراخی کے متعلق یہ خیال کرے کہ یہ شکر کی آزمائش ہے۔ تنگی کے متعلق یہ خیال کرے کہ یہ اس کے صبر کا امتحان ہے۔ ان دونوں حالتوں سے ایک بندے کا پورا دین ایمان کی کسوٹی پر جانچا جاتا ہے، کیونکہ دین درحقیقت صبر اور شکر ہی کے مجموعہ کا نام ہے۔ جس شخص کا تصور یہ ہوگا، لازماً اس کا نفس متوازن رہے گا۔ نہ وہ مصائب میں گھبرائے گا، نہ فراخی و کشادگی کے وقتوں میں مغرور و متکبر ہوگا۔ وہ جب دشمنوں کے نرغہ میں ہوگا اور اس کے سر کے لیے بڑے بڑے انعاموں کا اعلان ہوگا تو عین اس وقت جب کہ آخری خطرہ بالکل سامنے ہوگا وہ اپنے ایک ہی ساتھی کو ان لفظوں میں تسلی دے گا: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ‘‘(التوبۃ - ۹ : ۴۰) (تم غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے) اور عین اس وقت جب کہ ہزاروں انسانوں کی دل بادل فوج کے اندر اس پر ایک شہنشاہِ اعظم کا دھوکا ہو رہا ہوگا اس کی مقدس پیشانی گھوڑے کی زین پر خدا کے آگے جھکی ہوگی۔ ایسے متوازن نفس کے لیے قرآن نے نفسِ مطمئنہ کا لفظ استعمال کیا ہے: ’’يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ‘‘ (الفجر - ۸۹ : ۲۷-۳۰) (اے وہ جس کا دل (اپنے رب پر) جم رہا، چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ مل جا میرے بندوں میں، داخل ہو جا میری جنت میں۔)

باب ۳

اہلِ کتاب کا شرک

اہلِ کتاب کے دو گروہوں کا ذکر قرآن نے کیا ہے: یہود اور نصاریٰ کا۔ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے سوا ان تمام اساساتِ دین کو تسلیم کرتے تھے جن پر ایمان لانے کی دعوت قرآن دیتا تھا۔ یہاں تک کہ عقیدۂ توحید بھی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان مسلم تھا۔ نہ یہ لوگ اصول کی حد تک اس کے منکر تھے، نہ تورات اور انجیل کی تصریحات کی موجودگی میں اس کا انکار ممکن تھا۔ لیکن اس مسئلہ پر ایمان رکھنے کے باوجود وہ بہت سے ایسے اعمال و معتقدات میں مبتلا تھے جو کفر اور شرک کو مستلزم تھے۔ قرآن نے اسی مسئلہ کو اساسِ بحث قرار دے کر ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے اعمال و عقائد کو تناقض سے پاک کریں یا تو توحید کا انکار کر دیں کہ اس کے لوازم کو تسلیم کرنے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر جس وادی میں چاہیں ٹھوکر کھائیں، یا اس کے لوازم اور مقتضیات کو بھی تسلیم کریں اور اسی چراغ کو لے کر اپنے تمام اعمال و عقائد کا جائزہ لیں اور جو بدعات و مفاسد ان میں، توحید سے بالکل متناقض، پیدا ہو گئے ہیں' ان کو دُور کریں۔

یاد ہوگا، عربوں سے بحث کا آغاز اس نقطہ سے ہوا تھا کہ جب آسمان و زمین کا خالق' قوتوں اور قابلیتوں کا موجد' آسمان و زمین کا مدبر خدا ہی ہے اور تمہیں ان مسلمات سے انکار نہیں ہے تو پھر ایسی باتیں کیوں مانتے ہو جو ان تمام مسلمات کے تار و پود بکھیر دیتی ہیں۔ بالکل اسی طرح ایک قدم آگے بڑھ کر اہلِ کتاب سے نفس عقیدۂ توحید کو مرکز

قرار دے کر بحث کا آغاز ہو کہ اگر یہ عقیدہ ہمارے اور تمہارے درمیان مانا ہوا ہے تو آؤ اسی کسوٹی پر اپنے کھرے کھوٹے کا امتحان کر لو، فرمایا:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا
اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ
بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ
وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ
بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا
اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔

آل عمران - ۳ : ۶۴

کہہ دو اے اہل کتاب اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مشترک ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی اللہ کی بندگی کرنا، کسی کو اس کا شریک نہ ماننا، کسی کو خدا کے سوا رب نہ ٹھہرانا اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان مسلّم تھا۔ ان میں سے کسی ایک بات سے بھی نہ یہود کو اختلاف تھا نہ نصاریٰ کو۔ لیکن کسی کو رب نہ ماننے کا مفہوم وہ صرف یہ سمجھتے تھے کہ کسی کو خدا کے سوا رب نہ پکارا جائے۔ ان کے نزدیک خدا کی ربوبیت میں اس بات سے کوئی فرق نہیں آتا تھا کہ جو حقوق و صفات خدا کے لیے مخصوص ہیں ان میں دوسروں کو بھی شریک کر دیا جائے۔ مثلاً تشریع اور قانون سازی اللہ تعالیٰ کے مخصوص اختیارات میں سے ہے، اور کسی کے لیے بھی یہ بات جائز نہیں ہے کہ اس کے اس اختیار میں کسی قسم کی مداخلت کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں ساجھا بٹانے کی جرأت کا مرتکب ہوتا ہے اور اگر ہم خود کسی کے لیے یہ حق تسلیم کرتے ہیں تو گو زبان سے ہم اس کو رب یا خداوند نہ کہیں، لیکن درحقیقت ہم اس کو خدا کی حاکمیت اور ربوبیت میں شریک گردانتے ہیں یہی یہود اور نصاریٰ خدا

کے اس حق میں دوسروں کو شریک کرنے میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے۔
چنانچہ قرآن نے اسی بنیاد پر یہود و نصاریٰ دونوں ہی کو اس امر کا مجرم قرار دیا کہ یہ
اپنے علماء اور فقیہوں کو اللہ کے سوا رب ٹھہراتے ہیں:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ	انہوں نے اللہ کے سوا اپنے فقیہوں
رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ	اور راہبوں کو رب بنا ڈالا اور مسیح ابن
اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ	مریم کو بھی، حالانکہ انہیں صرف ایک
وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا	ہی معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔
اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ	اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک
سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○	ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک
(التوبة - ۹ : ۳۱)	ٹھہراتے ہیں۔

اس آیت سے متعلق احادیث میں عدی بن حاتمؓ کا ایک سوال منقول ہے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہود و نصاریٰ اپنے عالموں اور راہبوں کو رب تو نہیں کہتے؟ آپ نے فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ نے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں ان کو وہ حرام کرتے ہیں، تو تم ان کو حرام قرار دے دیتے ہو، اور جن چیزوں کو اللہ نے حرام کیا ہے ان کو وہ حلال کر دیتے ہیں، تو تم ان کو حلال قرار دے دیتے ہو؟ عدی بن حاتمؓ نے کہا: ہاں، یہ بات تو ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: فتلک عبادتهم، یہی ان کی پرستش ہوئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ عدی بن حاتمؓ کو یہ غلط فہمی تھی کہ جب تک زبان سے کسی کے خداوند ہونے کا اقرار نہ کیا جائے اس وقت تک وہ خدا اور رب نہیں ہوتا اور جب تک کسی کی رسمی عبادت نہ کی جائے اس وقت تک وہ معبود نہیں بنتا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی کا ازالہ یوں فرمایا کہ کسی کو خداوند کہو یا نہ کہو، اگر وہ حقوق و اختیارات اس کو دیتے ہو جو خدا کے لیے مخصوص ہیں، تو بغیر اس کے

کہ تم زبان سے اس کو رب اور اللہ کہو اس کو رب مان رہے ہو اور بغیر اس کے کہ اس کی پوجا کے رسمی طریقے بجا لاؤ اس کی پرستش کر رہے ہو۔ قانون اور شریعت بنانا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ اس منصب پر تم جس کو سرفراز کرو وہ خداوند بن جائے گا اور تم اس کے بندے بن جاؤ گے، زبان سے اس کو بندہ کہو یا خدا۔

آیت کی صحیح توجیہ سمجھنے کے لیے یہ تشریح کافی ہے، لیکن اس کی مزید وضاحت کے لیے یہاں چند مفید باتوں کا بیان کرنا ان شاء اللہ بے موقع نہ ہوگا۔

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے دو شرک بیان ہوئے ہیں: احبار و رہبان کو رب بنانا اور حضرت مسیح کو رب بنانا۔ ہم دونوں چیزوں پر بالاجمال گفتگو کریں گے

۱- احبار پرستی :

یہود کے متعلق یہ امر معلوم ہے کہ انہوں نے اپنی شریعت کی بہت سی باتیں فراموش کر دی تھیں: ﴿فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ﴾ (المآئدہ - ۵: ۱۳) (تو جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاد دہانی کی گئی وہ اس کا ایک حصہ بھلا بیٹھے) بہت سے مقامات میں تحریف کر ڈالی تھی، مثلاً جہاں بنی اسماعیل کے اندر ایک نبی خاتم کی بعثت یا قبلۂ ابراہیمی یا مقامِ قربانی وغیرہ کا بیان تھا۔ بہت سے احکام انہوں نے چھپا دیے تھے، بالخصوص جو زنا، سرقہ، قتلِ نفس وغیرہ کے حدود کے متعلق تھے۔ بہت سے احکام پر انہوں نے شرعی حیلوں کے پردے ڈال دیے تھے، بہت سے فتوے قانونِ الٰہی کے بالکل خلاف، محض اغراضِ دنیوی کے لیے نکلتے تھے، اور پھر ان کے متعلق یہ دعوے کرتے تھے کہ یہ عین تورات کے احکام ہیں۔ یہ ساری باتیں قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی شریعت کے ان تمام گوشوں میں خدا کی حاکمیت بالکل معدوم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ان کے علماء و فقہاء کے خود ساختہ احکام و قوانین

نے لے لی تھی۔

اسی طرح بائبل ہسٹری اور یہود کے نظامِ قضا اور طریقِ قانون سازی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اجتہاد بالکل معدوم تھا۔ قبائل میں جو قاضی مقدمات کے فیصلے کے لیے مامور تھے وہ نئے مسائل میں، جن کے بارے میں کوئی صریح حکم تورات میں موجود نہ ہوتا، یہ نہیں کرتے تھے کہ تورات کے احکام اور اپنے نبی کے فیصلے سامنے رکھ کر اجتہاد کریں، اور اسلام کے اصول کے مطابق خدا کی مرضی سے اوفق بات معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ معاملہ کو کاہنِ اعظم کے سامنے پیش کر دیتے۔ کاہنِ اعظم خدا کی مرضی معلوم کرنے کا ایک قدرتی ذریعہ (NATURAL ORGAN) خیال کیا جاتا تھا۔ کاہنِ اعظم یہ کرتا کہ وہ خیمۂ عبادت میں قدس الاقداس کے اندر جاتا جہاں تابوت ایک پردہ کے پیچھے رکھا ہوا ہوتا۔ یہ مقام الہامِ ربانی کا مرکز خیال کیا جاتا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس پر یہواہ — خدا — کے احکام الہام ہوتے۔ وہ ان احکام سے لوگوں کو مطلع کرتا اور لوگوں پر ان کی تعمیل واجب ہوتی۔ بلنچلی اپنی کتاب "دی تھیوری آف سٹیٹ" (THE THEORY OF STATE) میں مذہبی حکومت (تھیاکریسی) کے باب میں لکھتا ہے:

"قانونِ الٰہی ایک سونا منڈھے ہوئے صندوق میں رکھا رہتا، جس کی دو کروبی حفاظت کرتے، اور جس کی تعظیم الہامِ ربانی کے مرکز کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ تابوت خیمہ کے اندر ایک پردہ کے پیچھے قدس الاقداس میں رہتا تھا اور کاہنوں کی طرف سے پورے اہتمام سے اس کی نگرانی ہوتی تھی۔ یہیں کاہنِ اعظم یہواہ — خدا — کے احکام معلوم کرتا اور لوگوں کو مطلع کرتا۔

"قاضی جو قبائل میں شریعت کی تنفیذ پر مامور تھے وہ یہ کام خدا کے نام سے انجام دیتے تھے۔ کیونکہ قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص تھا۔ اگر

کوئی معاملہ ان کے سامنے ایسا آجاتا جس کا فیصلہ ان کے لیے مشکل ہوتا تو اس میں ان کے لیے ضروری ہوتا کہ لاویوں کے ذریعے خدا کی مرضی معلوم کریں۔ یہ طریقہ ٹھیک ٹھیک بت پرستوں کی نقالی ہے۔ اور یہود نے اپنے بگاڑ کے زمانہ میں اس کو اختیار کیا۔ جس طرح مصر، عراق، نینوا وغیرہ کے بت خانوں میں پجاری اور پروہت، کسی اہم ضرورت کے وقت، اپنے معبودوں کے سامنے جاکر ہاتف غیب کی زبان سے، ان معبودوں کی مرضی معلوم کرتے تھے یا جس طرح اہلِ عرب اپنے معبودوں کے سامنے فال کے تیروں کے ذریعہ سے ان کے احکام اور فیصلے معلوم کرتے تھے اسی طرح یہود نے بھی تابوت کو ایک معبود بنا لیا تھا۔ جس معاملہ میں ان کو مشکل پیش آتی، کاہن اعظم تابوت کے سامنے جاکر، خدا کے احکام اور فیصلے معلوم کرتا۔ مجرد تابوت کے سامنے حاضری حصولِ الہام کے لیے کافی تھی۔ یہ کاہن معصوم اور ملہم خیال کیے جاتے۔ اس طریقہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنی لاوی اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبۃ ۹ : ۳۱) بن بیٹھے اور ان کے ہر قسم کے خیالات و اوہام نے قانون و شریعت کا درجہ حاصل کر لیا۔

نصاریٰ کے ہاں صورتِ معاملہ اس سے بھی زیادہ بھونڈی ہے۔ نصاریٰ کی اصل حیثیت یہود کے ایک اصلاح یافتہ فرقہ کی تھی، نہ کہ ایک مستقل اُمت کی حضرت مسیح علیہ السلام نے خود فرمایا ہے کہ میں تورات کو منسوخ کرنے نہیں، بلکہ اس کو پورا کرنے آیا ہوں۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ جب تک اس کی ساری باتیں پوری نہ ہولیں ایک نقطہ بھی اپنی جگہ سے ٹل نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کوئی نئی شریعت نہیں دی، بلکہ اپنے پیروؤں کو صرف روحِ دین کی تعلیم دی اور قوانین و شرائع میں اسی دین کی پیروی کا حکم دیا جو تورات میں موجود تھا۔ صرف یہود کی بدعات کی حد تک اس میں اصلاح فرمائی۔ نصاریٰ کی ابتدائی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں حضرت مسیح

علیہ السلام کے خلفاء کی حیثیت یہی تھی۔ وہ احکام و شرائع میں تمام تر تورات کے متبع تھے۔ لیکن پال نے مسیحیت کے تمام ظاہر و باطن کو بالکل مسخ کر ڈالا۔ اس نے نصاریٰ کو ایک مستقل نام اور ایک مستقل امت کی حیثیت سے ممیز کیا، اور تورات کے احکام کی پابندی حضرت بنی اسرائیل کے لیے خاص کر دی۔ غیر بنی اسرائیل کے لیے تورات کی پابندی منسوخ کر کے شراب اور سور وغیرہ کو جائز قرار دیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے پچھلے خلفاء نے ان مسائل پر اس سے بڑے بڑے مباحثے کیے، لیکن پال کی بدعات رومیوں وغیرہ کے مذاق کو اس قدر اپیل کرنے والی تھیں کہ بالآخر انہیں کو فروغ ہوا۔ اس طرح مسیحیت نے ایک مستقل امت کی حیثیت اختیار کر لی، لیکن ایک ایسی امت کی جو کتاب و شریعت سے محروم ہے۔ کیونکہ انجیل احکام سے بالکل خالی ہے اور تورات کی پیروی سے پال نے ان کو بری کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام معاملاتِ زندگی میں نصاریٰ خدا کے بجائے اپنے علماء کی بدعات کے پیرو ہو گئے۔ علماء جو کچھ کہتے وہی خدا کا حکم بن جاتا۔ قسطنطین کے زمانہ سے، جب سلاطینِ روم کی تلوار نے عیسائیت کی عداوت کی جگہ اس کی حمایت کا رنگ اختیار کیا، پوپ کی عظمت کا یہ حال ہوا کہ ایک طرف پوپ کے احکام روانہ ہوتے دوسری طرف بادشاہ کا فرمان جاری ہوتا کہ ان احکام کی خدائے قادر مطلق کے احکام کی حیثیت سے پیروی کی جائے۔ بالآخر یہ لے اس درجہ بڑھی کہ ان مقدس علماء کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ یہ زمین پر جو باندھتے وہ آسمان پر بھی باندھا جاتا اور یہ زمین پر جو کھولتے وہ آسمان پر بھی کھولا جاتا۔ ان کی زبان خدا کی ترجمان بن گئی۔ یہاں تک کہ یہ زمین پر جس کو بخش دیتے وہ آسمان پر بھی بخش دیا جاتا۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اللہ کے احکام کے پیرو نہیں تھے، بلکہ العیاذ باللہ خدا خود ان کے احکام کی تعمیل کرتا تھا۔

۲۔ حضرت مسیحؑ کو رب بنانا :

اسی طرح نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی رب بنالیا۔ عیسائیوں کے علم کلام اور مذہبی مباحثات کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فتنہ کا بانی بھی پال ہی ہے حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد، جیسا کہ معلوم ہے، غیر تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ برعکس اس کے پال یونانی فلسفہ اور یونانی تصوف کا ماہر تھا۔ اس نے انجیل کی شرح ایک نئے رنگ سے پیش کی اور دعویٰ کیا کہ میرے لیے مسیح (علیہ السلام) کے ان پڑھ شاگردوں کے الفاظ کی پیروی ضروری نہیں ہے جو حقائق و رموز کے سمجھنے سے بالکل قاصر تھے، بلکہ میرا علم براہِ راست بطریق مکاشفہ خود مسیح (علیہ السلام) سے ماخوذ ہے۔ لطف یہ ہے کہ پال عبرانی زبان سے جو انجیل کی اصل زبان تھی، بالکل ناواقف تھا۔ اس کا تعلق انجیل کی اصل زبان کے ساتھ وہی تھا جو ایک عجمی جاہل کا قرآن کی زبان کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ جس طرح اسلام کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ دین میں بدعات کے فتنے بیشتر ان عجمیوں کی بدولت اٹھے جو قرآن و حدیث کی اصل زبان سے عموماً ناواقف تھے اور ساتھ ہی ان کے دماغ عجمی فلسفہ و تصوف سے مسموم تھے اسی طرح پال نے جو انجیل کی اصل زبان سے ناواقف اور یونانی فلسفہ و تصوف کا ماہر تھا انجیل اور نصرانیت کا بالکل ہیولاہی بدل ڈالا۔ اس پر باطنیت (GNOSTICISM) کا رنگ غالب تھا اور اس کی تمام سرگرمیوں میں جو چیز اصل محرک کی حیثیت سے نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو رومیوں کے اندر عیسائیت کو مقبول بنائے۔ اس ذوق اور اس محرک کے ساتھ قدرۃً اس کو حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل زندگی اور ان کی واقعی تعلیمات سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی رغبت کی چیزیں وہی ہو سکتی تھیں جو اس کے فلسفۂ باطنیت کے ساتھ میل رکھتی ہوں اور جن کو آسانی کے ساتھ رومی میتھالوجی سے ہم آہنگ کیا جاسکے۔ چنانچہ اس کی ساری بدعتوں

کے اندر اس کا یہ ذوق ابھرا ہوا نظر آتا ہے لیکن ہم یہاں صرف الوہیت مسیح کی بدعت کی کسی قدر وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

انجیل میں مسیح (علیہ السلام) کے لیے بیٹے (ابن) اور کلمۃ اللہ اور خدا کے لیے باپ (اب) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور ساتھ ہی جگہ جگہ ان کو ابن آدم بھی کہا گیا ہے، اور توحید کی بھی نہایت واضح لفظوں میں تعلیم دی گئی ہے۔ مسیح (علیہ السلام) کے پیچھے شاگردوں کو ان باتوں کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں پیش آئی۔ عبرانی زبان میں 'ابن' کا لفظ عبد اور بیٹے کے مفہوم میں مشترک ہے۔ اسی طرح 'اب' کا لفظ باپ اور رب کے معانی میں مشترک ہے۔ ان کو نہ ابن کے لفظ سے کوئی دھوکا ہو سکتا تھا نہ اب کے لفظ سے۔ وہ بے تکلف ابن اللہ کا مفہوم عبداللہ اور ابی کا مفہوم ربی سمجھتے تھے اور بالفرض لفظ کے اشتراک سے، اگر کوئی ابہام بھی پیدا ہو سکتا تھا تو توحید کی واضح تعلیمات اس کو دور کرنے کے لیے کافی تھیں۔ اہل حق کا طریقہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ مشتبہ چیزوں پر عقائد کی بنیاد نہیں رکھتے، بلکہ ان کی تاویل واضح تعلیمات اور قطعی اصولوں کی روشنی میں کرتے ہیں۔ لیکن پال کے لیے انجیل کے انہی چند الفاظ نے تاویل بازی اور فتنہ سازی کا دروازہ کھول دیا۔ پال کا تمام تر ماخذ عبرانی سے ناواقفیت کی وجہ سے، یونانی انجیلیں تھیں۔ یونانی میں آکر 'اب' اور 'ابن' کے لفظ اپنے اس مفہوم سے بالکل علیحدہ ہو گئے تھے جن مفہوموں میں وہ عبرانی میں مستعمل تھے۔ یونانی میں صریحاً وہ باپ اور بیٹے کے مفہوم میں ہو گئے تھے یہیں سے پال کے مذاقِ باطنیت کو غذا ملی۔ مسیح کو کلمۃ اللہ بھی کہا گیا تھا۔ اسی کو اساس قرار دے کر اس نے یہ فلسفہ تراشا کہ کلمہ (LOGOS) ایک برتر تخلیقی روحِ کائنات (WORLD POWER) ہے۔ اور مسیح (علیہ السلام) اس برتر تخلیقی روحِ کائنات کا مظہر (INCARNATION) ہیں۔ بس یہیں سے مسیح (علیہ السلام) کے ابن اللہ ہونے کی بدعت چل پڑی۔

پال ۲۶۴ء میں مرا ہے۔ اس وقت سے لے کر چوتھی صدی کے اوائل تک اس مسئلہ پر عیسائیوں کے درمیان جو ہنگامے برپا ہوئے اور اس بنیاد پر جو فرقے اٹھے، ان کی تفصیل طولانی ہے لیکن اس عہد کی تاریخ کے طالب علم کو تین فرقے نمایاں طور پر نظر آئیں گے :

(۱) **آریوسی** (ARIANS) - یہ آریوس (ARIUS) کے پیرو تھے اور مسیح (علیہ السلام) کو مخلوق مانتے تھے۔

(۲) **سابیلی** (SABELLIANS) - یہ لوگ حلول کے قائل تھے اور مسیح (علیہ السلام) کو خدا کا ایک اوتار یا اس کا ایک رخ (ASPECT) کہتے تھے۔ ان کے نزدیک خدا ہی خالق، منجی اور معزی سب کچھ تھا۔ جس طرح ایک ہی شخص باپ، مربی اور معلم سب کچھ ہو سکتا ہے۔

(۳) **تثلیثی** - ان کا لیڈر (ATHANSIOS) تھا۔ یہ لوگ عقیدۂ تثلیث کے داعی تھے۔

ان فرقوں میں سے آریوسی فرقہ صحیح نصرانیت کے بقایائے صالحہ میں سے تھا اگرچہ دوسرے فرقوں کے دباؤ اور رجحان عام کے اثر سے یہ لوگ بھی بعد میں حضرت مسیحؑ کو مقام بشریت سے کچھ بالاتر خیال کرنے لگ گئے تھے، لیکن تثلیث یا حلول کی تردید میں اس فرقہ کی کوششیں بے نظیر ہیں۔ تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے اوائل میں ایک خاص واقعہ نے مسیح (علیہ السلام) کی الوہیت اور عبدیت کے متعلق عیسائیوں کے تمام فرقوں کو بری طرح دست و گریبان کر رکھا تھا۔ اس وقت تک رومی شاہنشاہی کے اندر مسیحیت کافی پھیل چکی تھی اور یہ اختلافات سلطنت کے دشمنوں کے لیے سازگار ہو سکتے تھے۔ اس وجہ سے قسطنطین نے مسیحیت کا قلع قمع کرنے کی وہ پالیسی جو اس کے پیشروؤں نے اختیار کر رکھی تھی، ترک کر کے حمایتِ مسیحیت کی پالیسی اختیار کی۔ اس کی سب سے پہلے کوشش یہ ہوئی کہ کسی طرح ان نبرد آزما اور متصادم فرقوں میں اتحاد کرائے تاکہ ان اختلافات کی وجہ سے سلطنت کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس کے لیے سب سے پہلے ۳۱۴ء میں

اریلیس میں اس نے چرچ کی ایک کونسل منعقد کی، لیکن پیش نظر مقصد میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر ۳۲۵ء میں اس کے ایما سے، چرچ کی ایک جنرل کونسل نیسیہ (NICEA) میں منعقد ہوئی، اور گو وہ خود اس وقت تک باضابطہ عیسائی نہیں ہوا تھا، لیکن اسی نے کونسل کی صدارت کی۔ یہ کونسل نہایت اہم تھی۔ اس میں عیسائیت کے تمام فرقوں اور تمام کلیسوں کے ذمہ دار نمائندے موجود تھے۔ اصل معرکہ آریوی فرقہ اور الوہیت مسیح کے معتقدین کے درمیان تھا۔ اس کونسل کی روداد نہایت دلچسپ ہے۔ جس وقت بوڑھا آریوس مسیح (علیہ السلام) کے مخلوق ہونے پر تقریر کرنے کھڑا ہوا، ایک شخص نے اس کے منہ پر تھپیڑ کھینچ مارا اور بہت سے بشپ اور پادری کانوں میں انگلیاں دیے ہوئے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ اس بڈھے پھوس کی کفریات کی تاب نہیں لا سکتے۔ کونسل کی اکثریت آریوس کے خلاف تھی، اس وجہ سے اس کی پارٹی اور اس کے دوسرے حامیوں کو شکست ہوئی۔ کونسل نے کئی دن کی بحث و تمحیص کے بعد کثرت رائے سے مسیحی عقیدہ مندرجہ ذیل الفاظ میں مرتب کیا جو (NICEAN CREED) کے نام سے موسوم ہوا، اور مسیحی عقائد کے باب میں چوتھی صدی سے لے کر آج تک مسلّم اور سب سے اہم دستاویز ہے:

"ہم ایک خدا پر ایمان لاتے ہیں جو باپ ہے اور قادر مطلق، تمام چیزوں کا خالق تمام حاضر و غائب کا، اور ایک خداوند یسوع مسیح پر ایمان لاتے ہیں، ابن اللہ، خدا کا وجنا ہوا، اکلوتا، باپ کے جوہر سے، خداوند خدا، نور النور، عین خدا سے عین خدا، جنا ہوا، بنایا ہوا نہیں، باپ ہی کے جوہر سے، جس نے تمام چیزیں بنائیں آسمان اور زمین میں، جو ہم آدمیوں کے لیے اور ہماری نجات کے لیے اترا، مجسّم بشکل انسانی اس نے دکھ اٹھایا، پھر تیسرے دن جی اٹھا اور آسمان پر چڑھ گیا۔ مُردوں اور زندوں کی عدالت کے لیے پھر آئے گا اور ہم روح القدس پر ایمان لاتے ہیں۔

"پر وہ جو کہتے ہیں کہ پہلے وہ نہ تھا اور جنے جانے سے پہلے وہ معدوم تھا

اور وہ عدم سے وجود میں آیا، یا وہ جو کہتے ہیں کہ خدا کا بیٹا دوسری شے یا دوسرے جوہر سے ہے، یا مخلوق ہے یا بشر ہے وہ کیتھولک اور رسولی چرچ کی طرف سے مردود ہیں۔"

نیسیہ کی کونسل کے بعد سے یہی عقیدہ مسیحی دنیا کا اصلی عقیدہ ہے۔ اس میں آریوس اور اس کے ساتھیوں کی علانیہ تکفیر کر دی گئی ہے۔ اس کونسل کے بعد سے یہ صرف چرچ ہی کا نہیں، بلکہ سٹیٹ کا بھی مذہب بن گیا اور اس کی تائید کے لیے حکومت کی تلوار بھی بے نیام ہو گئی۔ اس وجہ سے آریوس کے بہت سے ساتھیوں نے بھی اس کی تائید ہی میں امان دیکھی۔

کس قدر حیرت اور عبرت کا مقام ہے کہ جن عیسائیوں نے پوری تین صدیاں، انسانوں کی خدائی کے انکار کے جرم میں، سلاطین روم کے دل ہلا دینے والے مظالم شاہد کے شکنجہ میں گزاریں، تلواروں سے قیمہ کیے گئے، آگ میں جھونکے گئے، درندوں سے نچوائے گئے، لیکن انسانوں کی خدائی سے برابر انکار کرتے رہے، وہی عیسائی نیسیہ میں جمع ہو کر، ایک کافر بادشاہ کی رہنمائی میں، مسیح کی خدائی کے محضر پر اس عزم و جزم کے ساتھ اپنی مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں۔

اس کونسل کے بعد کونسلوں پر کونسلیں منعقد ہوئیں اور بعد کی صدیوں میں بھی برابر منعقد ہوتی رہیں، بہت سے جزئی اختلافات بھی پیش آئے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ آریوس کے حامیوں نے زور بھی پکڑ لیا۔ یہاں تک کہ قسطنطین کے جانشینوں میں سے بھی بعض نے آریوسی عقیدہ اختیار کر لیا۔ لیکن یہ سب عارضی اور وقتی جزر و مد تھے۔ مرکزیت اسی عقیدہ کو حاصل رہی جو اوپر مذکور ہوا اور مشہور مورخ گبن کے لفظوں میں اب اسی عقیدہ کے اسرار و رموز کو حل کرنے کا نام مسیحیت رہ گیا ہے۔

عیسائیوں کے یہی وہ مشرکانہ عقائد ہیں جن کی قرآن نے نہایت تفصیل کے ساتھ

تردید کی ہے۔ ہم بعض آیتیں نقل کرتے ہیں:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ	اور یہود عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور
اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ	نصاریٰ مسیح کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ یہ
ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ	سب ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں،
يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ	یہ ان لوگوں کی بات نقل کر رہے ہیں
كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ	جو ان سے پہلے مبتلائے کفر ہوئے، اللہ
اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝	ان کو غارت کرے! کہاں ان کی مت
(التوبۃ - ۹: ۳۰)	الٹی ہوتی جارہی ہے!!

'ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ' یہ سب ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں یعنی اللہ نے نہیں فرمائی ہیں، یہ ان کی اپنی من گھڑت ہے۔ کتاب الٰہی میں اس کی کوئی سند نہیں ہے۔ 'يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ' یہ ان لوگوں کی بات نقل کر رہے ہیں، جو ان سے پہلے مبتلائے کفر ہوئے یعنی بے سوچے سمجھے اپنے اگلوں کی بات دہراتے ہیں اور قرآن کی توضیح و تشریح کے بعد بھی غور نہیں کرتے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

انہی لوگوں کو مخاطب کرکے دوسری جگہ فرمایا ہے:

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا	کہہ دو: اے اہل کتاب، اپنے دین
فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا	میں بے جا غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی
اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ	بدعات کی پیروی نہ کرو جو اس سے
قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ	پہلے گمراہ ہوئے اور جنہوں نے بہتوں
ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝	کو گمراہ کیا اور جو راہ راست سے
(المآئدۃ - ۵: ۷۷)	بھٹک گئے۔

یعنی اس تمام فساد کی جڑ آبا پرستی ہے جو ضلالت اگلوں سے چلی آ رہی ہے بے سوچے سمجھے اسی کی پیروی کر رہے ہیں اور اندھی تقلید نے ان کو صحیح تعلیم کی طرف توجہ کرنے سے محروم کر دیا ہے۔

بعض آیات میں ان کے شرک کو کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شرک حقیقت کے اعتبار سے کفر ہی ہے۔ دین میں صرف خدا کو ماننا معتبر نہیں ہے، بلکہ اس کو جمیع صفاتِ کمال کے ساتھ ماننا معتبر ہے۔ اس لیے وہ ماننا جو اس کی تمام صفات کے ساتھ نہ ہو، جیسا کہ مشرکین مانتے ہیں، در حقیقت نہ ماننے کے حکم میں ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ	بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں
هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ	نے کہا: اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے
فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔا	پوچھو: کون اللہ سے کچھ اختیار رکھتا ہے
اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ	اگر وہ چاہے کہ ہلاک کر دے مسیح ابن مریم
ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ	کو، اس کی ماں کو اور جو زمین میں ہیں ان
فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ	سب کو اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا	اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے
بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ	سب کی بادشاہی۔ وہ پیدا کرتا ہے
وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ	جو کچھ چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(المائدۃ - ۵ : ۱۷)

اس آیت میں مخاطب وہ لوگ ہیں جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کو خدا کا اوتار مانتے تھے اور چونکہ الوہیتِ مسیح کی ایک بڑی دلیل ان کی خارقِ عادت ولادت بھی تھی اس وجہ سے آیت کے آخری حصہ میں اس کی تردید کی ہے۔ اس خیال کی تردید قرآن نے مختلف جگہ مختلف طریقوں سے کی ہے۔ بعض جگہ ان کو حضرت آدم علیہ السلام

سے تشبیہ دی ہے کہ بن باپ کے پیدا ہونا اگر دلیلِ الوہیت ہے تو آدمؑ کو بھی الٰہ ہونا چاہیے۔ بعض سورتوں میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کو حضرت مسیح علیہ السلام کی سرگزشت کا مقدمہ قرار دیا ہے کہ اگر عام اسباب کے خلاف پیدا ہو جانا خدا بن جانے کی دلیل ہے تو مرد کی پیری اور عورت کے بانجھ پن کے باوجود کسی لڑکے کی ولادت بھی خلاف عادت ہے۔ پھر حضرت یحییٰ علیہ السلام کو خدا کیوں نہیں مانتے؟

سورۂ مائدہ میں ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۔۔۔۔۔ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ (المآئدۃ - ۵ : ۷۲، ۷۳، ۷۵)

بے شک ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ خدا تو یہی مسیح ابن مریم ہے اور حال یہ ہے کہ مسیح نے کہا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کی بندگی کرو، جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ جو کوئی اللہ کا شریک ٹھہرائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ان لوگوں نے بھی کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تین کا تیسرا ہے۔ حالانکہ نہیں ہے کوئی معبود مگر ایک ہی معبود۔۔۔۔۔ مسیح ابن مریم تو بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزرے ہیں اور ان کی ماں ایک صداقت شعار بندی

تھیں، دونوں کھانا کھاتے تھے۔

اس آیت میں حلول اور تثلیث دونوں کے قائلین کی تردید ہے اور ان دونوں فرقوں کے دعوے کے خلاف خود مسیح علیہ السلام کی تعلیم یہ نقل کی گئی ہے کہ اُعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَ رَبَّکُمْ' (المائدۃ ۔ ۵ : ۲) (اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے) انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ قول جو بار بار نقل ہوتا ہے کہ 'میرا باپ اور تمہارا باپ'، قرآن نے اس کی ٹھیک ٹھیک تعبیر یہ بتائی ہے کہ وہ درحقیقت میرا رب اور تمہارا رب فرماتے تھے۔ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ عبرانی میں 'اب' کا لفظ باپ اور رب کے مفہوم کے لیے مشترک ہے۔

آیت کے آخر میں ماں اور بیٹے دونوں کے کھانا کھانے کو بھی ان کی بشریت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کھانا کھانا بشریت کی ایسی دلیل ہے جو بنی اسرائیل میں مسلّم تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جو فرشتے آدمیوں کی شکل میں آئے تھے انہوں نے ان کے سامنے کھانا پیش کیا، لیکن جب انہوں نے کھانے کی طرف التفات نہیں کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فوراً اندیشہ ہوا کہ یہ لوگ بشر نہیں فرشتے ہیں۔

انجیل لوقا میں ہے کہ ایک مرتبہ خود مسیح علیہ السلام نے بھی کھانا کھا کر اپنے حواریوں کو اپنی بشریت کا یقین دلایا۔ اٹھا لیے جانے کے بعد جب وہ دوبارہ اپنے شاگردوں کے پاس آئے تو شاگرد بہت گھبرائے اور ان کی باتیں سن کر ان کو یہ گمان گزرا کہ کوئی روح ان سے باتیں کر رہی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کے اس وہم کو جس طرح دور کیا اس کی تفصیل انجیل میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

"اس نے ان سے کہا، تم کیوں گھبراتے ہو؟ اور کس واسطے تمہارے دل میں شک پیدا ہوتے ہیں؟ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں دیکھو کہ میں ہی ہوں۔ مجھے چھو کر دیکھو کیونکہ روح کے گوشت اور ہڈی نہیں ہوتی جیسا مجھ میں دیکھتے ہو، اور

یہ کہہ کر اس نے انہیں اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے، جب مارے خوشی کے ان کو یقین

نہ آیا اور تعجب کرتے تھے تو اس نے ان سے کہا، کیا یہاں تمہارے پاس کچھ

کھانے کو ہے؟ انہوں نے اسے بھونی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا۔ اس نے لے کر ان

کے روبرو کھایا۔[1]

اسی سلسلہ میں قرآن مجید کی وہ عظیم سورہ بھی پڑھ لینی چاہیے جو نصاریٰ کی مشرکانہ ضلالتوں کی سب سے زیادہ جامع تردید ہے، یعنی سورۂ اخلاص:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (الاخلاص - ۱۱۲: ۱ - ۴)	کہہ دو: وہ اللہ سب سے الگ ہے؛ اللہ سب کے ساتھ ہے؛ نہ وہ کسی کا باپ اور نہ کسی کا بیٹا اور نہ کوئی اس کا کفو۔

اس سورہ کے ایک ایک لفظ کا صحیح وزن سمجھنے کے لیے مناسب ہوگا کہ اوپر نیقیہ کی کونسل کا مرتب کیا ہوا مسیحی عقیدہ، جو ہم نقل کر آئے ہیں، اس کے الفاظ پر غور کرکے ایک مرتبہ اور پڑھ لیجیے۔ اس کے تقابل سے اندازہ ہو سکے گا کہ یہ سورہ اس عقیدہ ضلالت کی ایک ایک اصل کو کس طرح ڈھا رہی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانہ میں نصاریٰ کو اس سورہ سے اس قدر چڑ رہی ہے کہ اگر وہ کسی کو اپنے مذہب میں داخل کرتے تھے تو اس سے "نعوذ باللہ" اس خدا پر لعنت کرواتے تھے جس کی صفت اس سورہ میں بیان کی گئی ہے۔

یہاں ہم احبار و رہبان اور حضرت مسیح علیہ السلام کو رب بنانے کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں، لیکن قرآن نے اہل کتاب کو بعض دوسرے اقسامِ شرک کا بھی مجرم

---

[1] انجیل لوقا - باب ۲۴: ۳۹ - ۴۳

قرار دیا ہے۔ مثلاً فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا
مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ
وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ
اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ
السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ
وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ
يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ
فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۞ اَلَمْ
تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ
بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا
يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۞ اُنْظُرْ كَيْفَ
يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ
وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۞ اَلَمْ
تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا
مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ
وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ
كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۞

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی،
اس چیز پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتاری ہے،
مصداق ان پیشین گوئیوں کے جو خود تمہارے
پاس موجود ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم چہروں کو
بگاڑ دیں اور ان کو ان کے پیچھے کی جانب الٹ
دیں یا ان پر بھی اسی طرح لعنت کردیں
جس طرح ہم نے سبت والوں پر
لعنت کردی اور خدا کی بات شدنی
ہے۔ اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ
اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔ اس کے سوا
جو کچھ ہے اس کو جس کے لیے چاہے گا
بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے
وہ ایک بہت بڑے گناہ کا افترا کرتا ہے
ذرا ان کو تو دیکھو جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ
ٹھہراتے ہیں! بلکہ اللہ ہی ہے جو پاک کرتا
ہے جس کو چاہتا ہے اور ان پر ذرا بھی ظلم
نہیں کیا جائے گا۔ دیکھو یہ اللہ پر کیسا جھوٹ
باندھ رہے ہیں اور صریح گناہ ہونے کے
لیے تو یہی کافی ہے۔ ذرا ان کو دیکھو جنہیں
کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا، یہ جبت اور طاغوت

پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر تو یہ ہیں (النساء ۴: ۵۰-۵۱)

ان آیات میں اہل کتاب کے لیے قرآن پر ایمان لانے کی دعوت کے ساتھ یہ دھمکی بھی ہے کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو مستحق ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے چہرے مسخ کر دے اور جس طرح سبت کی حرمت برباد کرنے والوں پر لعنت کی گئی اسی طرح ان پر بھی لعنت کر دی جائے۔ آنکھ، کان، دماغ، یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ نے فائدہ اٹھانے کے لیے بخشی ہیں۔ اگر کوئی قوم ان چیزوں کو رکھ کر ان سے فائدہ نہیں اٹھاتی اور خدا کی آیتیں نہ اس کو دکھائی ہی دیتی ہیں نہ سنائی ہی دیتی ہیں تو وہ مستحق ہے کہ ان نعمتوں سے محروم کر دی جائے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شرک کو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا۔ البتہ اس کے علاوہ جو گناہ ہیں، ان کو جس کے لیے چاہے گا، معاف کر دے گا۔ پھر اہل کتاب کے تین شرک گنائے ہیں :

۱. پاکی اور برتری کا دعویٰ۔

۲. ایمان بالجبت والطاغوت۔

۳. حمایت شرک۔

یہاں ہم ان تینوں کی شرح کریں گے، لیکن طوالت سے بچنے کے لیے اختصار کو پیش نظر رکھیں گے۔

۳۔ پاکی و برتری کا دعویٰ :

'اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ' (ذرا ان کو تو دیکھو جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ ٹھہراتے ہیں!) سے یہود و نصاریٰ کے اس خیال کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے :

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى	اور یہود اور نصاریٰ نے دعویٰ کیا
نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ	کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ پھر وہ تمہیں
بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ	تمہارے جرموں پر سزا کیوں دیتا رہا ہے
يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ	بلکہ تم بھی اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق
مَنْ يَّشَآءُ ؕ	میں سے بشر ہو۔ وہ جسے چاہے گا بخشے گا
(المآئدة - ۵ : ۱۸)	اور جسے چاہے گا عذاب دے گا۔

سورہ جمعہ میں ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا	ان سے کہو کہ اے وہ لوگو جو یہودی
اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ	ہوئے اگر تمہارا گمان ہے کہ دوسرے لوگوں
لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ	کے مقابل میں، تم اللہ کے محبوب ہو،
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○	تو موت کے طالب بنو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

(الجمعة - ۶۲ : ۶)

اوپر مشرکین کے بیان میں خود پرستی کے عنوان سے، ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں، اس مقام کو سمجھنے کے لیے اس پر ایک نظر ڈال لینا مفید ہوگا۔ مشرکین اور اہل کتاب کے قلوب میں مشابہت کا ذکر قرآن نے کئی جگہ کیا ہے۔ یہ بھی اسی مشابہت کی ایک قسم ہے۔ جس طرح مشرکین خانہ کعبہ کی بدولت ایک عرصہ تک مرجع خلائق بنے رہنے اور امن و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے رہنے کی وجہ سے اس خبط میں مبتلا ہو گئے تھے کہ یہ جو کچھ انہیں حاصل ہے ان کے استحقاقِ ذاتی کا ثمرہ، ان کے حسب و نسب کا لازمی نتیجہ اور ان کے علم و تدبر کا کرشمہ ہے۔ وہ اسی حال میں رہیں گے۔ یہ عزت یہ سیادت، یہ سربراہی ان کے لیے اب وجد کی چھوڑی ہوئی میراث

ہے۔ جن کی قیمت ان کے باپ دادا ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) اپنی نیکیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ادا کر چکے ہیں اور اب ان کو کچھ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ٹھیک اسی طرح اہل کتاب بھی ایک عرصہ کی متوارث عظمت دینی و دنیاوی کی مسند پر متمکن رہنے کی وجہ سے اس خبط میں مبتلا ہو گئے تھے کہ قوموں کی سربراہی اور قیادت ان کا فطری منصب ہے، جس پر وہ اس لیے سرفراز کیے گئے ہیں کہ وہ خدا کی برگزیدہ مخلوق ہیں، اس کے محبوب اور چہیتے ہیں اور اس کے محبوبوں اور برگزیدوں کی اولاد ہیں۔

تورات وغیرہ میں جو عزتیں اور بزرگیاں صفات و اخلاق کے ساتھ وابستہ کی گئی تھیں وہ تمام کی تمام انہوں نے اپنی قوم اور اپنی نسل کے ساتھ خاص کر دیں۔ اس خبط میں پڑ جانے کے بعد ان کا سارا اعتماد اس بات پر رہ گیا کہ وہ ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب (علیہم السلام) کی اولاد ہیں اور ان اکابر کی اولاد میں ہونا ہی خدا کے یہاں تقرب اور اس کی پکڑ سے نجات کے لیے کافی ہے۔ عمل و اطاعت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ یہیں سے ان کو یہ خیال بھی پیدا ہو گیا کہ جہنم کی آگ ہمیں چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ ہمیشگی کی جہنم ہمارے لیے نہیں ہے۔ یہیں سے یہ خبط بھی ان کو پیدا ہو گیا کہ دنیا کو دین و ایمان کی روشنی اب صرف ہمارے ہی واسطہ سے مل سکتی ہے، کوئی دوسری قوم اس کا وسیلہ نہیں بن سکتی۔ قوم ہماری قوم ہے۔ نبی ہمارا نبی ہے اور ہدایت صرف ہماری ہدایت ہے۔ جو ہمارے اندر ہے وہ راہ یاب ہے، جو ہم سے باہر ہے وہ گمراہ ہے۔

یہود کے اسی غرہ کی بنا پر حضرت مسیح علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ تم اولاد ابراہیم میں سے ہونے پر گھمنڈ نہ کرو، خدا ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے زمین کے ذروں سے اولاد پیدا کر سکتا ہے۔ قرآن نے ان کے یہ سارے خیالات سورۂ بقرہ وغیرہ میں نقل کیے ہیں اور ان کو امانی (جھوٹی آرزوئیں)، ظنون (بے بنیاد خیالات)، زخرف القول (ملمع

کی ہوئی باتیں" وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، اور ان میں سے ایک ایک وہم کی تردید کی ہے اور ان خیالات ہی کی بنا پر ان کو ہدایتِ الٰہی کی پیروی سے محروم قرار دیا، ان کو رسولوں کے درمیان تفریق کرنے کا مجرم ٹھہرایا، یہاں تک کہ ان کو اسلام، خدا کی بندگی اور اخلاص (یعنی توحید) سے بھی محروم قرار دیا اور ان کی دعوت کُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا (البقرة - ۲ : ۱۳۵) (یہودی یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے) کی جگہ امتِ وسط یعنی مسلمانوں کا کلمہ یہ بتایا:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ	کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز
اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ	پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی
وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ	اور ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب
وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى	اور ان کی اولاد کی طرف اتاری گئی اور
وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ	اس چیز پر ایمان لائے جو موسیٰ و عیسیٰ
مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ	اور نبیوں کو ان کے رب کی جانب
اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ	سے ملی، ہم ان میں سے کسی کے درمیان
مُسْلِمُوْنَ ۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ	تفریق نہیں کرتے اور ہم صرف اسی
مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا	کے فرمانبردار ہیں۔ اگر وہ اس طرح ایمان
وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ	لائیں جس طرح تم ایمان لائے تو وہ
شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ	راہ یاب ہوئے اور اگر وہ اعراض
وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ صِبْغَةَ	کریں تو پھر وہ درپے مخالفت ہیں۔ ان
اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ	کے مقابل میں تمہارے لیے اللہ کافی ہو
صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۔	گا، وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔
قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ وَهُوَ	کہہ دو: یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو، اور

وَرَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ۔	اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اس کی بندگی کرتے ہیں۔ کہہ دو: کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کر رہے ہو، حالانکہ وہی ہمارا بھی رب ہے، وہی تمہارا بھی رب ہے۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے۔ اور ہم خالص اسی کے لیے ہیں۔
(البقرة - ۲: ۱۳۶ - ۱۳۹)	

ان آیات میں "نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ" (ہم اسی کے فرمانبردار ہیں)، "نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ" (ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں)، "نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ" (ہم خالص اسی کے لیے ہیں) کے الفاظ خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہیں۔ ان تینوں میں اہلِ کتاب پر تعریض ہے کہ نہ تم مسلم ہو، نہ خدا کی بندگی کرنے والے ہو، نہ موحد ہو۔ جو خدا کا فرمانبردار، خدا کا بندہ و غلام اور صرف اللہ واحد ہی کا ماننے والا ہوگا وہ اپنے تئیں خدا کے رنگ میں رنگے گا۔ یہودیت یا نصرانیت کے رنگ سے کیوں ملوث ہوگا؛ وہ اللہ کی ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ جس شکل اور جس زبان میں بھی آئے؛ اور سب نبیوں پر ایمان لائے گا، خواہ وہ کسی قوم میں مبعوث ہوئے ہوں۔ وہ یہ نہیں کرے گا کہ کسی کو مانے اور کسی کا انکار کر دے۔ یہ ساری باتیں اخلاص اور توحید کے منافی ہیں۔ یہ تم خدا کی بندگی نہیں کر رہے ہو، بلکہ اپنی اپنی قوم کی اور اپنے اپنے نبی کی پرستش کر رہے ہو۔

یہ آیت ان مسلمانوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے جو الگ الگ اماموں کی عصبیت میں گرفتار ہیں اور اپنے ہی گروہ کے امام یا اماموں کے اندر حق و ہدایت کو محصور مانتے ہیں۔ انہیں سوچنا چاہیے کہ اگر کسی ایک نبی یا انبیاء کی کسی ایک ہی جماعت پر جم جانا اور دوسروں کا انکار کر دینا جائز نہیں ہے اور یہ اخلاص و توحید کے

منافی ہے تو کسی ایک امام یا علماء کی کسی ایک ہی جماعت کے اندر حق کو محدود کر دینا شخصیت پرستی، اتباع ہدی اللہ و سنت رسول اور توحید کی روح سے کس طرح ہم آہنگ ہو سکتا ہے

۴۔ ایمان بالجبت والطاغوت :

جبت سے مراد سحر، شعبدے، گنڈے، ٹونے ٹوٹکے اور رمل جفر وغیرہ ہیں۔

بائبل ہسٹری اور یہود کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے کلدانیوں کے تمام علوم سفلیہ سیکھ لیے تھے۔ یہ چیزیں تاریخ کے ہر عہد میں اہل مذاہب کے لیے فتنہ بنی رہی ہیں۔ مذہب کی سیدھی سادی، بلکہ کڑوی کسیلی، تعلیمات جب بے مزہ معلوم ہونے لگتی ہیں اور نفس چٹخاروں کی تلاش میں ہوتا ہے تو یہ چیزیں رواج پا جاتی ہیں۔ یہ چیزیں مذہب کی اصلی روح کی موت کی نشانی ہیں۔ جس دن یہ فتنے کسی قوم میں شروع ہوتے وہی دن مذہب کی پاک تعلیم کے زوال کا روز اول ہوتا ہے۔ جو لوگ ان چیزوں میں منہمک ہوتے ہیں کتاب الٰہی سے ان کا تعلق ٹوٹ جانا لازمی ہے۔ ان دونوں کے سرچشمے دو ہیں۔ ایک کا مصدر و منبع شیطان ہے۔ اور دوسرے کا سرچشمہ رحمان ہے جو لوگ شیطان سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں ان کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ خدا سے کٹ جائیں اور نبیوں کی تعلیم اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیں۔ چنانچہ یہود کا یہی حال ہوا۔ سورۂ بقرہ میں ان کی اسی جبت پرستی کا ذکر ہے :

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ	اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف
عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ	سے ایک رسول ان پیشین گوئیوں کا
نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا	مصداق بن کر آیا جو ان کے پاس موجود
الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ	ہیں تو ان لوگوں نے جن کو کتاب دی

ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۫
وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ
عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا
كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ
كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ
السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى
الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ
وَمَارُوْتَ ؕ
(البقرۃ - ۲ : ۱۰۱ - ۱۰۳)

گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اس طرح
پیٹھ پیچھے پھینکا گویا اس سے آشنا
ہی نہیں اور ان چیزوں کے پیچھے پڑ
گئے جو سلیمان کے عہدِ حکومت میں شیاطین
پڑھتے پڑھاتے تھے، حالانکہ سلیمان نے
کوئی کفر نہیں کیا، بلکہ شیطانوں ہی نے
کفر کیا۔ یہی لوگوں کو جادو سکھاتے تھے
اور اس چیز میں پڑ گئے جو بابل میں دونوں
فرشتوں — ہاروت و ماروت — پر اتاری گئی تھی

'طاغوت' بروزنِ ملکوت و جبروت 'طغیٰ' کے مادے سے ہے، جس کے معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ جو چیز حدِ مناسب سے آگے بڑھ جائے اس کے لیے عربی میں کہیں گے: طغیٰ۔ طغی الماء، پانی حد سے آگے بڑھ گیا۔ قوم ثمود جس آفت سے ہلاک ہوئی اس کے لیے قرآن میں 'طاغیۃ' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی آفت کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ حدودِ عبدیت و بندگی سے نکل جانے کے لیے استعمال ہوا اور جو چیز حدودِ بندگی سے نکل جائے، اس کو طاغوت کہنے لگے۔ پھر وہ چیزیں بھی اس کے تحت آگئیں جو حدودِ بندگی سے نکل جانے کا باعث یا ذریعہ ہوں۔ اہلِ لغت اسی وجہ سے اس کی تشریح یوں کرتے ہیں: الطاغوت عبارۃ عن کل متعدٍ وکل معبود من دون اللہ۔ (طاغوت سے مراد ہر وہ شے ہے جو حد سے نکل جائے اور ہر وہ معبود جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے)۔

قرآن نے اس لفظ کو مختلف مقامات میں استعمال کیا ہے اور ہر جگہ اس کے مقابل

کا ذکر کر کے اس کے مختلف معنوں پر روشنی ڈال دی ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں ہے:
"فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ" (البقرۃ - ۲ : ۲۵۶) (تو جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا) یہاں اللہ کے تقابل سے واضح ہے کہ طاغوت سے مراد ماسوا اللہ ہے۔ سورۃ نحل میں ہے: "اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ" (النحل - ۱۶ : ۳۶) (کہ اللہ ہی کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو)۔ سورۃ نساء میں ہے:
"اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ" (النساء - ۴ : ۷۶) (جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے کفر کیا وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں)۔ اس کے بعد فرمایا: فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ (النساء - ۴ : ۷۶) (تو تم شیطان کے حامیوں سے لڑو) جس سے متعین ہو گیا کہ طاغوت سے مراد شیطان ہے اور شیطان سے مراد شیاطین الانس والجن دونوں ہیں۔ اور قرآن میں غیر الٰہی دعوت و اطاعت کے لیے یہ ایک جامع تعبیر ہے۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ اس لفظ کو کتاب الٰہی اور طریقۂ رسول کے ضد کے لیے استعمال کیا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ	ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو کرتے
اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ	ہیں کہ وہ اس چیز پر بھی ایمان رکھتے
اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ	ہیں جو تم پر اتاری گئی ہے اور اس پر بھی
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى	جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے لیکن چاہتے ہیں کہ
الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ	اپنے معاملات فیصلہ کے لیے طاغوت کے
يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ	پاس لے جائیں حالانکہ انہیں اس کے انکار
اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝	کا حکم دیا گیا ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ انہیں
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى	نہایت دور کی گمراہی میں ڈال دے اور جب
مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ	ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی

ہو شرک ہے۔

رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۚ	کتاب اور رسول کی طرف آؤ تو تم منافقین کو دیکھتے ہو کہ تم سے کترا جاتے ہیں۔

(النسآء - ۴ : ۶۰ - ۶۱)

ان آیات میں "یَتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ" کے بالمقابل "تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ" کہہ کر واضح کر دیا کہ طاغوت کتابِ الٰہی اور سنتِ رسول کی ضد کے لیے ایک جامع تعبیر ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی بندگی و اطاعت سے نکل جانے یا نکل جانے کا باعث یا ذریعہ ہو، وہ سب طاغوت کے حکم میں داخل ہے۔ پس شیطان، ساحر، کاہن، اصنام و اوثان، فرعون و نمرود، اللہ کی ہدایت سے ہٹانے والے لیڈر، غیر الٰہی حکومتیں، غیر الٰہی عدالتیں، غیر الٰہی درگاہیں، غیر الٰہی خانقاہیں سب اس کے تحت آتی ہیں اور اہلِ کتاب شرک کی اس قسم میں مبتلا تھے:

مَنْ لَّعَنَہُ اللّٰہُ وَغَضِبَ عَلَیْہِ وَجَعَلَ مِنْھُمُ الْقِرَدَۃَ وَ الْخَنَازِیْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ ۔	یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی جن پر اس کا غضب ہوا اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور سور بنائے اور جنہوں نے طاغوت کی پرستش کی یہ ٹھکانے کے لحاظ سے بدتر اور اصل شاہراہ سے بعید تر ہیں۔

(المآئدۃ - ۵ : ۶۰)

۵۔ حمایت شرک:

اہلِ کتاب کا تیسرا شرک حمایتِ شرک ہے۔ شرک کی حمایت خواہ کسی نوعیت سے

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو اپنی کتاب عنایت فرمائی تھی۔ ان سے اپنی شریعت کی پابندی کا عہد لیا تھا۔ ان کے اوپر آئندہ مبعوث ہونے والے نبی کی حمایت و تائید اور لوگوں سے اس کا تعارف کرانے کی ذمہ داری ڈالی تھی۔ یہود سے کہا گیا تھا کہ "میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا"[1] حضرت مسیح علیہ السلام اپنے حواریوں سے صاف صاف فرما گئے تھے کہ "مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی روحِ حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا"[2]۔ یہود کو اس نبی کی بعثت کا انتظار بھی تھا اور وہ اپنے یہاں کی پیشین گوئیوں کے مطابق یقین بھی رکھتے تھے کہ یہ نبی ان کی سعادت کا فتح باب ہوگا اور ان کو کفار پر فتح دلائے گا: وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا (البقرۃ - ۲ : ۸۹)۔ (اور وہ پہلے سے کافروں کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے) اور نصاریٰ تو گویا یکسر چشم انتظار ہی تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے انجیل میں جو تمثیلیں بیان فرمائی ہیں اگر ان کی تشریح کر دی جائے تو معلوم ہوگا کہ امثالِ انجیل کا بڑا حصہ آخری بعثت کی سرگزشت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

ان حالات کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ اہل کتاب کا اصلی فریضہ یہ تھا کہ جب آخری بعثت ظہور میں آئی تو اپنے سابق علم کی روشنی میں اس کو جانچتے پرکھتے، اگر اس کو اپنی پیشین گوئیوں کے مطابق پاتے اس پر ایمان لاتے، لوگوں میں اس کو پہچانتے اس کی حمایت و تائید کرتے اور پھر اس کے لائے ہوئے دین کی اقامت کی راہ میں اپنا

---

[1] بائبل: استثناء - باب - ۱۸ : ۱۸ - ۱۹

[2] انجیل یوحنا - باب ۱۶ : ۱۲ - ۱۳

سب کچھ قربان کر دیتے۔ لیکن ان لوگوں کا حال وہی ہوا جو حضرت مسیح علیہ السلام نے کنواریوں والی تمثیل میں بیان فرمایا ہے کہ رات بھر تو وہ اپنی مشعلیں جلائے ہوئے دولہا کا انتظار کرتی رہیں، لیکن جب دولہا کے آنے کا وقت ہوا تو ان کی مشعلیں بجھ گئیں، ان کی بتیوں کا تیل ختم ہو گیا اور وہ خود سو گئیں۔ صدیوں تک تو یہ لوگ منتظر رہے لیکن جب اس کا ظہور ہوا اور ان لوگوں نے اس کو پہچان بھی لیا تو ایمان کے بجائے اس کے انکار میں سبقت کی اور اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ حسد و عناد کے جوش میں کھلم کھلا ان مشرکین کی حمایت و نصرت میں کھڑے ہو گئے جو اس دعوت کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ علی الاعلان اس کی تعلیمات کا مذاق اڑایا، اس کے کام کو روکنے کے لیے جنگیں برپا کیں، اور اس عداوت کے جوش میں اس حد تک اتر آئے کہ مشرکین کے دین کو اس کی دعوت پر ترجیح دیتے اور کفار کو اس کے پیرووں سے زیادہ برحق اور ہدایت یافتہ بتانے لگے: ﴿وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا﴾ (النسآء - ۴: ۵۱) (اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر تو یہ ہیں) اس شرک دوستی کے ساتھ توحید کے ساتھ کسی لگاؤ کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی: ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا﴾ (النسآء - ۴: ۵۲) (یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی ہے اور جن پر اللہ لعنت کر دے تو تم ان کا کوئی مددگار نہیں پا سکتے)۔

باب ۴

منافقین کا شرک

جہاں تک ظاہری اعتقاد و عمل کا تعلق ہے منافقین پورے مسلمان تھے۔ ایمان کے جتنے اجزاء ہیں ان سب کا ان کو اقرار تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے تمام انبیاء کی رسالت بھی ان کو تسلیم تھی۔ کلمۂ شہادت بھی وہ پڑھتے تھے۔ مسجدوں میں اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ پر نمازیں بھی ادا کر لیتے تھے۔ زکوٰۃ بھی دے دیتے تھے۔ خانۂ کعبہ کا حج بھی کر آتے تھے۔ غزوات میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔ بلکہ قرآن سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک زبانی اظہار کا تعلق ہے، جہاد کا ولولہ مقابلہ سچے مسلمانوں کے زیادہ ظاہر کرتے تھے، اور ایمان بالرسالت کی ظاہرداریوں کا تو یہ عالم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور قسمیں کھا کھا کے یقین دلاتے کہ ہم آپ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں، لیکن ان ساری باتوں میں سے ان کی ایک بات بھی قرآن نے تسلیم نہیں کی بلکہ ان کو ایمان سے محروم، رسالت کا منکر، شیطان کا ساتھی، جہنم کے سب سے نچلے طبقہ کا مستحق اور صاف صاف لفظوں میں شرک کا مجرم قرار دیا۔

تمام آیتوں کا استقصاء یہاں مشکل ہوگا، لیکن ان کے شرک سے متعلق چند آیتیں ہم نقل کر کے ان پر بالاجمال گفتگو کریں گے۔ قرآن مجید نے منافقین کو تحاکم الی الطاغوت کا مجرم قرار دیا ہے اور اس تحاکم الی الطاغوت کو شرک بتایا ہے۔

تحاکم الی الطاغوت :

سورۂ نساء میں فرمایا ہے :

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ
أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ
وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ
أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ
وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ
وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا
بَعِيدًا ۝ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا
إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ
رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ
عَنكَ صُدُودًا ۝
(النساء - ۴: ۶۰-۶۱)

ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جو دعویٰ تو کرتے
ہیں کہ وہ اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں
جو تم پر اتاری گئی ہے، اور اس پر بھی جو
تم سے پہلے اتاری گئی ہے لیکن چاہتے ہیں
کہ ان کے اپنے معاملات فیصلے کے لیے
طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ
انہیں اس کے انکار کا حکم دیا گیا ہے شیطان
چاہتا ہے کہ انہیں نہایت دور کی گمراہی
میں ڈال دے اور جب ان سے کہا جاتا
ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور رسول
کی طرف آؤ تو تم منافقین کو دیکھتے ہو کہ
تم سے کترا جاتے ہیں۔

اس سے اوپر والی آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ، رسول اور اپنی جماعت کے اولوالامر کی اطاعت کرو اور اگر کسی امر میں اختلاف واقع ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ اس کے بعد منافقین کا حال بیان فرمایا ہے کہ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے مدعی ہونے کے باوجود چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں، اللہ اور اس کے رسول کی عدالت میں نہ لائیں۔

اوپر ہم لفظ 'طاغوت' کے مفہوم پر بحث کر چکے ہیں۔ اس آیت میں طاغوت کے مقابل 'تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ' (اللہ کی اتاری ہوئی کتاب

اور رسول کی طرف آؤ) کے الفاظ آئے ہیں، جس سے یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ طاغوت سے مراد وہ حکام ہیں جن کے فیصلے کتاب الٰہی اور رسول کے فیصلے کے خلاف ہوتے ہیں اور آیات کے سیاق وسباق سے واضح ہے کہ یہاں اس سے مراد اہل کتاب کے حکام اور ان کی عدالتیں ہیں۔ یہ اس عہد کا حال بیان ہوا ہے جب مدینہ میں بالفعل دارالاسلام قائم ہو چکا تھا اور مسلمانوں کے تمام معاملات از قسم حدود و تعزیرات خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہو کر طے پانے اور نافذ ہونے لگے تھے، لیکن ساتھ ہی ایک متوازی حکومت (PARALLEL STATE) یہود کی، پہلے سے قائم اور ہنوز موجود تھی۔ اس نظام کی موجودگی کی وجہ سے ایک بڑی پیچیدگی یہ پیدا ہو رہی تھی کہ منافقین اپنے بہت سے نزاعی امور میں ان یہودی عدالتوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کے ایسا کرنے کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ یہود کے حکام کو رشوتیں دے کر ان سے اپنے موافق فیصلے کرا لینا نہایت آسان تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں اس چیز کا کوئی امکان نہیں تھا۔ دوسری یہ کہ منافقین کو یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ ابھی مدینہ کی اسلامی حکومت بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ ہر چند قریش کی طاقت اس نے توڑ دی ہے، لیکن یہود کی منظم جماعت سے اس کی ٹکر ابھی براہ راست نہیں ہوئی ہے۔ ممکن ہے کل کو یہ تصادم واقع ہو اور جیت یہود ہی کی رہے تو تھوڑا بہت لگاؤ، جو ان کے ساتھ قائم رہے گا، وہ کل کام آئے گا، ورنہ یہ یہودی مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ ہمارا بھی خاتمہ کر دیں گے۔ اس ظن فاسد کی وجہ سے یہ لوگ اپنے معاملات زیادہ تر انہی کی عدالتوں میں لے جاتے، البتہ اگر کوئی معاملہ ایسا ہوتا جس میں وہ سمجھتے کہ اسلامی عدالت سے فیصلہ کرانا مفید رہے گا تو نہایت فرمانبردارانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

دوسری طرف یہود یہ شرارت کرتے تھے کہ تعزیرات وحدود کے اہم معاملات

میں جس میں کسی ذاتی یا سیاسی مصلحت کی وجہ سے اپنی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کرنا چاہتے فریقینِ معاملہ کو یہ مشورہ دیتے کہ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں لے جائیں اور ساتھ ہی ان کو یہ ہدایت بھی کر دیتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ فیصلہ کریں تو مان لینا اور اگر کچھ اور فیصلہ کریں تو ہمارے پاس لوٹ آنا۔ اس طرح کے معاملات عموماً دولت مند یہودیوں کے ہوتے تھے، جن سے بھاری بھاری رشوتیں لے کر علماء یہود شریعتِ الٰہی کی تنفیذ سے بچنے کی یہ شکل اختیار کرتے تھے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں فیصلہ حسبِ منشا ہوتا تو مقصد حاصل اور ذمہ داری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوتی، اور اگر فیصلہ خواہش کے خلاف ہوتا تو اس کو چھوڑ کر خود اپنی عدالت میں اپنے منشا کے مطابق فیصلہ کرتے۔

مذکورہ بالا آیات اور اس کی مشابہ آیات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے اس شانِ نزول کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

ان منافقین کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ تحاکم الی الطاغوت یعنی غیر اسلامی عدالتوں میں اپنا معاملہ لے جانا اور پھر قرآن اور اللہ پر ایمان کا دعویٰ کرنا دو متناقض چیزیں ہیں۔ ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت ضروری ہے اور اِلّا اللہ کے اثبات سے پہلے لا الٰہ کی نفی ناگزیر ہے ـــ "فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ" (البقرۃ - ۲ : ۲۵۶) (تو جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا)۔ دوسری جگہ ہے "اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ" (النحل - ۱۶ : ۳۶) (اللہ ہی کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو)۔ ایمان باللہ اور ایمان بالطاغوت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہود کی عدالتوں میں اگر اپنے معاملات لے جاتے ہو تو تمہارا ایمان بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کا دعویٰ ایک زعمِ باطل ہے۔ ایمان بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ تمام معاملات میں اللہ ہی کی اطاعت کی جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ

انبیاء کے راستہ کی پیروی کی جائے اگر ایسا نہیں ہے تو نہ یہ ایمان باللہ ہوا نہ ایمان بما انزل اللہ ہوا نہ ایمان بالرسول ہوا۔ رسول صرف اس لیے نہیں ہوتا کہ اعتقاد کی حد تک یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ رسول ہے بلکہ وہ اطاعت کے لیے ہوتا ہے اور خدا کی اطاعت کی راہ اس کی اطاعت کے اندر ہی سے ہو کر نکلی ہے چنانچہ بعد کی آیات میں فرمایا:

فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ
بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ
ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ
بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا
وَّتَوْفِيْقًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۖ
فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ
وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ
قَوْلًا بَلِيْغًا ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا
مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ
اللّٰهِ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا
اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا
اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ
لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝
فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ

اس وقت کیا ہوگا، جب ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو کوئی مصیبت پہنچے گی، پھر یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ خدا کی قسم، ہم نے تو صرف بہتری اور سازگاری چاہی۔ ان لوگوں کے دلوں کے اندر جو کچھ ہے اللہ اس سے خوب واقف ہے، تو ان سے اعراض کرو، ان کو سمجھاؤ اور ان سے خود ان کے باب میں دل میں دھنسنے والی بات کہو۔ اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اور اگر وہ جب کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا، تمہاری خدمت میں حاضر ہوتے اور خدا سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی چاہتا تو وہ خدا کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور

بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝
(النسآء - ۴ : ۶۲ - ۶۵)

مہربان پاتے۔ پس نہیں تیرے رب کی قسم، یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک اپنی نزاعات میں تجھ کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کر دیں۔

مذکورہ بالا آیات میں " وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ " (اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے) خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہے۔ یہ منافقین کے اس زعمِ باطل کی تردید ہے کہ وہ تحاکم الی الطاغوت کے باوجود اپنے تئیں مومن باللہ و مومن بالرسول سمجھتے ہیں۔ رسول صرف اس لیے نہیں آیا کرتا کہ زبان سے اس کی رسالت کا اقرار کر لیا جائے، یا دل میں یہ عقیدہ رکھ لیا جائے کہ وہ اللہ کا رسول ہے، بلکہ اس لیے آتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ جملہ امور میں اس کو حکم مانا جائے۔ اس کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے۔ اپنے تئیں بالکلیہ اس کے حوالہ کر دیا جائے اور جو لوگ اس کے بتائے ہوئے راستہ سے الگ ہیں، ان سے بغاوت کی جائے۔ چنانچہ اس آیت میں قسم کھا کر فرمایا کہ جب تک یہ لوگ اپنے تمام معاملات میں رسول کی حکومت تسلیم نہ کر لیں، اس کے فیصلوں کو دل کی پوری رضامندی کے ساتھ نہ مانیں اور اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں اس کے امر و نہی کے تابع نہ ہو جائیں، اس وقت تک یہ مومن باللہ نہیں ہیں، مومن بالطاغوت ہیں۔

اوپر ہم نے جو باتیں بیان کی ہے ممکن ہے اس کے بارہ میں کسی کو شبہ ہو کہ آیات کا شانِ نزول ــــ پس منظر ــــ متعین کرنے میں ہم نے محض اپنے تخیل سے کام لیا ہے۔ ان کے اطمینان کے لیے ہم ان کو سورۂ مائدہ کی آیات ۴۱ - ۵۲ کا حوالہ دیتے

ہیں۔ جو لوگ ان آیتوں پر تدبر کریں گے، وہ ان ساری باتوں کا ماخذ خود قرآن میں پا جائیں گے، جو ہم نے بیان کی ہیں۔ ان آیات کا مطلب اختصار کے ساتھ ہم اپنے لفظوں میں یہاں بیان بھی کیے دیتے ہیں تاکہ مراجعت میں آسانی ہو:

پہلے رسول کو تسلی دی ہے کہ منافقین اور یہود آپ سے معاملات کا فیصلہ کرانے کے بعد جو اس سے اعراض کرتے ہیں تو اس سے غمگین نہیں ہونا چاہیے۔ یہ یہودی اپنے معاملات کبھی کبھی آپ کے پاس جو لاتے ہیں تو یہ جھگڑا چکانے اور مقدمے کا فیصلہ کرانے کے لیے نہیں لاتے، بلکہ یہ جھوٹ کے خریدار اور سرداران یہود کے ایجنٹ ہیں۔ وہ سامنے نہیں آتے، بلکہ پیچھے بیٹھے ہوئے ان کٹھ پتلیوں کو نچاتے ہیں، اور اللہ کے دین میں تحریف کرتے ہیں اور آپ کے پاس ان کو یہ سکھا کر بھیجتے ہیں کہ اگر تمھارے معاملہ کا یہ فیصلہ ہو تو مان لینا، اور اگر اس کے خلاف فیصلہ ہو تو واپس چلے آنا۔ ایسے لوگوں کی حالت پر غم کرنا عبث ہے۔ اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں ہے کہ ان کے دلوں کو پاک کرے، ورنہ تورات کی ہدایت کے مطابق یہ لوگ آپ پر ایمان لاتے اور کفر کے بجائے ایمان و اطاعتِ الٰہی کی طرف سبقت کرتے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔ یہ جھوٹ کے ماننے والے اور رشوت کھانے والے ہیں۔ اگر آپ کے پاس یہ اپنا معاملہ لائیں تو آپ کو اختیار ہے کہ ان کے معاملہ میں پڑیے یا نہ پڑیے۔ ہاں اگر پڑیے تو لازم ہے کہ اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلہ کیجیے۔

اس کے بعد چند آیتوں میں یہود کو ملامت کی ہے کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں کہ آپ کو حکم بناتے ہیں، پھر آپ کے فیصلہ سے مکر جاتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس تورات موجود ہے، جس میں اللہ کا قانون موجود ہے، اور انھیں معلوم ہے کہ آپ کا فیصلہ قانونِ الٰہی کے خلاف نہیں ہے۔ پھر گزشتہ انبیاء اور علماء صالحین کا طریقہ

بتایا کہ وہ اس کتاب کے مطابق تمام معاملات کے فیصلے کرتے تھے۔ پھر فرمایا کہ ان کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ دین کے معاملہ میں کسی قسم کی مداہنت اور خیانت کو راہ نہ دیں گے اور شریعت کو کسبِ دنیا کا ذریعہ نہ بنائیں گے، بلکہ ہر حال میں کتابِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں گے، اور اگر اس کی خلاف ورزی کریں گے تو کافر ہوں گے۔ اس کے بعد تورات کے قانونِ قصاص کا حوالہ دیا ہے۔ کیونکہ یہود کی اصل مداہنت حدودؔ اور قصاص وغیرہ کے معاملات ہی میں تھی۔ اس کے بعد اہلِ انجیل کا ذکر فرمایا کہ ان کو بھی ہدایت کی گئی تھی کہ شریعتِ الٰہی کے مطابق فیصلے کریں گے۔ اور اگر اس کے خلاف کریں گے تو فاسق ٹھہریں گے۔

پھر قرآن کا ذکر فرمایا کہ یہ کتاب تورات و انجیل کی پیشین گوئیوں کے مطابق اور ان کی تحریفات اور ملاوٹوں کی اصلاح کرنے والی ہے۔ پس آپ کا فرض ہے کہ اگر ان کے کسی معاملہ کا فیصلہ کرنا ہو تو اس کے مطابق کیجیے اور ان کی بدعات کی جو انھوں نے اپنی کتابوں میں ملا رکھی ہیں، ہرگز پیروی نہ کیجیے۔ ان کے ایمان و ہدایت کا سوال آپ سے نہ ہوگا۔ ان کا اپنا جو طریقہ ہے اسی پر جامد ہو گئے ہیں اور ان کی عصبیت میں ایسے اندھے ہو گئے ہیں کہ آپ کی پیروی نہیں کریں گے۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت کے راستہ پر کر دیتا، لیکن جبر کرنا اس کی سنت کے خلاف ہے۔ اس نے اختیار بخشا ہے اور جس کو جو کچھ دیا ہے اس میں اس کی آزمائش کی ہے کہ دیکھے کون نیکی اور اطاعت کی راہوں میں بڑھتا ہے اور کون عصبیتِ جاہلیت کی حماقت میں مبتلا ہو کر اپنے طریقے اور وضع ہی کو معبود بنا لیتا ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کی طرف توجہ فرمائی اور خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روئے سخن ان منافقین ہی کی طرف ہے جو یہود سے سازباز رکھتے تھے اور اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے تھے۔ ان کو یہود و نصاریٰ سے قطعِ تعلق کا حکم دیا اور

فرمایا کہ جو لوگ ان کو اپنا مددگار بنائیں گے ان کا شمار انہی میں ہوگا۔ پھر صاف صاف لفظوں میں منافقین کا ذکر فرمایا کہ ان کو اندیشہ ہے کہ اگر یہود اور مسلمانوں میں ٹکر ہوئی اور یہود فتح مند رہے تو یہ پس جائیں گے۔ اس لیے یہ اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہیں تاکہ ان کی پارٹی میں سمجھے جائیں۔ پھر فرمایا کہ اے مسلمانو! جو تم میں سے اپنے دین سے مرتد ہو جائیں گے تو اللہ کو ان کی کچھ پروا نہیں۔ اللہ اس کے بعد ایسے لوگوں کو لائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔ وہ مومنوں کے لیے نرم خو اور بردبار ہوں گے اور کافروں کے لیے سخت ہوں گے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے۔

یہ ساری تفصیل ہم نے محض یہود کی اس وقت کی سیاست اور ان کے ساتھ منافقین کے تعلقات کی نوعیت سمجھانے کے لیے بیان کی ہے تاکہ تحاکم الی الطاغوت کا صحیح تصور ذہنوں کے سامنے آسکے اور یہ واضح ہو سکے کہ منافقین اس سے کیا فوائد پیش نظر رکھتے تھے اور پھر یہ معلوم ہو سکے کہ کس طرح یہ ایک ہی چیز دین کے تمام اقرارات و اعترافات کو ڈھا دینے والی اور تمام عبادتوں اور طاعتوں کو سوخت کر دینے والی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن نے نہایت صاف لفظوں میں اس کو دین سے ارتداد قرار دیا ہے اور اعلان فرمایا ہے کہ خدا کو ایسے لچے لچے ایسے مریض القلوب اور ایسے بزدل اور نفع پرست لوگوں کی ضرورت نہیں ہے، جو یہود کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی طرح ناچیں۔ اس کو صرف ایسے لوگوں سے محبت ہے جو اپنی سیرت میں چٹان کی طرح ٹھوس اور اپنے عزم و ارادہ میں لوہے کی طرح مضبوط ہوں، جو اسلام میں مصلحت پرستی اور نفع پرستی کے بت توڑ کر داخل ہوتے ہوں اور بغیر کسی تقسیم کے اپنی پوری زندگی اللہ کے حوالہ کریں: اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرۃ - ۲: ۲۰۸) (اللہ کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ)۔ جو لوگ صرف فائدہ کی حد تک خدا کے پرستار رہنا چاہتے

ہیں وہ اپنے لیے جو دین چاہیں پسند کریں۔ اللہ اور اس کے دین کو ان کی ضرورت نہیں ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ (الحج۔ ۲۲ : ۱۱) (اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی بندگی ایک کنارے پر کھڑے ہوئے کرتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچا تب تو ان کا دل خدا پر جمتا ہے اور اگر کوئی آزمائش پیش آگئی تو اوندھے ہو جاتے ہیں)۔

توضیح مطلب اور شرح صدر کے لیے سورۂ نور کی یہ آیتیں بھی سامنے رکھیے:

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ	اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول
وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ	پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کی
مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ	پھر ان میں سے ایک گروہ پھر جاتا ہے
اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَ	اور یہ لوگ درحقیقت مومن نہیں ہیں
اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	اور جب یہ اللہ اور رسول کی طرف
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ	بلائے جاتے ہیں کہ رسول ان کے درمیان
مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِنْ يَّكُنْ	فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک گروہ پہلو تہی
لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ	کرتا ہے اور اگر حق ان کو ملنے والا ہو
مُذْعِنِيْنَ ۝ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ	تو اس کی طرف نہایت فرمانبردارانہ آتے
مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ	ہیں۔ کیا ان کے دلوں میں بیماری ہے،
اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ	یا یہ ابھی شک میں پڑے ہوئے ہیں،
رَسُوْلُهٗ ۭ بَلْ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ	یا ان کو اندیشہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول
الظّٰلِمُوْنَ ۝ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ	ان کے ساتھ ناانصافی کریں گے، بلکہ
الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ	یہ لوگ خود ظالم ہیں۔ اہل ایمان کی بات

وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ	تو یہ ہوتی ہے کہ جب وہ اپنی کسی باہمی
يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَ	نزاع کے فیصلہ کے لیے اللہ اور اس
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝	کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تو کہتے
وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ	ہیں کہ ہم نے سنا اور مانا اور درحقیقت یہی
يَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ	لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔ اور
هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ وَاَقْسَمُوْا	جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں
بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ	گے اور جو اس سے ڈریں گے اور اس
اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ؕ قُلْ لَّا	کے حدود کی پاسداری کریں گے، وہی لوگ
تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ	ہیں جو فائز المرام ہوں گے اور انھوں نے
اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝	پکی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر تم ان کو جہاد
قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا	کا حکم دو گے تو وہ ضرور نکلیں گے۔ کہہ
الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا	دو کہ قسمیں نہ کھاؤ۔ بس دستور کے مطابق
عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ	اطاعت اصل چیز ہے، جو کچھ تم کر رہے
مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ	ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ ان سے
تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ	کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول
اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ وَعَدَ	کی اطاعت کرو۔ پس اگر تم اعراض کرو
اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ	گے تو یاد رکھو کہ رسول پر صرف وہ ذمہ داری
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	ہے، جو اس پر ڈالی گئی ہے اور تم پر وہ
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ	ذمہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے اور
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ	اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو راہ یاب
لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ	ہو گے اور رسول پر صرف واضح طور پر پہنچا

الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ
وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ
خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي
لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۚ وَ
مَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ○

(النور - ۲۴ : ۴۷ - ۵۵)

دینے کی ذمہ داری ہے۔ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک میں اقتدار بخشے گا، جیسا کہ ان لوگوں کو اقتدار بخشا جو ان سے پہلے گزرے، اور ان کے اس دین کو تمکن کرے گا جس کو ان کے لیے پسندیدہ ٹھہرایا اور ان کی اس خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا، وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو درحقیقت وہی لوگ نافرمان ہیں۔

جن لوگوں نے ایمان کا مطلب صرف چند چیزوں پر اعتقادی ایمان سمجھ رکھا ہے ان کو ان آیات پر غور کرنا چاہیے۔ منافقین ان سب چیزوں پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے، لیکن قرآن نے ان کے اس اعتراف و اعتقاد کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ صاف صاف فرمایا کہ یہ لوگ مومن نہیں ہیں۔ یہ ایمان و اسلام کیسا کہ اپنے جملہ معاملات میں اللہ اور رسول کی حکومت نہیں تسلیم کرتے۔ جب اپنا فائدہ ہوتا ہے تب تو رسول کے پاس دوڑے ہوئے آتے ہیں، لیکن جب اندیشہ ہوتا ہے کہ رسول کے فیصلہ میں ان کا دنیوی خسارہ ہے تو یہود کی عدالت میں اپنا معاملہ لے جاتے ہیں کہ ان کی رشوت خوری اور بدامنت سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے۔ یہ اسلام کے غلبہ کی طرف سے مشتبہ ہیں۔ انہیں اللہ اور رسول کے عدل پر بھروسہ نہیں ہے۔ پھر واضح الفاظ میں فرمایا کہ مومن صرف وہ لوگ ہیں جو اپنے تمام معاملات اللہ و رسول کی

عدالت میں پیش کریں اور یہاں سے جو فیصلہ ہو اس کو بے چون وچرا تسلیم کریں۔ آخری آیت کے الفاظ خصوصیت کے ساتھ غور کے قابل ہیں۔ سچے مسلمانوں کو بشارت دی ہے کہ منافقین اسلام کے غلبہ کی طرف سے شبہ میں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے علی الرغم اہل ایمان کو غلبہ دے گا، دین حق کا بول بالا کرے گا اور یہود اور مشرکین کی وجہ سے جو خوف واندیشہ کی حالت ابھی قائم ہے اس کو جلد امن واطمینان سے بدل دے گا اور ہمارے یہ خالص بندے صرف ہماری ہی بندگی کریں گے کسی کو ہمارا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔

یہ منافقین پر تعریض ہے کہ یہ لوگ غیر اللہ کی بندگی کرتے اور اللہ کا ساجھی ٹھہراتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ تعریض محض اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے معاملات یہود کی عدالتوں میں لے جاتے ہیں۔ جو لوگ عبادت کے مفہوم میں اطاعت کو داخل نہیں سمجھتے اور خیال کرتے ہیں کہ اگر نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور روزے رکھے جاتے ہیں تو اطاعت خواہ کسی طاغوت کی ہو رہی ہو اس سے خدا کی عبادت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا انہیں اس آیت پر غور کرنا چاہیے۔ اگر غیر اللہ کی اطاعت سے اللہ کی عبادت میں کوئی فرق نہیں آتا تو آخر ان منافقین کا کیا جرم تھا کہ ان کو مشرک اور غیر اللہ کی بندگی کرنے والا قرار دیا گیا۔

یہ مسئلہ چونکہ نہایت اہم ہے اور قرآن سے غفلت کی وجہ سے لوگ اس بارہ میں ایسی غلط فہمیوں میں پڑ گئے ہیں جو سرے سے دین کی بنیاد ہی ڈھائے دے رہی ہیں، اس لیے مزید توضیح کی خاطر چند آیتیں ہم اور پیش کرتے ہیں۔ سورۂ نساء میں فرمایا ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ	اور جو کوئی راہ ہدایت واضح ہو چکنے کے
بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى	بعد رسول کی مخالفت کرے گا اور مسلمانوں
وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ	کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی
نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ	کرے گا تو ہم اس کو اسی راہ پر ڈالیں گے

جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ،
(النسآء - ۴ : ۱۱۵ - ۱۱۶)

جس پر وہ پڑا اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ بے شک اللہ اس چیز کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے، اس سے نیچے جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کی مخالفت کرنا اور مومنوں کی راہ چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کر لینا شرک ہے اور اس کی سزا جہنم ہے اور جہنم برا ٹھکانا ہے۔ ایک امر پر اس پہلو سے تو گفتگو ہو سکتی ہے کہ یہ اللہ و رسول سے ثابت ہے یا نہیں، لیکن اگر اس کا اللہ و رسول کی بات ہونا متعین ہے تو اس پر سرگوشی کرنا، اس کو خلافِ حکمت قرار دینا، اس کو رواجِ زمانہ کے خلاف کہنا اور اس کو چھوڑ کر اپنے جی سے یا دوسروں کی تقلید میں کوئی اور راہ اختیار کر لینا شرک ہے اور اللہ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا۔

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا" والی آیت ایک ہی سورہ میں دو جگہ وارد ہے۔ ایک جگہ اہلِ کتاب کے شرک کے بیان میں ہے، جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، اور یہ دوسری جگہ منافقین کے شرک کے بیان کے سلسلہ میں ہے، اور ایک صاحبِ نظر اگر ان دونوں مقامات پر غور کرے تو اسے نہایت آسانی سے قدرِ مشترک مل جائے گا۔ اہلِ کتاب کے بیان کے سلسلہ میں جہاں یہ آیت وارد ہے وہاں ان کے تین شرک بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی ہدایت پر اپنی قوم کی ہدایت کو ترجیح دیتے ہیں۔ دوسرا

یہ کہ وہ اللہ کی کتاب پر جبت و طاغوت کی پیروی کو ترجیح دیتے ہیں اور تیسرا یہ کہ اہل ایمان کے طریقہ پر اہل کفر کے طریقہ کو ترجیح دیتے ہیں اور یہاں اس آیت سے اوپر والی آیت میں یہ تنبیہ ہے: لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ (النساء - ۴: ۱۱۴) ان کی سرگوشیوں کا زیادہ حصہ ایسا ہے جس میں کوئی خیر نہیں۔ خیر والی سرگوشی تو صرف اس کی ہے جو صدقہ کی صلاح دے یا کسی نیکی کی راہ سجھائے یا اصلاح ذات البین کی دعوت دے۔ یعنی یہ منافقین، پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات، آپ کے احکام اور آپ کی تعلیمات کے خلاف جو سرگوشیاں کرتے ہیں ان میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ خیر صرف اس سرگوشی میں ہے جو ترغیب صدقہ، امر بالمعروف اور لوگوں کی اصلاح کی راہ میں ہو۔ باقی جو لوگ خدا اور اس کے رسول کے حکم پر اپنی رائے کو ترجیح دیتے ہیں تو وہ اپنی خدائی کے مدعی ہیں اور اگر کسی دوسرے کی رائے اور مذہب کو ترجیح دیتے ہیں تو اس کو الٰہ قرار دیتے ہیں اور ان دونوں صورتوں میں وہ مشرک ہیں، موحد نہیں ہو سکتے۔

باب ۵

پچھلے مباحث کا خلاصہ

اس تمام درازنفسی اور طول بیان سے مقصود محض یہ دکھانا تھا کہ لاالٰہ کی نفی اور الا اللہ کا اثبات زبان سے ادا کرنے کے لیے تو نہایت سہل اور مختصر ہے لیکن ان کے مقتضیات و لوازم بہ ظاہرہ جب عمل زندگی میں ہوتا ہے تو انسان کی زندگی کا کوئی گوشہ ان کے دائرہ سے باہر نہیں رہ جاتا۔

یہ حقیقت پچھلے تین ابواب میں ایک موزوں تدریج کے ساتھ واضح ہوگئی ہے۔ اہل مکہ خدا کی ہستی اور اس کی تمام بنیادی صفات کے معترف تھے لیکن قرآن نے ان کے اس اعتراف کو کوئی وقعت نہیں دی۔ اہل کتاب نے ان سے بہت آگے بڑھ کر نہ صرف توحید کا بلکہ اس کی کتابوں کا، اس کے ملائکہ کا اور اس کے رسول کا بھی اقرار کیا لیکن قرآن کی میزان میں ان کا اقرار بھی بالکل بے وزن ٹھہرا۔ سب سے آخر میں منافقین آئے اور انہوں نے خیال کیا کہ توحید کے مقتضیات و لوازم میں سے کوئی بات ایسی نہیں رہ گئی ہے جو انہوں نے پوری نہ کر دی ہو اور شرک کی آلائشوں کا کوئی ایسا دھبہ ایسا نہیں رہ گیا ہے جس کو انہوں نے دھو نہ ڈالا ہو لیکن قرآن نے ان کے اندر سے بھی شرک کا کھوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا اور ہر گروہ کو مطلع کر دیا کہ تم میں سے کوئی بھی خدا کا مخلص اور موحد نہیں ہے۔ ہر ایک نے اپنی بندگی میں دوسروں کو ساجھی بنا رکھا ہے اور اللہ کی نظر میں اس بندگی کی کوئی قیمت نہیں جس میں شرک

کی علاوٹ ہو۔

اب ان تینوں گروہوں کی فرد قرارداد جرم ملاحظہ ہو۔

بنی اسماعیل سے کہا گیا:

تم فرشتوں کو مرتبۂ بندگی سے مافوق سمجھتے ہو، ان کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہو۔ ان کی پوجا کرتے ہو۔ اس پوجا کو تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہو۔ مال و اولاد اور دنیا کی خوش حالی و فارغ البالی کو ان کی برکت کا ثمرہ قرار دیتے ہو۔ خدا کے ہاں ان کی شفاعت بہرحال موجب نجات خیال کرتے ہو۔ ان سے خدا کی طرح محبت کرتے ہو۔ ان کو عالم الغیب مانتے ہو۔

اسی طرح جنات کو خدا کا کفو سمجھتے ہو۔ ان کو خدائی معنوں میں نافع و ضار خیال کرتے ہو۔ ان کی دہائی دیتے ہو۔ ان کی رضا طلبی کے لیے اپنی اولاد کو قتل کرتے ہو۔ ان کی رسائی ملاء اعلیٰ تک مانتے ہو۔ ان کو علم غیب کا وسیلہ جانتے ہو۔ ان کی بندگی کرتے ہو۔ ان سے الہام حاصل کرنے کے لیے مراقبہ کرتے ہو۔

کواکب کو تدبیر عالم میں مؤثر بالذات مانتے ہو۔ بارش کو نچھتروں کا فیض سمجھتے ہو۔ یہی تمام کاروبار ہیں جس کو شعریٰ کی برکت سمجھتے ہو۔

تم نے اپنے ان معبودوں کی ایک بزم بنائی ہے۔ اس میں خدا کی حیثیت بس ایک صدر مجلس کی ہے، جس کا تعلق محض اس کے دار السلطنت، آسمان سے ہے۔ زمین اس کی مملکت کا ایک دور دراز علاقہ ہے، جس کا انتظام وہ اپنے عمال کو سپرد کر کے خود اس سے کنارہ کش ہے۔ تم ان معبودوں کی عبادت کرتے ہو، تم نے ان کے لیے معبد اور استھان بنائے ہیں۔ تم ان کے حج و زیارت کے لیے سفر کرتے ہو۔ ان کے لیے قربانیاں کرتے ہو۔ نذریں اور چڑھاوے پیش کرتے ہو۔ ان کے نام پر جانور چھوڑتے ہو، ان کے تعلق سے بہت سی چیزیں حرام و حلال کرتے ہو۔ ان کے حضور میں

ناظر ہو کر، فال کے تیروں سے ان کی مرضی معلوم کرتے ہو۔ ان کی قسمیں کھاتے ہو۔

تم نے اپنے بزرگوں کی قبروں اور ان کے آثار کو معبد بنا لیا ہے۔ تم ان کو وسیلہ شفاعت اور ان کی عبادت کو ذریعۂ تقرب الٰہی سمجھتے ہو۔ ان کی رسموں کو دین و شرع قرار دیتے ہو۔

پھر تم خود بھی رب بن بیٹھے ہو۔ تم اللہ کی ہدایت کی جگہ اپنے نفس کی خواہش یا دوسروں کے قانون کی پیروی کرتے ہو۔ تم نے باپ دادا کے طریقوں اور رسم و رواج کو شریعت بنا رکھا ہے۔ اور اس طرح سوسائٹی اور خاندان اور قبیلہ کو الٰہ بنائے بیٹھے ہو۔ اپنے جی سے قانون و شریعت بناتے ہو۔ تمہارے باپ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے جو دین تمہیں دیا تھا اس میں تم نے اپنی بدعتیں داخل کیں۔ تم خود اپنے شارع بن گئے ہو۔ تم اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنے استحقاق ذاتی کا ثمرہ اور اپنے ہنر کا نتیجہ سمجھتے ہو۔ تم کو اپنی برتری کا گھمنڈ ہے۔ تم کو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کا فخر ہے تم سمجھتے ہو کہ تمہارا ہر کام عین اطاعت و شریعت اللہ کا کام ہے۔ یہ ساری باتیں شرک ہیں۔ خدا پرستی کے دعوے کے ساتھ ان کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔

اہل کتاب سے قرآن نے کہا:

تمہارا دعوائے توحید و خدا پرستی بھی باطل ہے۔ تم اپنے علما اور راہبوں کو قانون سازی اور تحریم و تحلیل کا اختیار دیتے ہو۔ یہ جو کچھ فتویٰ دیں تمہارے نزدیک وہ قانون حق کے احکام ہیں۔ یہ زمین پر جو باندھیں وہ آسمان پر باندھا جاتا ہے اور زمین پر جو کھولیں وہ آسمان پر کھولا جاتا ہے۔ تم نے کتاب اور طریقۂ نبی سے اجتہاد کی جگہ کاہنوں کے اقوال کو دے رکھی ہے۔ یہود عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ نصاریٰ مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ ان کو خدا کا اوتار قرار دیتے ہیں۔ الوہیت کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور خدا کو اس تین کا تیسرا قرار دیتے ہیں۔ پھر تم اپنی برتری کے مدعی ہو۔ تمہیں ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کا گھمنڈ ہے۔

تم اسی نسبت کو خدا کے تقرب اور اس کے محبوب ہونے کے لیے کافی سمجھتے ہو اور خدا کی اطاعت سے نکل کر طاغوت بن بیٹھے ہو۔ تم نے کتاب الٰہی کے حامل ہونے کے باوجود جبابرہ کی بندگی اختیار کی اور طاغوتی نظام یا تو خود قائم کیے یا ظالموں کے قائم کردہ طاغوتی نظاموں کو قبول کیا۔ تم اپنے تئیں پاک اور برگزیدہ سمجھتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ جو کچھ تم سے صادر ہو جائے وہ سب پاک و پاکیزہ اور اللہ اور دین کا کام ہو جاتا ہے۔ اس کا خدا کے حکموں کے مطابق ہونا ضروری نہیں۔ تم نے خدا کے نبیوں میں تقسیم کر رکھی ہے۔ ایک گروہ کو مانتے ہو۔ دوسری جماعت کا انکار کرتے ہو۔ اللہ کی ہدایت کی جگہ اپنی ہدایت، اپنے طریقے، اپنے انبیاء اور اپنی قوم کو مرکز ہدایت قرار دیتے ہو۔ مدعی ہو کہ تمہارے لیے جہنم کا عذاب نہیں ہے۔ کچھ بھی کرو، تمہارے لیے جنت ہے کہ تقرب الٰہی کے مقام عالی پر سرفراز ہو جاؤ گے۔ تم جبت، شعبدہ، رمل، جفر اور موہومات پر ایمان رکھتے ہو۔ تم ان لیڈروں پر ایمان رکھتے ہو جن کی باتیں اللہ کی ہدایت سے الگ ہیں اور جو شیطان کے پیرو اور خود طاغوت ہیں۔ تم شرک کے حامی ہو اور مشرکوں کے طریقہ کو اہل ایمان کے طریقہ پر ترجیح دیتے ہو۔ یہ ساری باتیں توحید اور اخلاص کے منافی ہیں۔

منافقین سے قرآن نے کہا:

تمہارا دعوائے توحید بھی باطل ہے۔ تم تحاکم الی الطاغوت کے مجرم ہو۔ تم اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہو جو اللہ اور رسول کی ہدایت سے منحرف ہیں تم رسول کو یا تو اعتقاداً واجب الاطاعت نہیں مانتے یا عملاً یا دونوں طرح، حالانکہ خدا کی اطاعت بغیر رسول کی اطاعت کے ممکن نہیں اور خدا کی عبادت کا دعویٰ بغیر اس کی اطاعت کے جھوٹا ہے۔ توحید کی لازمی شرط یہ ہے کہ اپنے تئیں بالکلیہ رسول کے حوالہ کرو۔ اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔ اپنے سارے معاملات میں اُس کی طرف رجوع کرو اور اس کے فیصلوں کو بے چون و چرا مانو۔ تم اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم پر

نکتہ چینی کرتے ہو یا اپنے دلوں میں اس پر اعتراضات چھپائے ہوئے ہو اور اس کے متعلق شکوک و شبہات اور تذبذب و تردد رکھتے ہو۔ اللہ اور رسول نے اہل ایمان کے لیے جو طریقہ ٹھہرایا ہے اس سے انحراف کرتے ہو۔ رسول کی پیروی صرف اپنے فوائد دنیوی کی حد تک کرنا چاہتے ہو۔ تم اپنے دنیوی مفاد اور اپنی شخصی دلچسپیوں اور اپنے خون کے رشتوں اور حلیفانہ روابط کو اللہ اور رسول اور اس کے دین سے عزیز تر رکھتے ہو۔ یہ ساری باتیں شرک ہیں اور اللہ تعالیٰ شرک کو کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔

باب ۶

موجودہ دنیا کا سرسری جائزہ

اب ہمارے پاس وہ روشنی موجود ہے جس کو لے کر ہم دنیا کے جائزہ کے لیے نکل سکتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ قوموں، بالخصوص "متمدن" قوموں کا شرک و بت پرستی کے اعتبار سے کیا حال ہے۔ لیکن اس کتاب کے ہر باب میں غایت درجہ اختصار ملحوظ ہے۔ اس لیے ہم اولاً تو صرف سرسری اشارات پر کفایت کریں گے۔ ثانیاً ہر مذہب کے پیروؤں کی صرف موجودہ حالت کو سامنے رکھیں گے۔ ان کے مذاہب کی اصل حقیقت سے بحث نہیں کریں گے۔ ثالثاً صرف ان قوموں سے تعرض کریں گے جو تمدنی اعتبار سے کچھ اہمیت رکھتی ہیں۔ ورنہ یہ حکایت اتنی دراز ہو جائے گی کہ اس کو سمیٹنا مشکل ہو جائے گا۔

بحث کی آسانی کے لیے ہم پہلے مشرقِ بعید کی اقوام اور بدھ مذہب کے پیروؤں کا جائزہ لیں گے۔ پھر ہندوستان کو دیکھیں گے۔ اس کے بعد ایک طرف مغربی یورپ اور امریکا کا، اور دوسری طرف روس کا جائزہ لیں گے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ تہذیبِ جدید کے ان پرتووں کے اندر شرک کی کیسی گھناؤنی اور مکروہ شکلیں چھپی ہوئی ہیں اور علم و تحقیق کے مدعیوں کے اس دعوے کے باوجود کہ اب شرک دنیا سے ناپید ہو چکا ہے وہ کیسی حیرت انگیز وسعت کے ساتھ پورے کرۂ ارض پر چھایا ہوا ہے۔

مشرقِ بعید

مشرقِ بعید کی اقوام کا غالب حصہ عموماً چار مذہبوں کا پیرو ہے: شنتو مذہب، تاؤی مذہب (TAOISM)، کنفیوشزم اور بدھ مذہب۔

جاپان کا اصل مذہب شنتو مذہب ہے۔ ویسے تو جاپان کی سرزمین پانچ سو مذاہب کی سرزمین کہی جاتی ہے۔ لیکن اس کا قدیم ترین اور جدید ترین مذہب، شنتو مذہب ہے۔ چھٹی صدی کے اواخر میں کوریا کے راستے سے بدھ مذہب بھی وہاں داخل ہو گیا تھا اور نویں صدی میں جاپان میں قومیت کی جو زبردست تحریک اٹھی، اس نے ملک کے اس قدیم مذہب کو پھر زندہ کر دیا اور اس کے بعد سے اب یہی جاپان کا سرکاری اور قومی مذہب ہے۔

اس مذہب کا خاص اصول نیچر اور بزرگوں کی پرستش ہے۔ اس میں کوئی اسی لاکھ دیوی دیوتا ہیں۔ لیکن خاص طور سے سورج کی دیوی ہے۔ جس کا پوتا جاپانیوں کے خیال کے مطابق جاپان کا پہلا حکمران ہوا۔ اسی سے جاپان کا تختِ حکومت یکے بعد دیگرے منتقل ہوتا ہوا موجودہ میکاڈو کو ملا ہے۔ اسی سورج کی دیوی کی نسل ہزارہا برس سے جاپان پر حکمرانی کر رہی ہے۔ اگرچہ اس مذہب میں سمندر کی دیوی، ندیوں کی دیوی، پہاڑوں کی دیوی، آگ کی دیوی غرض بے شمار دیویاں تسلیم کی جاتی ہیں اور قوم کے جانباز سپاہیوں اور شاہی خاندان کے وفادار خادموں کی بھی پرستش ہوتی ہے لیکن شنتو مذہب کا اصل الاصول شاہی خاندان کی سب سے پہلی بزرگ دیوی اور اس کے رشتہ داروں اور اس کی اولاد کی پوجا کرنا ہے۔

چین کا بڑا حصہ تاؤی مذہب، کنفیوشزم اور بدھ مذہب کا پیرو ہے۔ قدیم زمانوں سے آباؤ اجداد اور بھوتوں اور شیطانوں، دیویوں اور دیوتاؤں کی پرستش ان مذاہب کی اصلی خصوصیت رہی ہے۔ مقدم الذکر دونوں مذہب آبا پرستی اور نیچر پرستی کو اصولاً تسلیم کرتے ہیں۔ بدھ مذہب اگرچہ اصلاً آبا پرستی کا حامی نہیں ہے۔ لیکن چین میں

پیچ گرداں کے قدیم مذہب نے اسے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا اور اب یہ تینوں مذاہب چین کی آبا پرستی، مظاہر پرستی اور شیاطین پرستی کے مذہب ہیں۔ جادو و منتر، سحر، شعبدہ ان کی مشترک خصوصیت ہیں اور ان کے پیروؤں کے اوہام و خرافات کی داستان اتنی طولانی ہے کہ پڑھنے والا تھک تھک جاتا ہے۔

تاؤی مذہب کا بانی لاؤتسے ہے۔ اس کا اصل فلسفہ نفی کا فلسفہ ہے اس کا مذہبی صحیفہ مشکل سے مرقس کی انجیل کے نصف کے برابر ہوگا۔ لیکن اس مذہب کے پیروؤں نے بعد میں اس پر جن اوہام کا اضافہ کیا ہے ان کی تفصیلات ضخیم مجلدات میں بھی نہیں سما سکتیں۔ تاؤی فقراء ۳۰۰ قبل مسیح سے مشرقی سمندر میں پریوں کے ایک ایسے جزیرہ کے سراغ میں سرگرداں ہیں جہاں شجرۃ الخلد اگتا ہے۔ انہوں نے سارے آسمان کو دیویوں اور دیوتاؤں سے اور ساری زمین کو جادوگروں اور شعبدہ بازوں سے بھر دیا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اگر اپنے احساسات کی نفی اور جاوداں زندگی کا راز پا جائے تو سماوی دیوتاؤں کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان کی آسمانی دیویوں میں "آسمان کی ملکہ یا مقدس ماں" کو سب سے زیادہ عظمت و اہمیت حاصل ہے۔ یہ سمندروں کی دیوی اور موجوں اور طوفانوں کی ملکہ ہے۔ ہر چینی ملاح، ہر ماہی گیر، ہر جہاز ران اور ہر بحری سیاح کی یہ محافظ ہے۔ جب سمندر میں کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو اس کی دہائی دی جاتی ہے اور وہ فوراً آسمانوں میں نمودار ہو کر بڑے بڑے طوفانوں کو اپنی تلوار سے دفع کر دیتی ہے۔ سمندر کی تاریکیوں میں گم کردہ راہ جہاز رانوں کی رہنمائی کے لیے یہ سرخ لالٹین لے کر نمودار ہوا کرتی ہے۔

کنفیوشزم کا بانی کنفیوشس ہے۔ چین کا اصل مذہب آبا پرستی ہے اور کنفیوشزم کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ آبا پرستی کے لیے ایک سند تصدیق ہے۔ آبا و پرستی چینی معاشرے کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ان کے ہاں سب سے زیادہ عظمت و

اہمیت مُردوں کی ارواح کو حاصل ہے۔ چین کی اصل خدائی انہیں کے ہاتھ میں ہے یوں تو چینی اپنے سارے دیوتاؤں ہی کو قربانیاں اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں، لیکن سب سے زیادہ صدقِ دل کے ساتھ وہ اپنے باپ دادا کی روحوں کی عبادت کرتے ہیں۔

چینی عقیدہ کے مطابق مُردوں کی روحیں زمین پر باقی رہتی ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ان کو کھلایا پلایا نہ جائے، ان کو راضی نہ رکھا جائے اور ان کی عبادت نہ کی جائے تو وہ خفا ہو جاتی ہیں اور ان کی خفگی بہت سی آفتیں لاتی ہے۔ ان کے عقیدہ کے لحاظ سے جس شخص کی روح کی اس کی اولاد کی طرف سے تعظیم اور پرستش نہیں کی جاتی وہ روح ایک ابدی شقاوت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

چین میں فرد کی انفرادی ہستی کا تصور معدوم ہے۔ ہر فرد اپنے آباء و اجداد کے اس طویل سلسلہ کے ساتھ مربوط سمجھا جاتا ہے جو ابتدائے آفرینش سے لے کر خود اس کے وجود تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر فرد چینی کی ہستی یکسر مُردوں کی ارواح کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔ اگر مُردوں کی تعظیم، تمام مراسم مقررہ کے مطابق بجا لانے میں معمولی کوتاہی بھی ہو جائے تو بس قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔

ہزارہا برس گزر چکے ہیں۔ چینیوں کے آباء و اجداد دورِ حجری کی بدویانہ زندگی سے نکل کر دورِ جدید کی حضری زندگی میں داخل ہو چکے۔ پچیس شاہی خاندان ملک پر حکومت کر چکے۔ خونی جنگوں اور عظیم الشان انقلابات نے ملک کے آسمان و زمین بدل دیئے ہیں، لیکن چین کی آباء پرستی روزِ اوّل سے آج تک بدستور قائم ہے اس میں سرِ مُو تغیر نہیں ہوا۔

کنفیوشس نے بہت سے عمدہ اخلاقی اصولوں کی بھی تعلیم دی ہے — لیکن اس کی تمام تعلیمات کی بنیاد آباء پرستی پر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمیں اپنے آباء و اجداد کے لیے ان کو حاضر و ناظر سمجھ کر قربانیاں پیش کرنی چاہئیں۔ ہمیں ارواح کی اس طرح عبادت کرنی چاہیے

گویا وہ ہمارے اندر موجود ہیں"

اگرچہ اس نے کہیں اپنی تعلیمات میں اپنے خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے، لیکن ملک کے ہمہ گیر مذہب اور مذکورہ تعلیمات کی بدولت مرنے کے بعد وہ خود بھی لاؤتسے کی طرح ایک دیوتا بن گیا اور آج چین میں ایک بڑے دیوتا کی حیثیت سے اس کی بھی عبادت ہوتی ہے۔

بدھ مذہب کی جائے پیدائش ہندوستان کی سرزمین ہے۔ لیکن برہمنوں نے اس کو اس ملک سے اس طرح نکالا کہ پھر اس نے ادھر کا رخ کرنے کی جرأت نہیں کی۔ یہاں سے جلاوطن ہونے کے بعد اس کو ہندوستان کے مشرقی جزائر، برما، چین، جاپان، تبت وغیرہ میں پناہ ملی اور اب جاپان کے سوا جہاں سترھویں صدی کی تحریک توحید سے اس نے شکست کھائی، تقریباً ہر جگہ نمایاں حیثیت میں موجود ہے اور چین، تبت وغیرہ میں اس کے پیروؤں کی ایک عظیم تعداد پائی جاتی ہے۔

گوتم بدھ کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ خدا کا قائل نہیں تھا۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ دنیا کی قدیم تاریخ مشرکوں سے تو بھری نظر آتی ہے لیکن خدا کے منکروں کا کہیں بھی کوئی نشان نہیں ملتا۔ خدا کا انکار کرنے والے اگر کچھ ملتے ہیں تو صرف موجودہ دور میں ملتے ہیں۔ گوتم بدھ جیسے فلسفی کے متعلق کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ خدا کا منکر ہوگا۔ ہم نے گوتم بدھ کے عہد کی تاریخ اور اس کے مذہب کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔ گوتم بدھ سے پہلے ہندوستان میں اپنشدوں کے ذریعے سے وحدت الوجود کا فلسفہ اچھی طرح پھیل چکا تھا۔

وحدت الوجود کے قائل کے لیے خدا کے اقرار و انکار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک "آتما" کے سوا تمام کائنات وہم و فریب ہے۔ یوگی کا کام یہ ہے کہ وہ زندگی اور موت کے چکر اور مایا کے جال سے چھوٹ کر روح کائنات یا بالفاظ دیگر "آتما"

میں ضم ہو جائے۔ گوتم بدھ کے دور سے پہلے ہندو جوگیوں کی ریاضتوں کی جو تاریخ ہمیں ملتی ہے وہ تمام اسی عقیدہ کا مظاہرہ ہے۔ وہ طرح طرح کی خوفناک ریاضتوں کے ذریعہ سے مایا کے جال سے نکلنے اور روح کائنات میں ضم ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ جب گوتم بدھ کی آنکھیں کھلیں اور نجات کے لیے اس کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی تو اس کے سامنے بھی یہی فلسفہ آیا اور اس نے برہمنوں ہی کے طریقہ پر زندگی اور موت کی کشاکش اور خواہشوں کے جنجال سے نکلنے کے لیے نہایت جاں گسل ریاضتیں شروع کیں۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے تجربہ کے بعد اس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ مادیت کے غلاف سے نکلنے کے لیے یہ ہولناک ریاضتیں غیر ضروری ہیں، اصل شے نفس کا خواہشات سے پاک ہونا اور روح و دل کا محسوسات کی محبت سے آزاد ہونا ہے۔ چنانچہ جہاں تک تکلیف دہ ریاضتوں کا تعلق ہے، اس نے برہمنوں کے طریقہ کی اصلاح کر دی اور تزکیۂ نفس اور تجرد کے حصول کے لیے ایسے ضابطے بنائے جن میں ظاہری ترک سے زیادہ باطنی ترک پر زور دیا گیا۔

وحدت الوجود کی آخری تان "انا اللہ اور انا الحق" ہے۔ چنانچہ اسی چیز نے ہر ہندو یوگی کو عبد کے بجائے طاغوت بنا دیا۔ گوتم بدھ کی جدوجہد بھی اسی مقصد کے لیے تھی چنانچہ وہ بھی اپنے خیال کے مطابق مادیت کا جامہ اتار کر روح کائنات میں ضم ہو گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے معتقدین نے اس کو خدا بنا دیا اور اس کی ولادت سے متعلق بہت سے بے سروپا افسانے جیسا کہ اسے ایک اوتار کی حیثیت سے پیش کیا، جو دنیا کو نئی زندگی بخشنے آیا تھا۔ اب چین، جاپان، تبت، برما، وغیرہ میں اس کی پرستش خدائی حیثیت سے ہوتی ہے اور اس کے شاندار مندر اور عظیم الشان بت دیکھنے والوں پر حیرت طاری کر دیتے ہیں۔ چین میں اس کے پرستار ہر قسم کے بھوتوں اور دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش میں مبتلا ہیں۔ تبت وغیرہ میں اور بھی برا حال ہے۔ تبت کا

سب سے بڑا پیشوائے مذہبی ـــــ دلائی لامہ ـــــ خود گوتم بدھ کا اوتار خیال کیا جاتا ہے اور اسی طرح خدائی کرتا ہے جس طرح گوتم بدھ۔ وہاں کا دلائی لامہ جب مرتا ہے تو ہر حاملہ عورت ایک نیا خدا جننے کی آرزو سے معمور ہوجاتی ہے اور اس دور میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں، قرعہ اندازی کے ایک خاص طریقے سے، ان میں سے ایک نئے الٰہ کا انتخاب ہوتا ہے۔

ہندوستان

ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔ یہاں کا ہر ذرہ دیوتا ہے۔ چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک اور ذرے سے لے کر آفتاب تک، سب یہاں معبود اور مقدس ہیں۔ دریا، پہاڑ، شجر، حجر، چرند، پرند، بل، جو ہے یہاں تک کہ نا قابلِ ذکر انسانی اعضا تک کے پرستار یہاں مل جائیں گے۔

ویدوں میں ہمارے سامنے سب سے پہلے "ہزار چشم" اندرا آتا ہے، جس نے اپنے عمل نمونہ سے اپنے پرستاروں کو "بدمستی" اور نشہ بازی کی تعلیم دی۔ اس کے بعد برہما، وشنو اور شیو کی تثلیث نظر آتی ہے۔ مقدم الذکر خالق ہے۔ ثانی الذکر محافظ ہے اور تیسرا مارنے والا اور جلانے والا ہے۔

برہما اپنے ہر کلپ کے بعد دنیا کو فنا کرکے از سر نو وجود بخشتا ہے۔ اس کا مندر آج تک راجپوتانہ میں مرجع خلائق ہے۔

وشنو جب دنیا پر کوئی بڑی آفت آتی ہے تو خلق کی نجات کے لیے اترتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ بار بار اوتاروں کی صورت میں جنم لیتا ہے۔ اس کے دس اوتار ہندو میتھالوجی میں مشہور ہیں۔ سری کرشن بھی وشنو کے اوتار خیال کیے جاتے ہیں اور ان کی زندگی کو جس رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور اس سے جو مذہبی روایات ہندو قوم میں پھیلی ہوئی

ہیں ان کے بیان سے بھی شرم آتی ہے۔

شیو، وشنو کا حریف مقابل ہے۔ یہ ایک ہی ساتھ دو متضاد فطرتیں رکھتا ہے۔ اس کے قبضۂ قدرت میں تعمیر و تخریب دونوں ہیں۔ اس کے اندر عورت اور مرد دونوں کی خصوصیات جمع ہیں۔

اس کے بعد ہمارے سامنے بھگتی کا فلسفہ یا ہندو تصوف آتا ہے۔ اس کی بنیاد وحدت الوجود پر ہے۔ اس فلسفہ میں موجود صرف 'آتما' ہے۔ اس کے ماسوا سب وہم و فریب ہے۔ اس کی غایت یہ ہے کہ ذرہ آفتاب، قطرہ دریا اور بندہ خدا بن جائے۔ اس کا راستہ یہ ہے کہ ریاضاتِ شاقہ کے ذریعہ سے روح کو مادہ سے مجرد کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ہندو جوگیوں اور فقیروں نے جو طریقے پیدا کیے ہیں ان کی تفصیلات سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے اور اس کے لیے عملاً انھوں نے جو کچھ کر دکھایا ہے اس کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو انسان اپنے معمولی مقاصد کے لیے جان کی بازی کھیل جایا کرتا ہے وہ خدا بننے کے لیے جو کچھ بھی کر گزرے کم ہے۔ چنانچہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان ہندو جوگیوں نے جس طرح کی ریاضتیں کی ہیں اس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں مشکل سے مل سکیں گی۔ لیکن یہ سب کچھ خدا کی بندگی کے لیے نہیں کیا گیا، بلکہ خدا بننے کے لیے کیا گیا۔

دیوتاؤں کے بعد ہندو میتھالوجی میں دیویوں کی باری آتی ہے اور ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ان سب کی خصوصیات کی تفصیل میں پڑنا تو لاحاصل ہوگا۔ البتہ لکشمی، درگا، بھیروی اور کالی، ان کے نام ہم یاد دلائے دیتے ہیں۔ بالخصوص ان میں سے مؤخر الذکر کو ہندوؤں کے نزدیک بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چیچک، ہیضہ، وغیرہ جیسی خطرناک بیماریاں سب انہی کی غضب ناکیوں کے مظاہر ہیں۔

ہندوؤں کے اندر جس قدر بھی فرقے ہیں وہ یا تو ان دیویوں اور دیوتاؤں کے پرستار

ہیں یا گیتا اور ویدوں کے فلسفے سے متاثر ہیں۔ بعض فرقے کسی قدر مختلف نظر آتے ہیں لیکن ان کا اختلاف محض ظاہری ہے، حقیقت اور مغز کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف دو فرقے کسی قدر مستثنیٰ حالت رکھتے ہیں۔ ایک آریا سماجی، دوسرے سکھ۔ یہ دونوں اسلام سے متاثر ہوئے ہیں، اور توحید کے مفہوم سے کسی قدر قریب آئے ہیں لیکن اسلام سے ان کی قربت ایک دفاعی جذبہ کے تحت وجود میں آئی ہے۔ اس وجہ سے اس قربت کے باوجود وہ اسلام سے دور ہی ہیں۔ ان فرقوں کے بانیوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ مسلمانوں کا نقطۂ نظر بت پرستی پر قائم رہ کر مشکل ہے۔ اس لیے انہوں نے مورتیوں وغیرہ کی پوجا ترک کر کے فی الجملہ ایک ایسی اصلاح قبول کر لی جس کے بعد وہ اپنے خیال کے مطابق روح زمانہ اور عقل سے قریب آ گئے اور اپنے تئیں اس قابل خیال کرنے لگے کہ اب وہ مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں فرقوں کو مسلمانوں سے جو عداوت ابتدا سے ہے وہ کسی اور فرقہ کو نہیں ہے۔ حالانکہ ان کو مسلمانوں کے اصل الاصول سے قریب ہونے کی وجہ سے ان سے محبت کرنی چاہیے تھی۔ بہرحال یہ اصلاح انہوں نے کسی جذبہ کے تحت قبول کی ہو، ایک اہم اصلاح ہے اور اس کی وجہ سے وہ اسلام کی بنیادی تعلیم سے قریب آ گئے ہیں۔ اب ان کو توحید اور اس کے مقتضیات کی تعلیم دینا آسان کام ہے۔ بشرطیکہ حق ان کے سامنے اس راستے سے آئے جو اس کا اصلی راستہ ہو۔

مذہب پرست ہندوستان کا یہ حال ہے۔ عوام و خواص سب اسی طرح کے توہمات مشرکانہ میں گرفتار ہیں۔ یہاں کے اچھے دماغوں پر گیتا کے وحدت الوجود کا تسلط ہے جو بجائے خود ایک عظیم فتنہ ہے۔ آریوں اور سکھوں کی آخری معراج یہ ہے کہ مورتی پوجا کے منکر ہیں، لیکن ہمارے اوپر کے مباحث پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ حقیقی توحید تک پہنچنے کے لیے ابھی ان کو بہت سے مرحلے طے کرنے باقی ہیں۔

جس طرح ہندوستان پر مسلمانوں کے غلبہ کے اثر سے سکھ اور آریہ سماجی وجود میں آئے اسی طرح انگریزوں کے غلبہ اور مغرب کے جدید افکار و نظریات کے اثر سے ایک نیا گروہ وجود میں آیا جو فی الجملہ زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس نے بہت حد تک قدیم ہندو میتھالوجی کے توہمات سے اپنے دماغ کو آزاد کر لیا ہے، لیکن یہ ایک دوسری میتھالوجی تیار کر رہا ہے۔ جس کا مواد اس نے مغرب سے لیا ہے۔ اس میں پرانے دیوتاؤں اور دیویوں کی جگہ نئے دیوی دیوتا ہیں۔ اس میں انسان خود اپنا الٰہ ہے، خود اپنے لیے قانون بناتا ہے، خود اپنے اوپر فرمانروائی کرتا ہے اور خدا کی زمین پر اپنی بادشاہی کا ڈنکا بجاتا ہے۔ اس کا نام ڈیموکریسی ہے۔

مغربی یورپ اور امریکہ

مغربی یورپ اور امریکہ کا اصل مذہب عیسائیت ہے۔ عیسائیت کے بگاڑ کی ابتدائی تاریخ ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ نیسیہ کی کونسل کے بعد سے تثلیث کا عقیدہ باضابطہ سٹیٹ کا مذہب بنا اور پوپ اور کلیسا کی خدائی کا دور شروع ہوا۔ نیز ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ مذکورہ بالا کونسل کے بعد آریوس اور اس کی پارٹی جو حضرت مسیح علیہ السلام کے سچے خلیفہ پیٹر — شمعون صفا — کے عقائد کی وارث اور صحیح نصرانیت کی حامل تھی، نہایت اقلیت، بلکہ مظلومیت و مقہوریت کی حالت میں آگئی[1] اور پال کی باطنیت

---

[1] اسی پارٹی کے باقیات صالحات تھے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لائے اور ان ہی لوگوں کی قرآن نے جگہ جگہ تعریف کی ہے، نہ کہ پال کے متبعین کی جو ہمیشہ توحید دشمنی کے سرخیل رہے ہیں۔

اور تحریفات کی بنیاد پر کلیسا کے رسوم و عقائد کی عمارت کھڑی ہوئی۔

اب ہمیں ایک سرسری نظر یورپ کی صدیوں سے لے کر اصلاح کلیسا (REFORMATION) کے عہد تک کی تاریخ پر ڈالنی ہے۔

اس پیچ میں ہمیں دو باتیں نہایت نمایاں طور پر نظر آتی ہیں: ایک کرسچین چرچ کی وحدت، دوسری اس کا ہمہ گیر اقتدار۔ قرون متوسط میں کلیسا کا اقتدار ایسا غالب اور ہمہ گیر ہو گیا تھا کہ تمام چھوٹی بڑی سلطنتیں اس کے ہاتھ میں بالکل ایک آلۂ بے جان بن کر رہ گئی تھیں اور اس کے آگے مقدس رومی شہنشاہی کا جاہ و جلال بھی ماند پڑ گیا لیکن کلیسا نے اس کے اقتدار سے نہایت غلط فائدہ اٹھایا۔ اس اقتدار کے نشہ میں اس نے وہ جنگ صلیبی شروع کر دی، جس نے دو سو برس تک پورے یورپ کو زیر و زبر رکھا۔ اس دوران میں خداوندانِ کلیسا نے جو جرائم کیے، جس طرح خلقِ خدا کا بے دریغ خون بہایا، جس طرح نوخیز بچوں تک کو جنگ کے نشہ سے سرشار کر کے تباہ کیا، جس طرح وقت کی تمام تعمیری قابلیتوں کو تخریب کی راہ پر ڈال دیا، اس کا ردِ عمل اہلِ یورپ کے دماغوں پر کلیسا کے خلاف ہوا۔ جنگ کی ناکامیوں اور تباہ کاریوں نے اہلِ فکر کے دماغوں میں ایک بحران سا پیدا کر دیا۔ ہر شخص کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اربابِ کلیسا کا اقتدار دنیا کی تباہی کا سبب ہے۔ علم و تحقیق کے شیدائیوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ کلیسا تمام ذہن و فکر پر کابوس کی طرح مسلط ہو گیا ہے اور جب تک یہ کابوس دور نہ ہو گا اس وقت تک فکر و نظر کی تمام راہیں مسدود رہیں گی۔ اربابِ سیاست یہ سوچنے لگے کہ حکومتوں پر کلیسا کا اقتدار بالکل خلافِ عقل اور خلافِ فطرت ہے۔ سیاست کو مذہب سے بالکل بے تعلق ہونا چاہیے۔ یورپ کی مختلف قومیں محسوس کرنے لگیں کہ رومن کیتھولک چرچ دنیا پر رومی اقتدار کا ایک بہانہ ہے۔ اس کو ختم ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ خود کلیسا کے اندر ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی، جس نے یہ

محسوس کرنا شروع کردیا کہ ہم مسیح (علیہ السلام) کی زندگی سے ہٹ کر دنیا داری کی تمام شیطنتوں میں مبتلا ہوگئے ہیں اور ہمارا مقصد اب صرف دولت کے انبار اکٹھا کرنا، اپنے عظمت وجلال کی نمائش کرنا اور دنیا کو تباہ کرنا رہ گیا ہے۔ ہمیں غربت کی زندگی، خدمتِ خلق، ترکِ دنیا اور اتباعِ مسیح کی طرف لوٹنا چاہیے۔

ان تمام چیزوں نے مل جل کر یورپ میں وہ بحران کا دور پیدا کردیا جس کو ہم نشأۃِ ثانیہ (RENAISSANCE) کے نام سے جانتے ہیں۔ بیکن وغیرہ جیسے اہلِ علم، میکیاولی اور ہیوگو گروشیس وغیرہ جیسے اربابِ سیاست، گارڈینو برونو جیسے آزاد خیال مفکرین اسی بحرانی دور کی پیداوار ہیں۔ کلیسا نے ان لوگوں کی مخالفتوں کا جواب مذہبی جرائم کا فیصلہ کرنے والی عدالتوں (INQUISITIONS) سے دیا اور مذہبی و سیاسی اصلاح کے داعیوں اور علم وتحقیق کے شیدائیوں کو ایسی خطرناک سزائیں دیں کہ ان کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ان سزاؤں نے کلیسا کی مخالفت اور پاپائیت کے ختم کرنے کے مطالبہ کو اور زیادہ قوی کردیا۔ مختلف قوموں میں اپنی قومیت کے تحفظ کا جذبہ تیز سے تیز تر ہوگیا۔ اربابِ علم کا جوشِ تحقیق واکتشاف قوی سے قوی تر ہوگیا اور فلسفہ نے تو گویا سر جوڑ کے کلیسائی توہمات کی بیخ کنی کا عزم کرلیا اور خود کلیسائی حلقہ کے اندر اصلاح اور تبدیلی کا مطالبہ درجہ بدرجہ اتنا قوی ہوگیا کہ سولھویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے وائی کلف، ہس اور لوتھر جیسے زبردست حامیانِ اصلاح پیدا ہوگئے اور انہوں نے متحدہ کرسچین چرچ کو پھاڑ کر دو حصوں میں بانٹ دیا اور باضابطہ پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد ڈال دی، جس کا بنیادی تخیل یہ تھا کہ مسیحؑ اور خدا کے درمیان کسی واسطہ کی ضرورت نہیں ہے؛ انجیل کے سمجھنے اور مراسمِ مذہبی کے بجالانے کا حق ایک عام آدمی کو بھی اسی طرح حاصل ہے جس طرح پاپائے روم کو۔

قومی حکومتوں کا آغاز تو تیرھویں صدی ہی میں ہوچکا تھا۔ سولھویں اور سترھویں صدی

تک پہنچتے پہنچتے نیشنلزم، متحدہ قومیت، مذہب اور سیاست کی علیحدگی اور مذہبی رواداری کا زور اس قدر بڑھا کہ کلیسا کو، خواہ وہ کیتھولک ہو یا پروٹسٹنٹ، اپنا تمام کاروبار سمیٹنا پڑا۔ علم و سیاست اور معاش و معیشت کے تمام گوشے چرچ کے تسلط سے یک قلم آزاد ہو گئے۔ اور اس کی جگہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی وہ سیاسی تنظیمات وجود میں آگئیں جن میں مذہب پرائیویٹ زندگی کا ایک مشغلہ رہ گیا اور اجتماعی زندگی پر احبار و رہبان کی خدائی کی جگہ عوام الناس اور پارلیمنٹوں کی خدائی شروع ہو گئی۔

اس تفصیل سے یہ امر واضح ہو گیا کہ عیسائیوں کو خالص خدا پرستی کی سعادت کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ پال نے ان کو مسیح، مریم، کاہن اعظم اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا کیا اور رومن کیتھولک چرچ کی مشرکانہ خرافات کا دروازہ کھولا اور لوتھر کی اصلاحات نے کلیسا کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے اس کی جگہ عوام الناس، پارلیمنٹوں کے ممبروں، بادشاہوں اور پریذیڈنٹوں کو بخش دی اور اس طرح پرائیویٹ اور پبلک زندگی کے الگ الگ ارباب بنا لیے گئے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے جب جمہوریتوں کا ضعف واضح کیا تو یورپ کے بعض ممالک میں ڈکٹیٹر شپ کا آغاز ہوا۔ جمہوریت اور ڈکٹیٹر شپ میں فرق صرف ارباب کی تعداد کا ہے۔ جمہوریت میں بہت سے الٰہ مل کر قانون بناتے اور خدائی کرتے ہیں، ڈکٹیٹر شپ میں صرف ایک الٰہ اپنے مشرکار و اعوان کی مدد سے خدائی کرتا ہے۔

روس

روس میں اشتراکیت کا دور دورہ ہے۔ اشتراکیت جمہوریت کا آخری قدم ہے۔ جمہوریت نے مذہب اور خدا کو پرائیویٹ زندگی کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا، اشتراکیت

نے یہ رشتہ بھی کاٹ دیا۔ انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر انسان کی حاکمیت کو مسلط کر دیا۔ وہاں عیسائی تثلیث کی جگہ مارکس، لینن اور سٹالن کی تثلیث ہے۔ ان اقانیم ثلاثہ نے جو نظام عقائد، جو نظام اخلاق اور جو نظام معاش و معیشت وضع کر دیا وہی روس کا دین ہے۔

باب ۷

مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ

یہ تو ان گروہوں کے شرک کا حال تھا اور ہے جو شرک دشمنی کے مدعی بھی نہیں ہیں۔ اب ہمیں اس گروہ کی حالت دیکھنی ہے جو خالص توحید کی بنیاد پر بنا تھا اور جس کے قیام کی واحد غرض ہی یہی تھی کہ دنیا سے شرک کو مٹا کر توحید قائم کرے۔

یہ امر بالکل قطعی ہے کہ محل کے بدل جانے سے کسی شے کی حقیقت نہیں بدل جاتی جو چیز مشرکین کے اندر شرک ہے، منافقین کے اندر شرک ہے، وہی چیز اگر مسلمانوں کے اندر پائی جائے گی تو وہ توحید نہیں بن جائے گی، شرک ہی رہے گی۔ نجاست کسی ٹھیکرے میں ہو یا سونے چاندی کے کسی خوشنما ظرف کے اندر، دونوں جگہ نجاست ہے۔ اس تبدیلی سے اس کی حقیقت و ماہیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ البتہ حالات کی تبدیلی سے اس کا حکم ضرور بدل جائے گا۔ خنزیر و خمر نجس ہیں اور ہر حال میں نجس ہیں لیکن ایک مضطر و مجبور اگر جان بچانے کے لیے بقدر سد رمق ان میں سے کچھ کھا لیتا ہے تو شریعت اس پر گرفت نہیں کرتی۔ پس ایک چیز ہے واقعہ اور ایک چیز ہے حالات کی تبدیلی کے اعتبار سے اس کا حکم۔ اس باب میں ہم صورتِ واقعہ کا جائزہ لیں گے اور اس کے بعد والے باب میں اس کا حکم بیان کریں گے۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت کا اگر جائزہ لیا جائے اور بے جا عذر و اعتراف حق سے مانع نہ ہو تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عرب جاہلیت سے لے کر منافقین تک شرک کی جتنی

قسمیں بیان ہوئی ہیں۔ اگر وہ سب نہیں تو ان کا بڑا حصّہ مسلمانوں کے اندر موجود ہے، صرف شکلیں بدلی ہوئی ہیں۔ عرب جاہلیت کی جنّات پرستی، طاغوت پرستی، قوم پرستی اور حمایت شرک، منافقین کی طاغوت پرستی، انا پرستی اور مفاد پرستی، ان تمام پرستیوں میں کون سی "پرستی" ہے جو آج مسلمانوں کے اندر موجود نہیں ہے۔

کتنے مسلمان ہیں جو علوم سفلیہ کی لعنتوں میں گرفتار ہیں۔ انھوں نے ٹونے ٹوٹکے گنڈے، تعویذ[1]، سحر اور طلسمات وغیرہ کو کسب معاش کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ تسخیر جن و شیاطین کے وظائف و عملیات کا علم ہی ان کے نزدیک اصلی علم ہے۔ جنات کی تسخیر کے لیے وہ طرح طرح کی ریاضتیں کرتے ہیں، چلّہ کشی کرتے ہیں، نذریں اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں۔ ان کو علم غیب کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ ان کو مستقل بالذات نافع وضار خیال کرتے ہیں۔ ان کی دہائی دیتے ہیں۔ ان کے تعلق سے خدا کی کتنی جائز چیزوں کو حرام قرار

---

[1] احادیث نبوی سے جن تعویذوں کے لیے زیادہ سے زیادہ رخصت ملتی ہے، اوّلاً تو وہ خاص خاص حالات کے لیے ہیں، ثانیاً ان کی اصل روح اللہ واحد سے استعاذہ، اس کی طرف تفویض اور غیر اللہ سے اظہار برأت ہے۔ باقی رہے وہ تعویذ جن میں لایعنی کلمات ہوتے ہیں اور جن میں شرک کی آمیزش کا ظن یا علم ہے، ان کے جواز کا شرع شریف میں کوئی امکان بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر نہایت قلق ہوتا ہے کہ تعویذ فروشی کی موجودہ دکانیں بیشتر ایسے ہی تعویذوں سے چل رہی ہیں، جو عموماً مشرکانہ اور غیر مفہوم عجمی الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں اور اگر آیات قرآن سے بھی استعاذہ کیا جاتا ہے تو عموماً تحریف کر کے۔ ایک بزرگ نے خود مجھ کو بچھو کا ایک عمل بتانا چاہا، جس میں سورۂ ناس کے ہر لفظ کا آخری حرف غائب کر دیا گیا تھا۔ میں نے ان سے کہا: حضرت، قرآن کو مسخ کرنے کی ذمہ داری آپ ہی اٹھائیے۔ مجھے اس سے معاف ہی رکھیے تو میری اس کم قدری سے وہ مجھ سے بہت مایوس ہوئے۔

دیتے ہیں اور کتنی ناجائز باتوں کو جائز کر دیتے ہیں۔

اسی طرح کتنے ہیں جو علم اسرار اور خواص کلمات و اشیاء کے چکر میں رہتے ہیں اور اس علم کو بعینہٖ اسی طرح کے بُرے مقاصد میں استعمال کرتے ہیں، جن میں ان کے پیش رَو یہود استعمال کرتے تھے، یہاں تک کہ بعض ظالموں نے خود قرآن عزیز کو بھی حُبّ و بغض، تسخیر و تفریق اور وضع و استقرار، حتیٰ کہ امساک کے عملیات کا دفتر بنا رکھا ہے۔ اس قسم کی عملیات کے شائق خدا کی نعمتوں کو بعض اوقات عارضی طور پر اور بعض حالات میں مستقلاً حرام کر لیتے ہیں۔ اس طائفہ کے بعض اشخاص کے سامنے جب میں نے ذکر کیا کہ اذنِ الٰہی کے بغیر کسی شے کو حرام و حلال کرنا شرک ہے تو ان کو بڑا تعجب ہوا۔

وباؤں کے زمانوں میں یا خاص خاص بیماریوں کے مریضوں کی موجودگی کی حالت میں کتنی چیزیں ہیں جو گھروں کے اندر اس ڈر سے استعمال نہیں کی جاتیں کہ جو ارواح ان بیماریوں کا باعث ہیں ان کو ان چیزوں سے چڑ ہے اور ان کو دیکھ کر ان کا غضب اور بڑھتا ہے۔

نکشتروں، دنوں اور مہینوں اور کسوف و خسوف سے متعلق کتنے مشرکانہ توہمات ہیں جن میں عورتوں سے گزر کر عاقل مردوں تک کو ہم نے گرفتار پایا ہے۔

کتنے مسلمان ہیں جو آبا پرستی کی لعنتوں میں مبتلا ہیں۔ مشائخ اور بزرگوں کی قبریں گوشہ گوشہ میں موجود ہیں اور علانیہ ان کی پوجا ہو رہی ہے، ان پر نذریں پیش ہوتی ہیں، قربانیاں کی جاتی ہیں، چادریں چڑھائی جاتی ہیں، دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ مصائب اور نقصانات کو اصحابِ قبور کی ناراضی پر محمول کیا جاتا ہے۔ ان کی زیارت کے لیے لوگ دور دور کا سفر کر کے جاتے ہیں۔ ان پر مراقبہ کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں، اور دوسرے بے شمار محرمات کا ارتکاب کرتے ہیں، جن کا حرام ہونا شریعت میں معلوم ہے۔ تقربِ الٰہی کے لیے ان کا وسیلہ ناگزیر خیال کیا جاتا ہے۔ بہتیرے ان کو سمیع و بصیر خیال کرتے ہیں۔ خطرات

اور مصائب کے وقت ان کو مدد کے لیے پکارتے ہیں[۱]۔ ان کو خدا کے ہاں سفارشی سمجھتے ہیں، ان سے دنیا کی کامیابی، مقدمات میں فتح، تجارت میں فروغ اور آل اولاد کی برکت مانگتے ہیں۔ ان کی خدمات میں مختلف اغراض و مقاصد کے لیے درخواستیں پیش کی جاتی ہیں، یہاں تک کہ بعض مزارات پر سائلین کی درخواستوں کو پیش کرنے کے لیے باضابطہ اہتمام ہے۔

کتنی مشرکانہ بدعتیں ہیں جو حضرات صحابہ کرامؓ، صحابیات عظامؓ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواجِ مطہراتِ رسول رضی اللہ عنہن کے نام سے موجود ہیں۔ ان کے نام سے خاص خاص پکوان پکتے ہیں اور ان کے کھانے میں اس قسم کی تفریقیں ملحوظ ہوتی ہیں جو مشرکین کے یہاں ملحوظ ہوتی تھیں[۲] اور جن کا قرآن نے سورہ انعام میں ذکر فرمایا ہے۔

۱۔ ایک ثقہ عالمِ دین دوست راوی ہیں کہ وہ ایک مرتبہ ایک "اسلامی" ریاست کے مفتی صاحب کے ساتھ موٹر پر جا رہے تھے۔ سامنے یکایک ایک بچہ آ گیا۔ مفتی صاحب بے اختیار پکار اٹھے: "یا غوث!" انھوں نے دریافت کیا: آپ نے کس غوث کو مدد کے لیے پکارا؟ مفتی صاحب نے فرمایا: شیخ عبدالقادر جیلانی کو۔

ایک دوسرے بزرگ عالمِ دین نے ایک مرتبہ ایک عالمِ دین اور پیشوائے طریقت کے گہرے رنگِ تصوف کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے بیان فرمایا کہ ہم اور وہ دونوں ٹم ٹم پر جا رہے تھے۔ راستہ میں گھوڑا بدکا اور ہم دونوں کے لیے سخت خطرہ پیش آ گیا۔ اس وقت بے اختیار انھوں نے "یا غوث!" پکارا۔ میں نے برسبیل مزاح اس واقعہ کو سن کر اپنے دل میں ان دونوں صاحبوں کی حالت پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔

۲۔ مثلاً یہ کہ فلاں نیاز کو مرد نہ کھائیں اور فلاں نیاز کو فلاں قسم کی عورت نہ کھائے اور فلاں نیاز صرف دن ہی میں کھائی جا سکتی ہے اور فلاں نیاز رات ہی کے وقت کھائی جا سکتی ہے۔

کہتے ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان صفات میں شریک قرار دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں۔ حد یہ ہے کہ ؎

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر

اتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

کتنی جگہیں ہیں جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے تبرکات بتلائے جاتے ہیں اور ان کی زیارت کی تقریبات مستقل فتنہ بنی ہوئی ہیں۔ بعض مقامات پر بزرگوں کی قبروں اور ان کے تبرکات کے صندوقوں یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانِ قدم کا غسالہ زائرین میں تقسیم ہوتا ہے اور لوگ اس کو بہت سے امراضِ روحانی و جسمانی کا واحد علاج سمجھ کر پیتے ہیں، آنکھوں میں لگاتے ہیں، داڑھیوں میں ملتے ہیں۔ محرم اور تعزیہ داری کی مشرکانہ بدعتیں ہر شہر اور دیہات میں موجود ہیں اور ان کا کم و بیش تجربہ ہر شخص کو ہے۔

کتنے ہیں جو اپنے نسب کو ذریعۂ نجات یا کم از کم ذریعۂ تقرب الی سمجھتے ہیں۔ آباء کا طریقہ کتنوں کے یہاں دین و شرع کی حیثیت رکھتا ہے۔ شرع اور رواج کی اصطلاحیں ہر زبان پر چڑھی ہوئی ہیں اور شرع کے مقابل میں علی الاعلان رواج کو ترجیح دینے والے مسلمان کے ہر طبقہ میں موجود ہیں۔

دینی معاملات میں اللہ کی ہدایت کی تلاش اور طلب تقریباً بالکل مفقود ہے۔ مسلمانوں میں مختلف فرقے ہیں اور ہر فرقہ میں عوام سے گزر کر علماء تک ایسے غالی مل جائیں گے جو اپنے خاص طریقہ، اپنے مخصوص فرقہ کے علماء اور اپنے متعین امام پر اس طرح جامد اور ان کی عصبیت میں اس طرح گرفتار ہیں کہ ان کے دائرے سے باہر ان کے لیے حق و ہدایت کا تصور بھی دشوار ہے۔ بعض غالیوں کا تو یہ حال ہے کہ نصوص کتاب و سنت کی قطع و برید یا دور دراز تاویلیں کر ڈالیں گے، لیکن اپنے امام کے کسی قول پر حرف نہیں آنے دیں گے۔ بعض یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ یہ آیت اور یہ حدیث لازماً ہمارے امام کے سامنے رہی ہوگی، لیکن

اس کے باوجود جب ان کا فتویٰ یہی ہوا تو ہم ان ہی کی پیروی کریں گے۔ آیت وحدیث کے اسرار کے سمجھنے کی ذمہ داری ان پر ہے۔

کتنے ہیں جو اللہ کے فضل سے دین کا علم بھی رکھتے ہیں، لیکن وہ حق کا معیار اپنے شیوخ واکابر ہی کو سمجھتے ہیں۔ ان کے شیوخ جس مسلک پر ہوں، اس کا غلط ہونا ان کے نزدیک ناممکن ہے اور جس مسلک پر ان کے شیوخ نہ ہوں، اس کی صحت پر کتنے ہی دلائل اللہ کی کتاب سے، رسولؐ کی سنت سے، عقل سے، نقل سے جمع کر دیجیے وہ اس سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ جو عصبیت اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہونی چاہیے وہ عصبیت ان کے اندر اپنے شیوخ واکابر کے لیے ہے اور جو حمیت اللہ کی ہدایت اور اس کے رسول کے طریقے کے لیے مطلوب ہے وہ حمیت ان کے اندر اپنے علماء اور ائمہ کے طریقے کے لیے ہے۔ اور اچھے خاصے ذہین لوگ بھی اس فتنہ کی اہمیت کو نہیں سمجھتے ہیں۔

اوپر مشرکین کی خود پرستی اور یہود کی قوم پرستی کا بھی ذکر ہوا ہے اور وہاں ہم نے دکھایا ہے کہ ایک متوارث عظمت دینی و دنیاوی کے بعد کس طرح قومیں اور جماعتیں خود طاغوت بن جایا کرتی ہیں۔ کس طرح وہ اللہ کے تمام وعدوں اور اس کی ساری برکتوں کو ایمان باللہ اور عمل صالح کی جگہ اپنے نسب اور خاندان سے وابستہ کر دیتی ہیں۔ کس طرح اپنے دائرہ کو نجات کا دائرہ اور اپنے طریقے کو ہدی اللہ کا قائم مقام بنا دیتی ہیں۔ ٹھیک یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔ یہ جو کچھ کرتے ہیں وہ آپ سے آپ اسلامی ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے طریقے سے مطابق ہونا ضروری نہیں۔ یہ جو رنگ ڈھنگ اختیار کر لیں وہ صبغۃ اللہ ہے، اگرچہ وہ مغرب کی جاہلی تہذیب کی بھونڈی نقالی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ جو تعلیم اپنے بچوں کو دیں وہ اسلامی تعلیم ہے اگرچہ وہ تعلیم بچے کے دل کے اندر سے اسلام کی جڑ اکھاڑ کر پھینک دے۔ یہ جو ادارے

قائم کردیں وہ اسلامی ہیں، اگرچہ ان کے اندر شب و روز اسلام اور اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑایا جاتا ہو۔ یہ جس اساس پر بھی اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرلیں اور جس شرع و آئین کو بھی اختیار کرلیں، ان کی اسلامیت کسی حال میں بھی ان سے جدا نہیں ہو سکتی۔ ترکیہ نے پرسنل لا سوئٹزرلینڈ سے تعزیرات اٹلی سے اور قانونِ تجارت جرمنی سے مستعار لے لیا، تاہم اس کا ایک اہم ترین اسلامی حکومت ہونا مسلّم رہا اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامے انجام پائے وہ دین کے غازی، مجاہد اور محسنِ اعظم، سب کچھ سمجھے جاتے ہیں۔

اسی نقطۂ نظر کا فیض ہے کہ ہندوستان کے مسلمان سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے چند مخصوص دائرے ایسے بنالیے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت حکومت کی مشینری اور مجالس قانون ساز میں حاوی رہی اور اجتماعی اور معاشرتی امور میں انہیں اپنے رنگ کو چمکانے کا موقع ملا، تو یہ دائرے پاکستان بن جائیں گے، اگرچہ حکومت کا نظام کسی جاہلی نظام کی نقالی ہی اور اگرچہ نہ مجالسِ قانون ساز میں اللہ کی کتاب کو کوئی درخور حاصل ہو اور نہ ثقافتی اور تہذیبی دائروں میں دین کا کوئی دخل ہو۔ یہود اور مشرکین کے ادعائے پاکی و برتری ـــ يُزَكُّونَ أَنْفُسَهُمْ ـــ کو قرآن نے ان کے اقسامِ شرک میں گنایا تھا۔ اس کی تفسیر حال کے مسلمانوں نے کتنی خوبی کے ساتھ سمجھا دی ہے۔ وہ خدا کے محبوبوں کی اولاد اور افضل امت تھے، اس لیے سمجھنے لگ گئے تھے کہ وہ جو کچھ کرگزریں وہ آپ سے آپ محبوب و مطبوع ہو جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہدی اللہ اور کتاب اللہ کے مطابق بھی ہو۔ اسی طرح مسلمان سمجھنے لگ گئے ہیں کہ وہ خیر الامم ہیں، اس لیے ان کا ہر کام بہتر اور پاک ہے۔ ان کی اکثریت جو قانون وضع کردے وہ خدا کا قانون ہے۔ وہ جو پالش مسلمانوں کے چہروں کے لیے تیار کردیں وہ صبغۃ اللہ ہے اور اس راہ میں جو ان کی قیادت کرے وہ رہبرِ اعظم ہے۔

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانہ بنے

گویا مسلمان نامی گروہ میں ہونا ہی راہ یاب ہو جانا ہے، اگرچہ زندگی خدا سے بغاوت اور نافرمانیوں ہی میں گزرے۔ یہ حلقہ بجائے خود خدا سے نافرمانی کے لیے امن ہے۔ جو اس سے باہر ہیں وہ دوزخی اور جہنمی ہیں، لیکن جو اس کے اندر ہیں وہ عبد کے بجائے طاغوت بن کر بھی خدا کی رحمت کے حق دار ہیں۔ حضرت صادق مصدوق علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ تم اپنے اگلوں ــــ یہود ــــ کے ہر نقش قدم کی پیروی کرو گے۔ غور کیجیے مسلمانوں کی اس ذہنیت اور کُوْنُوْا ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَھْتَدُوْا (البقرۃ-۲:۱۳۵) (یہود یا نصرانی ہو تو ہدایت پاؤ گے) اور وَلَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً (البقرۃ - ۲ : ۸۰) (ان کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر صرف گنتی کے چند دن) میں کیا حیرت انگیز تشابہ ہے۔

قرآن نے یہود اور منافقین کی طاغوت پرستی اور حمایت شرک کو شرک قرار دیا ہے۔ یہود کی طاغوت پرستی یہ تھی کہ وہ ایسے لیڈروں کی پیروی کرتے تھے، جو اللہ کی ہدایت کی جگہ لوگوں سے اپنی ہوائے نفس کی پیروی کراتے تھے۔ مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں کتنے ہیں جو آج ایسے ہی لیڈروں کی پیروی کر رہے ہیں، جو ان سے اپنے ہوائے نفس کی پیروی کرا رہے ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول کی اطاعت کے وہ داعی ہیں، نہ ان سے واقف ہیں، نہ ان پر عامل ہیں۔ کتنے سادہ لوح ایسے ہیں جو برملا کہتے ہیں کہ ان کا راستہ اللہ اور رسول کا راستہ نہ سہی، لیکن ان کے اندر مسلمانوں کی خیر خواہی کا جذبہ تو ہے۔ طاغوت بننے کی اس سے زیادہ بری مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج مسلمانوں کو اللہ، اس کے دین اور اس کے رسول کی خیر خواہی سے زیادہ خود اپنی خیر خواہی مطلوب ہے۔ اگر ان کی اپنی بات بنتی ہے تو کچھ پروا نہیں گو خدا کی

بات بگڑ جاتے۔ اگر ایک شخص ان کو ایک ایسی راہ پر لیے جارہا ہے جس میں ان کو اپنے غرور کا سر اونچا نظر آتا ہے تو دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے تو کچھ غم نہیں۔ اللہ اکبر! کیسے شدید فتنہ کا زمانہ ہے کہ مسلمان خدا کی عبدیت سے نکل کر بھی اپنے مسلمان ہونے کا مدعی ہے اور ان لوگوں کو وہ اپنا بہترین خیر خواہ سمجھتا ہے جو کھلم کھلا اس کو اللہ کے دین کے سوا کسی اور راستہ پر لے جا رہے ہیں۔

منافقین کی طاغوت پرستی یہ تھی کہ وہ اپنے بعض معاملات یہود کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، اللہ اور اس کے رسول کی عدالت میں نہیں لاتے تھے۔ یہاں یہ حال ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ پر طاغوت کا غلبہ ہے۔ عدالتیں طاغوتی ہیں اور مسلمان ہر طرح کے معاملات میں ان ہی سے رجوع کرتے ہیں۔ درس گاہیں طاغوتی ہیں اور مسلمانوں کا بڑا طبقہ اپنے بچوں کو ان ہی کے حوالہ کرتا ہے۔ نظامِ حکومت طاغوتی ہے اور مسلمان نہ صرف اس کے کل پرزے بنے ہوتے ہیں، بلکہ اس کے اندر ترقیٔ درجات کے لیے مقابلہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تہذیب طاغوتی ہے اور مسلمان اس غازۂ جمال کو لیپنے میں بھی سب سے زیادہ مسرت ہیں۔ نظامِ معاش و معیشت طاغوتی ہے اور مسلمان اس کو اپنانے میں بھی پیش پیش ہے۔ ادب اور آرٹ طاغوتی ہے اور مسلمان اس میں بھی اپنے حصہ کے لیے بے قرار ہے اور شاید گنتی کے نفوس ہوں گے جو ان چیزوں کے اندر کوئی قباحت محسوس کرتے ہیں۔

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ شرک کی حمایت و تائید بھی شرک ہے، لیکن یہاں کتنے مسلمان ہیں جو اپنے ذہن و دماغ اور اعضاء و جوارح کی ساری قوتیں ایک طاغوتی نظامِ تمدن کی کامیابی و ترقی میں صرف کر رہے ہیں۔ کتنے ہیں جو اپنے مال سے اس کی سربلندی اور استحکام میں ساعی ہیں۔ کتنے ہیں جو اس کلمۂ کفر کے اعلاء کی راہ میں اپنی

جانیں تک قربان کر رہے ہیں۔

اسلامی احکام و تعلیمات کے خلاف منافقین کی سرگوشیوں اور اہلِ ایمان کے طریقہ کے خلاف ان کی خود رائیوں کو بھی قرآن نے شرک قرار دیا ہے، لیکن آج کتنے مسلمان ہیں جو اللہ و رسول کے احکام کے خلاف صرف نجویٰ پر قانع نہیں ہیں بلکہ علانیہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ شریعت کے احکام کو فرسودہ، ناقابلِ عمل اور خلافِ عقل و تہذیب قرار دیتے ہیں۔ اسلامی تعزیرات اور اسلامی نظامِ معاش و معیشت کو صرف ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے حالات کے لیے سازگار بتلاتے ہیں۔ قرآن کی عقلیت کو جتیرے زمانہ کے معیار سے فروتر سمجھتے ہیں، اور اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں، خواہ وہ ظاہر سے متعلق ہو یا باطن سے، اس جادہ سے منحرف ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے اہلِ ایمان کے لیے متعین کیا۔ ان کا فکر غیر اسلامی ہے، ان کی معاشرت غیر اسلامی ہے۔ جو چیز اللہ و رسول کے ہاں مطلوب ہے ان کے ہاں مبغوض و مہجور ہے۔ جو اللہ و رسول کے نزدیک مبغوض و مردود ہے وہ ان کے ہاں مطلوب و مقبول ہے۔ انھوں نے یا تو اپنے نفس کو الٰہ بنا رکھا ہے یا ان لوگوں کو الٰہ بنا رکھا ہے جن کی تعلیم و تہذیب سے وہ مرعوب ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کی نسبت صرف اس قدر ہے کہ وہ ان تمام باتوں کے باوجود اپنے تئیں مسلمان بھی کہتے ہیں۔

منافقین کی مفاد پرستی کو بھی شرک قرار دیا گیا۔ آج کتنے مسلمان ہیں جو اللہ کی بندگی کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن وہ بالکل وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ (الحج - ۲۲ : ۱۱) (جو خدا کی بندگی ایک کنارے پر کھڑے ہوئے کرتے ہیں) کی تصویر ہیں۔ جس حد تک اسلام کے اقرار اور اس کی پیروی میں کوئی خرخشہ نہیں ہے اس حد تک وہ مسلمان ہیں، لیکن جہاں سے اسلام کے وہ مطالبات شروع ہوتے ہیں

جن سے ان کے کسی دنیوی مفاد کو نقصان پہنچتا نظر آتا ہے یا زندگی کو آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہیں سے وہ کٹ کے الگ ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو پورے طور پر اللہ اور رسول کے حوالے نہیں کیا ہے۔ وہ رسول کو صرف اعتقاد کے حد تک رسول مان لینا کافی سمجھتے ہیں۔ اس کی لائی ہوئی تعلیم اور اس کی بخشی ہوئی ہدایت کا زندگی کے ہر شعبہ میں واجب الاطاعت ہونا ان کے نزدیک توحید اور ایمان بالرسالت کا جزو نہیں ہے۔ حالانکہ ہر رسول 'اُعْبُدُ اللہَ' (اللہ کی بندگی کرو) کے ساتھ 'وَ اَطِیْعُوْنِ' (اور میری اطاعت کرو) کا بھی حکم دیتا ہے اور یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ جو میرے طریقے کے خلاف ہیں ان سے بغاوت کرو: وَلَا تُطِیْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے کفر و اسلام کی اصل نزاع شروع ہوتی ہے، ورنہ مجرد اس اعتقاد میں کہ اللہ ایک ہے، رسول اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں، ہم اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے نبیوں اور اس کی کتابوں اور آخرت پر ایمان لاتے ہیں، ایسی کیا بات ہے جس پر گردنیں کٹیں، تلواریں چلیں اور ہجرت، جہاد اور قتال کے مرحلے پیش آئیں؟ عرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ایسے لوگ موجود تھے جو بت پرستی کے کھلم کھلا منکر تھے اور ان میں بعض مشہور خطیب بھی تھے جو علانیہ اپنے خطبوں میں توحید کا ذکر کرتے تھے لیکن قریش کو ان سے کوئی خاص پرخاش نہ تھی۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مجرد اس بات پر لڑائی کرتے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا رسول سمجھتے ہیں اور بتوں کے مخالف ہیں۔ ان کی ساری لڑائی تو اسی بات پر تھی کہ یہ خدا کی اطاعت کو اس کی بندگی کا ضروری جزو قرار دیتے ہیں اور اس اطاعت کا راستہ اپنی اطاعت بتاتے ہیں اور ہم سے بغاوت اس کی شرط لازم قرار دیتے ہیں۔

دین کا یہی حصہ ہے جو پرائیویٹ نہیں ہو سکتا اور جو لازماً اپنے پیرووں سے اپنی

تمامت کے لیے سرفروشی اور جانبازی کا مطالبہ کرتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اہلِ عرب اپنے اندر دینِ حنیفی کے پیرووں کو برداشت کر سکے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو گوارا نہ کر سکے۔ پس جو مسلمان اپنے ایمان باللہ و ایمان بالرسول کے ساتھ دوسرے دینوں کی اطاعت جمع کر لینے میں شرک کا کوئی شائبہ نہیں پاتے، جن کا دین عرب میں ایک مسجد اور لندن میں ایک قبرستان سے زیادہ کا طلبگار نہیں ہے، جن کے لا الٰہ کی زد صرف مُردہ خداؤں ہی پر پڑتی ہے، زندہ خداؤں کو اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا ہے، انہیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ ان کے لیے نہ صرف ہندوستان، بلکہ تمام دنیا دارالامن ہے۔ ایسی بے دھار کی تلوار سے نہ عرب جاہلیت کو کچھ اندیشہ ہو سکتا تھا، نہ جاہلیتِ جدیدہ کو اس سے کوئی اندیشہ ہو سکتا ہے، اور اگر جاہل عربوں کو اس سے کچھ چڑ تھی بھی تو موجودہ زمانہ کے متمدن انسان کو اس بے دہانہ کی توپ اور اس ٹوٹا بندوق کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ اس بات پر راضی ہے کہ پوجا جس کی چاہے ہوتی رہے، البتہ اطاعت صرف اسی کی ہو۔

باب ۸

وقت کا اصلی فرض
اور بعض شبہات کا ازالہ

جو چیزیں شرک ہیں یا جن چیزوں میں شرک کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی ہے ان کے ساتھ ایک مسلمان کا فطری تعلق وصل کا نہیں، فصل کا ہے، دوستی کا نہیں، دشمنی کا ہے، محبت کا نہیں، عداوت کا ہے، حمایت و نصرت کا نہیں، نفرت اور بغاوت کا ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ اگر اس کے پاس طاقت ہے تو طاقت سے اس کو مٹا دے۔ اگر طاقت نہیں ہے تو زبان سے اس کے خلاف آواز بلند کرے۔ اگر اس کی قدرت بھی اس کو حاصل نہیں ہے تو دل میں اس سے بغض و نفرت رکھے۔ اس سے نیچے عزم و ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

پچھلے ابواب میں مسلمانوں کی جو حالت بیان ہوئی ہے اس سے واضح ہے کہ ان کی اکثریت کا حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ مسلمان نہ صرف عزم اور ایمان کے آخری درجہ سے گرتے جا رہے ہیں بلکہ ان کے اوپر آہستہ آہستہ شرکیہ اعمال و عقائد کی تہیں جمتی جا رہی ہیں اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک مدت سے کسی صحیح دینی نظام کے موجود نہ ہونے اور طاغوت کے غلبہ کی وجہ سے توحید اور اس کے مقتضیات کا صحیح شعور ان میں غائب ہوتا جا رہا ہے۔ پس وقت کا اصلی فرض یہ ہے کہ ایک ایسی صالح و مصلح جماعت کھڑی ہو جو مسلمانوں میں توحید کا صحیح شعور بیدار کرے۔ جو لوگوں کو عبادت اور عبدیت کا اصلی مفہوم بتائے جو خدا کی حاکمیت

اور رسول کے مُطاع ہونے کا لوگوں کو مطلب سمجھائے۔ جو دنیا پر واضح کر دے کہ اسلام اور ایمان کے مقتضیات و لوازم کیا ہیں جو خدا کی زمین پر اس فرض کو انجام دے جو بحکم خداوندی: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ (البقرۃ - ۲ : ۱۴۳) (اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے ہو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے)۔ رسولِ خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر عائد ہوتا ہے۔ جو خلقِ خدا کو خدا کی وہ امانت ادا کر دے جس کے ادا نہ کرنے کی وجہ سے یہود ملعون ہوئے: لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ (المائدۃ - ۵ : ۶۳) (ان کے علماء اور فقہاء ان کو گناہ کی بات کہنے اور ان کو حرام کھانے سے روکتے کیوں نہیں)۔ اور جو اللہ تعالیٰ کے اس منشا کو پورا کرے جس کی تکمیل کے لیے اس نے بار بار اپنے انبیاء مبعوث فرمائے اور جس کے لیے کتنی قوموں کو اس نے معزول اور کتنی امتوں کو مامور فرمایا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ	اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو
اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ	حکم کرے اور منکر سے روکے۔

(آل عمران - ۳ : ۱۰۴)

یہ جماعت تنہا زبان و قلم سے نہیں، بلکہ اپنے عمل سے خدا کی توحید کی شہادت دے۔ یہ دنیا کو اللہ کے رنگ میں رنگنے کے لیے اٹھے اور خود اس رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔ قوم و وطن کی ساری عصبیتیں اور نسل و خاندان کی ساری بندشیں اس نے توڑ ڈالی ہوں۔ کسی خاص قوم کی سیاسی برتری، عددی اکثریت اور معاشی فوقیت کی کوئی ادنیٰ

خواہش بھی اس کے دل کے کسی گوشہ میں چھپی ہوئی نہ ہو۔ اس کی ساری جدوجہد کا مقصود صرف اللہ کا کلمہ اور اس کے رسولوں کی دعوت کو بلند کرنا ہو۔ اس کی دشمنی دنیا کے کسی ایک ہی باطل سے نہ ہو، بلکہ دنیا کے ہر باطل اور زمین کے ہر فساد سے ہو۔ اس کی ضرب بیک وقت ہر جاہلی اور طاغوتی نظام پر پڑے۔ یہاں تک کہ وہ طاغوت بھی اس سے کسی چشم پوشی اور رعایت کا امیدوار نہ ہو جو اس قوم کے اندر ہو، جس کے اندر سے وہ خود اٹھی ہو۔ وہ باطل کو ایک ایک کرکے انتخاب کرے اور حق کے لیے اپنی دوستی کا اور باطل کے لیے اپنی دشمنی کا اعلان کردے۔ اس راہ میں اپنی ساری آرزوؤں، ساری تمناؤں، ساری دوستیوں اور تمام رشتوں اور ناتوں کو قطع کرلے اور جو کچھ اس کے صلہ میں اللہ کے پاس ہے اس پر قانع ہوجائے۔ اس کی دعوت ساری خدائی کے لیے یکساں اور عام ہو۔ اس کی جھولی کی روٹی اور اس کی چھاگل کے پانی میں ہر بھوکے اور پیاسے کے لیے آسودگی اور سیرابی ہو۔ اس کا چراغ پہاڑی کے چراغ کی طرح چمکے اور ہر گم گشتہ راہ کی رہنمائی کے لیے اشارہ کرے۔ اس کی ہدایت کی ضیا پاشیاں خدا کے سورج کی طرح عام و ہمہ گیر ہوں۔ اس کا ابر کرم آسمان کی بارش کی طرح ہر دشت و جبل کو سیراب کرے۔ اس کی گفتگو ہر بولی میں، اس کی مخاطب تمام نسلِ انسانی ہو۔ وہ چیخ چیخ کے پکارے اور پیٹ پیٹ کر سمجھائے اور نوعِ انسانی کی روحانی بیماریاں اس کو اس درجہ بے قرار کردیں کہ وہ خلوت کے سجدوں میں اس کی نجات کے لیے پھوٹ پھوٹ کے روئے۔ اس کی راتیں بستر کی لذتوں سے محروم ہوجائیں اور اس کے دن فراغت کی گھڑیوں سے بے نصیب ہوجائیں۔ وہ مخلوقِ خدا کی گردن میں اتنے بے شمار ارباب و آلہہ کی غلامی کا بوجھل طوق دیکھ کر دکھ اور درد سے بھر جائے اور ہر سننے والے کان اور ہر دیکھنے والی آنکھ تک اللہ کی وہ دعوت قولاً و عملاً پہنچا دے جو ان تمام مصائب کا واحد علاج ہے۔

ایک ایسی بے جمہ و باہمہ جماعت اپنے مقصد میں ناکامیاب نہیں ہوسکتی۔ طاغوت

کے ہمہ گیر غلبہ کے باوجود انسان کی فطرت مردہ نہیں ہوگئی ہے۔ خدا کے کتنے بندے ایسے ہیں جن کے دلوں میں توحید اور اس کے لوازم کا شعور آج بھی زندہ ہے۔ لیکن ان کے اندر وہ عزم و ہمت نہیں ہے جو انہیں وقت کے حالات سے پیکار کے لیے بے چین کر دے۔ وہ امرِ حق کو قبول کرنے کے لیے کسی دلیل و برہان کے منتظر نہیں ہیں۔ ان کو صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی خدا کا مخلص بندہ "حَيَّ عَلَى الصَّلٰوۃِ" کی آواز بلند کر دے اور اپنے عزمِ راسخ اور حسنِ نیت سے ان کو یقین دلا دے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہی چاہتا بھی ہے۔ جوں ہی یہ حقیقت ان کے سامنے روشن ہو جائے گی وہ اپنی غفلت کے بستروں کو تہ کر کے اور علائق کی ساری زنجیروں کو توڑ کر اس کے ساتھ ہو لیں گے۔

کتنے ایسے ہیں جن میں شرک سے پوری پوری بیزاری موجود ہے۔ لیکن توحید کے تمام مقتضیات و لوازم کا ان کو پورا علم نہیں ہے۔ انہوں نے انسان کی عبدیت، خدا کی حاکمیت، رسول کی رسالت اور اسلام و ایمان کا حقیقی مفہوم اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔ مذہب کا مطالعہ یا تو انہوں نے کیا نہیں ہے، یا کیا ہے تو مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ نہیں کیا ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنی موجودہ زندگی کو خدا کے راستہ سے الگ نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو کم از کم اس علیحدگی کی اصلی نوعیت ان کے سامنے نہیں ہے۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگرچہ انہوں نے خدا کے راستے سے کچھ الگ ہو کر ایک راہ ضرور نکال لی ہے، لیکن یہ انفصال ایسا نہیں کہ پھر اتصال ناممکن ہو جائے۔ وہ جوں ہی محسوس کریں گے کہ یہ دو متنقل خط دو مختلف سمتوں میں بڑھ رہے ہیں اور جس قدر آگے بڑھتے جائیں گے، ایک دوسرے سے ان کی دوری بڑھتی ہی جائے گی، یہاں تک کہ آخرت میں پہنچ کر وہ "اَضَلَّ سَبِيلًا" کے حکم میں ہو جائیں۔ وہ فوراً اپنے پوزیشن پر غور کریں گے اور ان کی بڑی تعداد ان شاء اللہ حق کا ساتھ دے گی۔

بہت سے ایسے لوگ ہیں جو حق کو حق سمجھنے میں غبی نہیں ہیں، لیکن اپنی مشکلات کا اندازہ کرنے میں غبی واقع ہوئے ہیں۔ وہ صحیح دعوت کے ذریعہ سے خدا اور اس کی اعلیٰ صفتوں کا علم جتنا پاتے جائیں گے اپنے نفس کی زنجیروں سے اسی قدر چھوٹتے جائیں گے، یہاں تک کہ ان میں اللہ کے کتنے بندے ایسے نکل آئیں گے جو روح کو جسم پر، ایمان کو پیٹ وتن پر، اور خدا اور اس کی بندگی کو دنیا اور اس کی جھوٹی عزتوں اور نمائشوں پر ترجیح دیں گے اور صرف خدا ہی کے راستہ میں ان کو سلامتی نظر آئے گی اور جو زیادہ پست ہمت ہوں گے ان میں اہلِ حق کی ایک جماعت کے عملی مظاہرے سے ہمت وقوت پیدا ہوگی۔ وہ جب دیکھیں گے کہ اس آسمان کے نیچے خدا کے ایسے بندے بھی ہیں جنہوں نے اپنے خالق کی بندگی کی راہ میں جھوٹی عزتوں پر لات ماری ہے، دنیا کو ٹھکرایا ہے، طاغوت سے سرکشی کی ہے، اپنے دنیاوی مفاد اور اپنے اہل وعیال کے لیے ہر خطرہ کو دعوت دی ہے تو ان کے ضمیر میں بھی قوت پیدا ہوگی، وہ بھی اپنے بازوؤں کی قوت اور اپنے پروں کی قوتِ پرواز کی آزمائش کریں گے۔

چونکہ اس جماعت پر کسی خاص قومیت کا لیبل چپکا ہوا نہ ہوگا، بلکہ اس کا تمام تر رشتہ صرف اللہ کے دین اور اس کے اصولوں سے ہی ہوگا اس لیے خدا کا ہر بندہ اس کی دعوت پر مجرد اس دعوت کی صفات کے لحاظ سے غور کرے گا۔ اس کو کسی قوم کی عددی اکثریت یا سیاسی برتری کی جدوجہد سمجھ کر اس سے بدگمان نہ ہوگا اور یہ حقیقت جس رفتار کے ساتھ نمایاں ہوتی جائے گی اسی رفتار سے اس دعوت کی مقبولیت بڑھتی جائے گی۔ ایک عیسائی، ایک انگریز، ایک جرمن، ایک اطالوی، ایک ہندو، ایک جین، ایک بدھ، سب اس پر مجرد اس پہلو سے غور کریں گے کہ اس دعوت کی عقلی قدر وقیمت کیا ہے؟ اس کا اخلاقی معیار کیا ہے؟ معاشی اور سیاسی نقطۂ نظر سے اس کا درجہ کیا ہے؟ دنیا کے تمام آزمائے ہوئے طریقوں اور دینوں میں اس کو امتیاز حاصل

ہے ؛ اور کس حد تک یہ دنیا کی مشکلات کا علاج ہے ؟ یہ چیز دفعتہً اسلام کو ایک متحرک چیز بنا دے گی اور جو چیز ایک بند تالاب کے پانی کی طرح ساکن و جامد ہے وہ ایک سیلاب کے جوش و طوفان کی طرح ہر پست و بلند پر چھا جائے گی۔

اس جماعت کی دعوت اس مفروضہ سے نہیں شروع ہو گی کہ ہندوستان میں دس کروڑ بنے بنائے مسلمان موجود ہیں۔ ان کو بارہ یا سولہ کروڑ کی تعداد تک پہنچانا چاہیے ، بلکہ وہ ان مسلمانوں کے درمیان ان کے عقائد و اعمال کی بنا پر فرق کرے گی۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس کی دعوت 'یا ایھا المشرکون وحدوا اللہ' (اے مشرکو، اللہ کو ایک مانو) 'یا ایھا الکفرون امنوا باللہ' (اے کافرو، اللہ پر ایمان لاؤ) سے شروع ہو گی۔ جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ اس طریقِ دعوت سے بالکل ناواقف ہیں جو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سے ماخوذ ہے اور جس کی سب سے زیادہ مکمل تصویر خود قرآن پاک میں موجود ہے۔

قرآنی دعوت کے تدریجی مراحل پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو باوجودیکہ آپ کی پوری قوم کا فرد مشرک تھی، لیکن آپ نے دعوت کا آغاز "اے کافرو" اور "اے مشرکو" کے الفاظ سے نہیں کیا تو پھر ان لوگوں کو جو آپ کے امتی ہیں ان لوگوں کے اندر جو پشتہا پشت سے مسلمان ہیں اور نہیں معلوم ان میں کتنی عظیم تعداد بندگانِ حق کی ہے، یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ ان کو کافر یا مشرک فرض کر کے اپنی دعوت کا آغاز کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ حق کا آغاز "اے میری قوم" "اے لوگو" "اے انسانو" سے کیا اور پہلے لوگوں کے اندر ان کے اصولی مسلمات کے مقتضیات و لوازم کا احساس پیدا کیا اور کفر و شرک کے قبیل کی جو باتیں ان کے اندر پیدا ہو گئی تھیں ان کا کفر و شرک ہونا واضح کیا۔ یہ کام جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا جاری رہا ، یہاں تک کہ قوم پر اللہ کی

حجت تمام ہوگئی۔ جن لوگوں کے اندر صلاحیت قوی تھی وہ رفتہ رفتہ حق کے ساتھ ہو گئے اور جن کے قلوب مردہ ہو گئے تھے یا جن کے حجابات سخت تھے انھوں نے نہ صرف یہ کہ خود اپنی زبان سے اپنے کفر کا اعلان کر دیا، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کر لیا۔ اس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم ہوا اور یہ پہلا موقع ہے کہ آپ کی زبان سے اپنی قوم کے لیے "اے کافرو" کا لفظ نکلا جو ہجرت و برات کی عظیم الشان سورہ 'قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ' میں ہے۔ اس سے پہلے قرآن میں ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنی قوم کے لیے یہ خطاب نہیں ملتا۔ اسی طرح مشرکین کا لفظ بھی اہل مکہ کے لیے بالکل ہجرت کے وقت یا اس کے بعد استعمال ہوا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اہل کتاب کو جو دعوت دی گئی وہ بھی "اے کافرو" اور "اے مشرکو" سے نہیں شروع ہوئی بلکہ "اے اہل کتاب" اور "اے لوگو" سے شروع ہوئی اور جب تک ان پر ان کے مسلمات کے تمام مقتضیات پوری طرح واضح نہیں کر دیے گئے اور نبی اور ایک صالح جماعت کی ایک طویل جدوجہد نے ان کے لیے حق کی توضیح اور اتمام حجت کا فرض ادا نہیں کر دیا اس وقت تک نہ ان کے کفر و شرک کا اعلان ہوا اور نہ ان سے جنگ و قتال کی نوبت آئی۔

بالکل یہی معاملہ منافقین کے ساتھ ہوا۔ یہ لوگ اسلام کے تمام اصولوں کے ظاہری طور پر ماننے والے تھے، اس لیے قرآن نے ان کو ہمیشہ "اے ایمان والو" کہہ کر خطاب کیا اور ان کے سامنے ایمان، اسلام، توحید اور ایمان بالرسالت کے مقتضیات کی تشریح فرمائی تاکہ جو لوگ غفلت اور جہالت کی وجہ سے غلطیاں کر رہے ہیں وہ متنبہ ہو جائیں۔ اس کے بعد ان کو دھمکی دی کہ جو لوگ اپنی شرارتوں اور بدعہدیوں سے باز نہ آئیں گے ان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا جائے گا۔ غزوہ بدر کے زمانہ سے لے کر غزوہ تبوک

تک ضعفائے قلوب اور منافقین کے بارہ میں یہی روش رہی۔ اس بیچ میں اگر کبھی پُرجوش مسلمانوں سے اس کا اندیشہ ہوا کہ وہ ان کے بارہ میں سختی کی روش اختیار کریں گے تو انہیں اس سے روکا گیا۔ قرآن اور احادیث دونوں میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ اس طرح جو لوگ متنبہ ہوگئے اور انہوں نے اپنے معاملہ کی اصلاح کرلی وہ مسلمان اور خادمِ اسلام سمجھے گئے۔ لیکن جو لوگ ان تنبیہات کے بعد بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے ان کا راز طشت ازبام کر دیا اور ان کے معاملہ کا فیصلہ کر دیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ جو اختیار فرمایا تو یہ محض نفسیاتِ تبلیغ و دعوت کی کوئی جھوٹی نمائش نہیں تھی، بلکہ یہ بات ایک نہایت اہم اصل پر مبنی ہے، جس سے لوگ بالعموم اس عہد میں ناواقف ہیں۔ ایک شے اگر کفر یا شرک یا نفاق ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مرتکب کافر یا مشرک یا منافق ہو جائے۔ ایک حرام شے کا کھانے والا لازماً حرام خور یا فاسق ہی نہیں ہو جاتا۔ ممکن ہے اس کو اس کی حرمت کا علم نہ ہو ممکن ہے اس کی حالت مجبوری اور اضطرار کی ہو، ممکن ہے وہ تاویل کی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ہو، ممکن ہے کوئی اور بات ہو۔ بالخصوص انبیاء کے فترہ کے زمانے میں ایک طویل مدت تک دعوتِ حق کا کاروبار معطل رہنے کی وجہ سے ایک ایسی اندھیاری چھا جاتی ہے کہ آنکھ والوں کو بھی راہ سوجھائی نہیں دیتی چہ جائے کہ عوام کالانعام۔ ایسے زمانوں کا فطری تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو نبی آتا ہے وہ کفر، شرک یا نفاق کے الگ چھتے لے کر نہیں آتا کہ جس اللہ کے بندے پر جو تختہ چسپاں ہو جائے، اس پر وہ تختہ چسپاں کرتا چلا جائے کہ تو کافر ہے، تو منافق ہے اور تو مشرک ہو گیا ہے۔ بلکہ وہ دینِ حق کے آثار اجاگر کرتا ہے۔ اٹے ہوئے نشاناتِ راہ کو نمایاں کرتا ہے، بند راہوں کو کھولتا ہے اور ایک مستقل جدوجہد، ایک مسلسل جہاد اور ایک پاک اور بے داغ زندگی کی بے لوث کارگزاریوں سے حق کو نورِ صبح کی طرح نمایاں کر دیتا ہے۔ اس جدوجہد سے قوم کے اندر

صالح الفطرت انسانوں کا عطر کھینچ کر علیحدہ ہو جاتا ہے اور ان کا امتیازی وجود حق کے حق ہونے اور باطل کے باطل ہونے کا ایک اور عملی ثبوت ہوتا ہے۔ اس وقت جن کے اندر شعورِ حق کی کچھ بھی صلاحیت ہوتی ہے وہ آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں کہ خدا کا راستہ یہ ہے اور اس پر چلنا ممکن بھی ہے تب ان لوگوں کے کفر کا فیصلہ ہو جاتا ہے جو اس راہ کو اختیار کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اس کے بعد ان کا فیصلہ کر دینے کے لیے یا تو اللہ کا عذاب نمودار ہوتا ہے یا اہلِ حق کی تلوار چمکتی ہے۔ حضرات انبیائے کرام کی زندگی سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔

آج جو لوگ تجدیدِ دین واحیائے سنت کے مبارک عزم کے ساتھ اٹھیں گے، وہ اسی طریقۂ نبوت سے رہنمائی حاصل کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس امت کو اب کسی نبی کی بعثت کا انتظار نہیں ہے۔ اس کے اندر اقامتِ دین وتجدیدِ دین کا شرعی نظام طریقۂ نبوی پر کام کرنے والی خلافت کا نظام ہے۔ یہی نظام تھا جو مسلمانوں کو وسطِ راہ پر قائم رکھتا اور پھر وہی خلقِ خدا پر اللہ کی حجت تمام کرتا ہے، لیکن یہ نظام ایک مدت سے درہم برہم ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ ایک طاغوتی نظام کا قبضہ وتسلط ہے۔ اس نظام نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو نجس کر دیا ہے۔ کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اس طاغوت کی ماتحتی سے آزاد ہو۔ ہمارے اندر سے جو لوگ طوعاً اس کی اطاعت کر رہے ہیں انہیں کرہاً اس کی اطاعت کرنی پڑ رہی ہے۔ متقی سے متقی انسان کا دامن بھی اس کی نجاست کے چھینٹوں سے پاک نہیں ہے۔ دینی تعلیم و تربیت کا سارا نظام معطل ہے، جو موجود ہے وہ بھی نظامِ غالب کی سطوت سے اسی کا خادم وچاکر ہے۔ قلم وزبان کلمۂ حق کے سوا ہر خرافات کے لیے آزاد ہے۔ دین و مذہب کے نام سے آج جو لکھا یا سنایا جا رہا ہے اس کا بڑا حصہ موجودہ سوسائٹی اور موجودہ نظامِ جاہلی کے لیے مذہب کی طرف سے ایک لائسنس ہے۔

ایسے پُرآشوب و پُرفتن عہد میں اگر مسلمان دین اور اس کے لوازم، توحید اور اس کے مقتضیات سے ناآشنا ہوجائیں تو کچھ بعید نہیں ہے۔ ایک چمن اگر مالیوں کی نگہداشت سے محروم ہوگیا ہو یا جو اس کے مالی ہوں ایک مدت سے اس کی صفائی، اس کے درختوں کی کانٹ چھانٹ، اس کی خودرَو گھاسوں کے استیصال، اس کے ننھے پودوں کی دیکھ بھال کے بجائے جنگلی گھاسوں اور درختوں ہی کو چمن کے اصلی پودے سمجھ کر انہی کو پانی دینے اور انہی کی تربیت کرنے لگ گئے ہوں تو اس چمن کا جنگل بن جانا ایک قدرتی بات ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی صحیح مثال یہی ہے۔ وہ ایک قدرتی فرض ہے جو ایک کسان اپنے کھیت میں ایک مالی اپنے چمن میں، ایک باغبان اپنے باغ میں، ایک داعی اپنے گلہ میں، ایک ہادی اپنی قوم میں، ایک امت کے اربابِ حل و عقد اس امت کے اندر انجام دیتے ہیں، اور نظامِ خلافت اسی فرض کی ادائیگی کے لیے ایک قدرتی اور فطری نظام ہے۔ اس کے بغیر نہ مسلمانوں کا صحیح نہج پر قائم رہنا ممکن ہے اور نہ اس کے بغیر دنیا پر دین کی حجت تمام ہوسکتی ہے۔ پس آج نہ مسلمانوں کا صراطِ مستقیم سے انحراف قابلِ ملامت ہے، نہ خلقِ خدا کی ضلالت قابلِ سرزنش ہے۔ مسلمان اس سرزمین کے لیے نمک تھے۔ جب ان کی نمکینی خود جاتی رہی تو اب کوئی چیز نمکین کس چیز سے بنائی جائے گی۔

پس آج جو جماعت مسلمانوں میں توحید اور اس کے مقتضیات کی دعوت کے لیے اٹھے وہ انتہائی حد تک بے رحم ہوگی اگر وہ یہ فرض کرکے اٹھے کہ یہ سارے کے سارے مسلمان کافر و بے دین ہوچکے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرے گی تو اپنے اس طرزِ عمل سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچائے گی کہ نہ اسے حالات کا صحیح اندازہ ہے اور نہ انبیائے کرام کے طریقِ دعوت سے اسے کوئی مس ہے۔ کسی کے کفر و فسق کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ کتابِ الٰہی کی اچھی طرح وضاحت کرے، ایک

صالح جماعت کے قیام کے لیے اپنی پوری جدوجہد صرف کردے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس ظلمت کو دور کردے جو ہر طرف چھائی ہوئی ہے اور حق وباطل کا امتیاز ہر طالبِ حق کے لیے آسان ہو جائے۔

تکفیر کا اصل مفہوم تو یہ ہے کہ کسی شخص کو مرتد قرار دے کر اس کو وہ سزا دی جائے جو اسلام میں ارتداد کے لیے مقرر ہے۔ یہ سزا ایک صالح اور بااختیار جماعت اپنے اندر کے ان افراد کو دیتی ہے جو اس دعوت اور اس کے نظام کے بنیادی اصولوں سے علانیہ اور دیدہ و دانستہ بغاوت کرتے ہیں۔ اس سزا کے نفاذ کے لیے شرط ہے کہ ایک جماعت موجود ہو جو صالح ہو۔ ایک غیر صالح جماعت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کو غیر صالح قرار دے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ جماعت بااختیار ہو۔ کوئی بے اختیار جماعت تعزیرات وحدود کے اجرا کا حق نہیں رکھتی۔ تیسری شرط یہ ہے کہ ایک صالح جماعت کے قیام سے ماحول ایسا بن چکا ہو کہ وہ منکرات و معاصی کے لیے سازگار نہ رہ گیا ہو اور خدا کے بندوں پر دین کی حجت تمام کرنے اور حق کی توضیح کے ضروری وسائل برسرِکار ہوں۔ بغیر اس کے نہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جا سکتی ہے، نہ زانی کو سنگسار کیا جا سکتا ہے۔ نہ شراب پینے والے کو کوڑے مارے جا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ایک صالح و بااختیار جماعت برسرِاقتدار بھی ہو اور وقت کی مذہبی فضا بھی ایسی ہو کہ جرائم کے لیے اخلاقی رکاوٹیں موجود ہوں، لیکن کسی عارضی سبب سے جرم کے محرکات پیدا ہو جائیں، تو اس جرم کی شرعی سزا حکومت جاری نہیں کرے گی۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑ گیا اور آپ کی انتہائی کوشش کے باوجود ملک کا معاشی توازن قائم نہیں رہ سکا تو آپ نے حالات کی درستگی تک کے لیے چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ملتوی کردی۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے عہد میں ایک عورت زنا کے جرم میں پکڑ کر لائی گئی۔

علمائے یہود نے اس کو سنگسار کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ حضرت نے فرمایا۔ ہاں، اس کو سنگسار کر دو، مگر اس کو وہ شخص پتھر مارے جو خود پاک ہو۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس عہد میں سب زانی ہی زانی ہیں۔ کوئی عفیف اور پاک دامن نہیں رہ گیا ہے، بلکہ ان کا اشارہ وقت کی فضا کی طرف تھا کہ اس وقت، نہ کوئی صالح جماعت موجود ہے، نہ صالح نظام قائم ہے، نہ شرعی ماحول ہے۔ اگر یہ عورت اپنے شوہر سے خیانت کی گنہگار ہے تو تم میں سے کون ہے جو اس سے بڑے گناہ، یعنی اپنے خدا سے خیانت اور بے وفائی کا مجرم نہیں ہے۔ تم نے خدا کے عہد کو توڑا ہے۔ اور اس جرم کی سزا میں خدا نے مشرک رومیوں کو تم پر مسلط کر دیا ہے تو تمہیں یہ حق کب پہنچتا ہے کہ ایک عورت کو اس کی بے وفائی پر سزا دو۔

پس تکفیر جو ایک سخت ترین سزا ہے، جس کے بعد ایک شخص جماعت سے ہمیشہ کے لیے کٹ جاتا ہے، جس کے بعد وہ واجب القتل مرتد ہو جاتا ہے، اس زمانہ میں کسی کو دینا اصولاً غلط ہے۔ اس وقت نہ تو کوئی صالح و باا ختیار جماعت ہی موجود ہے اور نہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وہ شرعی نظام ہی قائم و زندہ ہے جو لوگوں کے اندر کفر و شرک کا احساس و امتیاز زندہ رکھے۔ زندگی کے ہر شعبہ پر طاغوت کی سیاہی چھائی ہوئی ہے اور حق و باطل میں نہ صرف امتیاز معدوم ہے، بلکہ باطل کو حق بنا کر چمکانے کی سعی کے لحاظ سے شاید یہ تاریخ کا سب سے کامیاب دور ہے۔ ایسے زمانہ میں جو لوگ تکفیر و تفسیق کے کھیل کھیل رہے ہیں وہ وقت کی حالت، تکفیر کی اہمیت اور اس کے شرائط و قواعد سے بالکل بے خبر ہیں اور موجودہ دور جہل و فساد کی قدرتی پیداوار ہیں۔ اپنے جن بندوں کو اللہ تعالیٰ نے صحیح کام کی طرف توجہ کرنے کی توفیق و ہمت بخشی ہے وہ مسلمانوں کی تکفیر کی فکر میں نہیں ہیں۔ ان کی دعوت کا نقطۂ آغاز: "اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، حقیقی ایمان لاؤ" ہے۔

جہاں سب ایک گندے حوض کے اندر گرے ہوئے ہوں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو نجس قرار دے اور اس کو سزا کا مستحق سمجھے۔ صرف گندگی کو گندگی بتلانے اور اس سے باہر نکلنے کی جدوجہد کے لیے دعوت دینے کا حق ہے اور یہ کام جاری رہنا چاہیے، تاآنکہ مسلمانوں کو جو ہندوستان کو ایک دارالامن سمجھ کر چین کی نیند سو رہے ہیں، محسوس ہو جائے کہ یہ دارالامن نہیں ہے، بلکہ ایک ایسا مکان ہے جس میں دھواں ہی دھواں بھرا ہوا ہے، یا ایک سنڈاس ہے جس کے اندر بدبو سے سانس لینا دشوار ہے۔ ع

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

انسان کی فطرت میں شرک نہیں ہے، جیسا کہ ہم آئندہ باب میں بیان کریں گے، اور مسلمان تو شرک کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ فطرت جو وقت کی تاریکیوں اور ریگانوں دبے گانوں کی تھپکیوں اور ان کے انجکشنوں کے اثر سے ماؤف ہو کر سو رہی ہے بیدار نہ ہو جائے اور انسان خدا کی سچی بندگی کی لذت سے پھر آشنا نہ ہو جائے۔

باب ۹

کیا شرک تقاضائے فطرت ہے

اس زمانہ میں ہر علم و فن کی تحقیق میں اصل رہنما نظریۂ ارتقاء خیال کیا جاتا ہے۔ تاریخ ہو یا قانون، معاشیات ہو یا سیاسیات، فلسفہ و مذہب ہو یا علم عمران و تمدن ہر ایک کی ابتدائی کڑیوں کی تلاش کا شوق اس عہد کے ذوق پر اس درجہ غالب ہے کہ اس کے بغیر ہر علم ادھورا اور ناقص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہر علم و فن کا مدون سرمایہ، جو پوری روشنی میں موجود ہے، اپنی صحیح قدر و قیمت بتانے کے لیے نہ صرف ناکافی سمجھا جاتا ہے، بلکہ اکثر حالات میں وہ بالکل غلط اور مہمل قرار دے دیا گیا ہے۔ آج اصل شے یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اس عہد میں تحقیق کی جائے جب انسان بالکل حالتِ طفولیت میں تھا اور جس کی کوئی لکھی ہوئی تاریخ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عہد ایک عہدِ ظلمت ہے۔ اس کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے گا اس کی حیثیت رجماً بالغیب باتوں اور اٹکل کے تیر تکوں سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس ظلمات میں خضرِ راہ آرکیالوجی (علم الآثار) اور بیالوجی (علم الحیات) کے ماہرین سمجھے جاتے ہیں جو زمین کے طبقات، چٹانوں کے پرت، غاروں کے اندر کے آثار و علامات، گڑی ہوئی ہڈیوں، ابتدائی زمانہ کے آلات و اوزار اور قدیم انسان کے کھینچے ہوئے آڑے ترچھے نقوش کو علم کا اصلی سرمایہ قرار دیتے ہیں اور اس پر ظن و تخمین کی عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔

اس بات کا اعتراف سب کو ہے کہ اس کی حیثیت ظن و تخمین (GUESS WORK) سے زیادہ نہیں ہے، تاہم اس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ ہر علم و فن میں وہی حقیقت ہے

جوان مظنونات سے ہم آہنگ ہو جائے جو بات ان سے میل نہ پیدا کر سکے وہ بے اصل اور ارتقاء کی راہ میں گویا ایک غیر فطری بیرونی مداخلت ہے، جس کا وجود نہیں بلکہ عدم مطلوب ہے۔

اس خیال کے غلبہ کا اثر یہ ہوا ہے کہ ایک عرصے سے دنیا میں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے جتنے دعوے ابھرے ہیں ان میں سے ہر ایک کو نظریۂ ارتقاء کا سہارا لینا پڑا ہے۔ اور یہ اتنا مرنجاں مرنج واقع ہوا ہے کہ سب کے ساتھ اس کی سازگاری رہی ہے جمہوریت کے حامیوں نے انسان کی ابتدائی زندگی کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے کہ جمہوریت ہی کو انسان کا فطری تقاضا ثابت کر دیا ہے۔ ملوکیت کے ہمدردوں نے اس کی تقریر اپنے رنگ میں کروائی ہے۔ نراج کے علمبرداروں نے اس کی تصویر اپنے رنگ میں کھینچی ہے اشتراکیت نے اس کو اپنے رنگ میں پیش کیا ہے۔ البتہ غریب مذہب اس کو اپنی حمایت میں نہیں استعمال کر سکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ کلیسا سے پہلے ہی مرحلہ میں اس نظریہ کے علمبرداروں سے ان بن ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے شاطر حامیوں نے شروع ہی سے اس کو ایک مخالف مذہب نظریہ کی شکل دے دی تاکہ اس کو ان مذاہب کی حمایت میں نہ استعمال کیا جا سکے جو اپنی مخصوص انفرادیت کے مدعی ہیں اور جو اپنے عقائد و مسلمات کی بنیاد وحی پر قرار دیتے ہیں اور دوسرے مذاہب کے ساتھ کسی رواداری کے لیے تیار نہیں ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کی آڑ میں ملاحدہ نے یہودیت، مسیحیت اور اسلام کی جڑ اکھاڑنے کی پوری کوشش کی اور اس مقصد کے لیے مذہب کے ارتقاء کو انہوں نے اس طرح پیش کیا ہے جس سے آسمانی مذاہب کے تمام مسلمات ڈھے جاتے ہیں۔

یہاں ہم کو نظریۂ ارتقاء کی تمام تفصیلات سے بحث کرنے کا موقع نہیں ہے۔ البتہ ہم اس کے اتنے حصہ سے تعرض کریں گے جس کا تعلق شرک و توحید سے ہے۔

یہ لوگ مذہب کے ارتقاء کی تقریریوں کرتے ہیں کہ مذہب نے انسان کے آدین

نقشِ قدم کے ساتھ قدم رکھا۔ جس وقت انسان نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ مجرد ایک جسم نہیں ہے۔ بلکہ اپنے اندر اس سے ایک برتر عنصر، روح بھی رکھتا ہے اسی وقت مذہب کی پہلی بنیادی اینٹ رکھ دی گئی۔ اس کی ابتدائی تشکیل دو عنصروں سے ہوئی: ایک جذبۂ خوف، دوسرا تصور۔ خوف اُن دیکھی قوتوں کا جن کے اندر انسان نے اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس کیا اور جن کو زور و قوت میں اپنے سے کہیں بڑھ چڑھ کر پایا اور تصور اس بات کا کہ اس کی تعظیم اور بندگی کرنی چاہیے۔

جس طرح ان تمام چیزوں کی تاریخ جو جسم و جسمانیات سے تعلق رکھتی ہیں زندگی کے اس ابتدائی ذرہ سے وابستہ ہے جس نے مادہ کو زندگی کی حرکت بخشی ہے اسی طرح ان تمام چیزوں کی تاریخ جو روح و روحانیات سے وابستہ ہیں، اس ذرۂ روح سے متعلق ہے جس کے جذبۂ خوف اور تصور کے باہمی تفاعل سے مذہب وجود میں آیا ہے۔ اس مذہبی تصور نے جب مذہبی عمل کی صورتیں اختیار کیں تو اس کے نتیجے کے طور پر مذہب کے فرائض اور اس کے رسوم و مناسک وجود میں آئے۔ پس مذہب ایک عملِ ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ وہ زندگی کا ارتقاء تھا یہ روح کا ارتقاء ہے' اور جس طرح یہ بات معلوم ہے کہ زندگی ایک زمانہ میں رینگنے والے جانوروں کی شکلوں (REPTILIOUS LIFE FORM) میں چھپی ہوئی تھی اور درجہ بدرجہ انسان کی احسنِ تقویم میں بے نقاب ہوئی اسی طرح روح ابتدا میں مظاہر پرستی، اشیاء پرستی اور سحر و ساحری کی زنجیروں میں گرفتار تھی اور آہستہ آہستہ خالص خدا پرستی تک پہنچی۔

اس تقریر سے جو نتائج علمائے ارتقاء نکالتے ہیں وہ بھی ہم اپنے لفظوں میں بیان کیے دیتے ہیں:

۱۔ مذہب کا نقطۂ آغاز خوف کا جذبہ ہے۔ یہ خوف مظاہرِ قدرت سے پیدا ہوا۔ بادلوں کی گرج، بجلی کی کڑک، آندھیوں کے شور، آتش فشاں پہاڑوں کے ہولناک نظارں نے انسان کو ڈرایا اور وہ ان کو زندہ قوتیں سمجھ کر ان کی آفتوں سے اپنے آپ کو

بچانے کے لیے ان کی عبادت کرنے لگا۔

۲۔ خالص خدا پرستی کے تقاضائے فطرت ہونے کا دعویٰ غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انسان خدا پرستی کی جگہ مظاہر پرستی اور اشیاء پرستی وغیرہ سے مذہب کا آغاز نہ کرتا اور نہ دنیا میں بت پرستی اور مردہ پرستی کی یہ کثرت ہوتی جو ہم تاریخ میں دیکھ رہے ہیں۔

۳۔ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے۔ اس پہلو سے اسلام اور یہودیت اور افریقہ کے وحشیوں کی سحر پرستی (VOODOO WORSHIP) میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لیے تمام مذاہب اور تمام عقائد مختلفہ میں رواداری کو اصل الاصول ہونا چاہیے۔

اوپر کی تقریر اس قدر دل کش تھی کہ اس نے ہمارے حال کے بعض علمائے دین کی کتابوں میں بھی جگہ پالی ہے، حالانکہ ہے یہ بالکل مہمل اور غلط۔ عقل و نقل دونوں اس کے خلاف ہیں۔

یہ بات کہ مذہب کا آغاز ان دیکھی قوتوں کے خوف سے ہوا ہے اور یہی جذبہ انسان کے جذبات میں اوّلین اور قدیم ترین ہے بالکل بے سر و پا ہے۔ انسان میں جو خوف پایا جاتا ہے اس کی اصل حقیقت زوالِ نعمت کا اندیشہ ہے۔ انسان کو اپنی زندگی عزیز ہے، زندگی کا سروسامان عزیز ہے، اپنے بیوی بچے عزیز ہیں، اس لیے وہ ان چیزوں کی طرف سے اندیشہ میں ہوتا ہے کہ کہیں یہ چیزیں اس سے چھن نہ جائیں۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ ان چیزوں کے بارہ میں خوف و اندیشہ میں مبتلا ہونے سے پہلے وہ ان چیزوں کے نعمت ہونے کا شعور رکھتا ہے اور پھر اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ ان نعمتوں کی وجہ سے اس کو ایک منعم کا بھی شعور ہوا ہوگا اور پھر لازماً اس کے لیے شکر گزاری کا جذبہ اور عبادت کا تصور بھی پیدا ہوا ہوگا۔ اس لیے خوف سے پہلے نعمت اور منعم کا شعور ناگزیر ہے۔ جب تک ہمیں زندگی اور اس کے اسباب و وسائل کے نعمت ہونے کا احساس نہ ہو، اس وقت تک ہمیں زندگی کے متعلق کوئی خوف نہیں ہوتا۔ چنانچہ

جو لوگ اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں وہ موت جیسی خوفناک چیز سے ذرا بھی نہیں ڈرتے۔ کتنے آدمی آگ میں کود پڑتے ہیں۔ کتنے دریاؤں اور سمندروں میں ڈوب مرتے ہیں۔ جاپان میں کتنے ہیں جو آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں میں چھلانگ لگا کے ختم ہو جاتے ہیں۔

پس اگر ابتدائی انسان کو بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج اور طوفانوں کے شور سے کوئی خطرہ محسوس ہوا اور اسے اپنے آپ کو ان کے خطرات سے بچانے کی فکر لاحق ہوئی تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اسے زندگی اور زندگی کے اسباب و وسائل کے نعمت ہونے کا شعور تھا۔ کیونکہ جب تک کوئی شے عزیز نہ ہو اس کی حفاظت کی فکر بالکل بے معنی ہے۔ خالی گھر میں کوئی بھی قفل نہیں لگایا کرتا اور پھر اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اسے ایک منعم کا بھی شعور تھا، کیونکہ نعمت کا وجود ایک منعم کے شعور کو مستلزم ہے اور اگر یہ بات صحیح ہے کہ وہ قدرت کے ان مظاہر کی اس ڈر سے عبادت کرنے لگا کہ وہ اس سے زندگی کی نعمت یا اس کے اسباب کہیں چھین نہ لیں تو اس سے زیادہ صحیح یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان نعمتوں کے شعور نے اس کے اندر اپنے منعم کے لیے محبت اور شکر گزاری کا جذبہ بھی پیدا کیا ہوگا۔ پس ثابت ہوا کہ ایک منعم کا شعور، اس کی محبت اور شکر گزاری کا جذبہ اور اس کی عبادت کا تصور خوف کے جذبہ اور مظاہرِ قدرت کی عبادت کے تصور پر مقدم ہے۔

بہرحال انسان نے جب سے خوف کا احساس کیا ہے اس سے پہلے زندگی کے نعمت ہونے اور ایک منعم کا اور اس کی محبت کا احساس کیا ہے اور جس وقت اس کے تصور نے اس کو ورغلایا کہ وہ ان مظاہرِ قدرت کی عبادت کرے یقیناً اس سے پہلے جذبۂ محبت سے ایک تصور نے ابھر کر اسے اکسایا ہوگا کہ وہ اپنے منعم کا شکر ادا کرے۔

اور محبت اور شکر گزاری کا یہ جذبہ و تصور توحید اور خالص خدا پرستی کی بنیاد رکھتا ہے، نہ کہ شرک کی۔ چنانچہ یہی راز ہے کہ قرآن مجید نے حمد و شکر کو انسان کی اوّلین صدائے فطرت بتایا ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔" (الفاتحۃ-۱:۱-۲)

(شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے، کائنات کا رب، رحمان اور رحیم)۔

ہمارے اس نظریہ کی تائید اس امر واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جو چیزیں انسان کے اندر خوف کی حالت پیدا کرتی ہیں وہ دنیا کے عامۃ الورود واقعات میں سے نہیں ہیں زلزلے روز نہیں آیا کرتے، آتش فشاں پہاڑ روز نہیں پھٹتے، بجلیاں روز نہیں کڑکتیں اور طوفانوں کا شور بھی کوئی روزمرہ کا واقعہ نہیں ہے۔ برعکس اس کے تارے روز چھٹکتے ہیں، سورج روز چمکتا ہے، آسمان کی نیلگونی ہر لمحہ باصرہ نوازی کرتی ہے، چاند روپہلی چاندنی کی چادر دشت وجبل میں روز بچھاتا ہے، ابرِ کرم کی تر دستیاں اور درختوں کی ثمر باریاں ہر موسم میں موجود ہیں۔ پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مظاہرِ قدرت کی گاہ گاہ کی گھرکیاں اور دھمکیاں تو انسان کو اس درجہ مرعوب کر دیں کہ وہ ان کی پوجا کرنے لگ جائے لیکن منعمِ غیب کی یہ ساری فیاضیاں بالکل بے اثر رہ جائیں اور انسان میں شکر و سپاس کا کوئی ولولہ نہ پیدا کریں!

بیالوجی کے علماء نے اس زمانہ کی دنیا کی تصویر بہت بھیانک کھینچی ہے اور یہ دکھانا چاہا ہے کہ اس وقت کے قدرتی مظاہر خوف ہی کے جذبہ کا باعث ہو سکتے تھے لیکن یہ ایک صریحی مغالطہ ہے۔ اس زمانہ کی دنیا اگر بہت بھیانک تھی تو ظاہر ہے کہ اس زمانہ کا انسان بھی آج کا انسان نہ تھا۔ اگر اس وقت یہ کائنات اتنی حسین نہ تھی جتنی اب ہے تو اس وقت کا انسان اتنا جمال پرست بھی نہ تھا جتنا کہ اب ہے۔ اگر اس وقت یہ زمین آج کی طرح زرخیز و معمور نہ تھی تو اس وقت کا انسان بھی آج کی طرح عشرت پسند اور تعیش پسند نہیں ہوا تھا۔ اگر اس وقت خطرے اور تکلیفیں بہت تھیں تو آج کے انسان کی طرح اس عہد کا انسان نازک بدن اور تن آسان بھی نہ تھا۔ وہ ہر خطرہ سے بچاؤ کے لیے کوسوں بھاگ سکتا تھا، گلہریوں اور بندریوں کی سی چستی کے ساتھ درختوں پر چڑھ سکتا تھا، آگ جلا کر اور پتے سی کر اپنے جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیف

سے بچ سکتا تھا۔ برف باری اور درندوں کی آفتوں سے بچنے کے لیے غاروں میں چھپ سکتا تھا، بھوک میں ہر طرح کے جانداروں کے شکار سے اپنا پیٹ بھر سکتا تھا۔ اس لیے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اس وقت کے حالات خوف ہی کے جذبہ کی نشوونما کے لیے سازگار تھے۔ اس میں حاضر کو ماضی میں داخل کر دینے کا مغالطہ چھپا ہوا ہے۔ زمانہ تو قدیم ترین دورِ حجری سے بھی پہلے کا فرض کر لیا گیا ہے اور انسان اس کے اندر اسی بیسویں صدی کا فرض کیا گیا ہے۔

بعض علمائے ارتقاء نے خاندان کے بڑے بوڑھے کے خوف کو انسان کے تمام ابتدائی تصورات (EARLY THOUGHTS) کی اصل قرار دیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک خاندان کے بزرگ کا یہ خوف بھی محبت ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ بچوں کو تمام لذتیں اور تمام راحتیں ماں باپ سے حاصل ہوتی ہیں، اس وجہ سے وہ ان سے محبت کرنے لگتے ہیں اور اس محبت ہی کی وجہ سے ان سے ڈرنے بھی لگتے ہیں۔ پس یہ جذبہ بھی اپنی اصل کے لحاظ سے محبت ہی کا جذبہ ہے اور اس سے بلاشبہ ماں باپ کی تعظیم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت نظرانداز نہیں کرنی چاہیے کہ بچہ جب تک بچہ رہتا ہے اس وقت تک تو بلاشبہ ساری کائنات باپ ہی کو سمجھتا ہے، لیکن جوں ہی وہ خود باپ بنتا ہے یا باپ بننے کے قابل ہو جاتا ہے اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ باپ کا وجود صرف ایک حد تک ہی اس کی لذتوں اور راحتوں کا کفیل ہے۔ اس حد سے باہر قدم رکھنے کے بعد جو کچھ اسے حاصل ہوا ہے اس کا سرچشمہ کوئی اور ہی ان دیکھی ہستی ہے۔ یہاں تک کہ خود باپ کا وجود بھی اسے اس ان دیکھی ہستی کی بے پایاں بخشائشوں میں سے ایک بخشش معلوم ہونے لگتا ہے۔ پس جس جذبۂ محبت نے اس کے اندر باپ سے محبت، تعظیم، اور خوف کی وابستگی پیدا کی ہوگی لازماً اسی جذبہ نے بچپنے کے حدود سے نکلنے کے بعد اس کے اندر ایک ان دیکھی ہستی

کے ساتھ محبت اور تعظیم اور خوف کی وابستگی بھی پیدا کی ہوگی۔ اگر انسان ہمیشہ دورِ طفولیت ہی میں رہتا تب تو مذہب بلاشبہ پدر پرستی ہی پر ختم ہوجاتا۔ لیکن بچہ سیانا بھی ہوتا ہے اور مذہب سیانوں ہی کی ایجاد ہوسکتا ہے تو سیانوں کے اندر اگر باپ کے احسانات کی وجہ سے اس کی تعظیم اور اس کے وقار و احترام کا تصور پیدا ہوسکتا تھا تو اس سے بدرجہا اقرب ہے کہ ان عظیم احسانات کا اثر بھی اسی جذبہ و تصور کی شکل میں ظاہر ہو جن میں باپ کو کوئی دخل نہیں تھا، لیکن وہ موجود تھے اور باپ سے کہیں بڑھ کر کسی مہرو محبت والی ہستی ہی کے ہوسکتے تھے [1]

بہرشکل مذہب کا آغاز خوف کے جذبہ سے نہیں ہوا ہے بلکہ محبت کے جذبہ سے ہوا ہے۔ علمائے ارتقاء کے مذکورہ بالا دونوں نظریے باطل ہیں۔ پہلی صورت میں ایک مُنعمِ حقیقی کے شکر و محبت کا جذبہ اور اس کی عبادت کا تصور مقدم ہے اور غیر اللہ کے خوف کے جذبہ اور اس کی پرستش کا تصور ایک غیر فطری عارض کی طرح انسان کو محض سوء فہم اور اپنی فطرت کی صحیح آواز سے غفلت کی وجہ سے لاحق ہوگیا ہے اور دوسری صورت میں ہونا یہ چاہیے کہ انسان باپ کی محبت کا ہاتھ پکڑ کر خدا تک پہنچ جائے۔ اس کے اس جذبہ کا فطری ارتقاء اگر کوئی ہوسکتا ہے تو صرف یہی ہوسکتا ہے کہ وہ

---

[1] مذہب کی اصل کے متعلق علمائے ارتقاء کے ہاں مقبولِ عام نظریے یہی دو ہیں اور انہی دونوں کو نسبتاً علمی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے بھی انہی دونوں سے تعرض کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بعض نظریات ہیں، مثلاً بعضوں نے مذہب کا نقطۂ آغاز ٹوٹمیت (TOTEMISM) کو قرار دیا ہے۔ بعضوں نے اس کی اصل اوّل اوّل انسان پر کسی نشیلی چیز کے استعمال کے وجد انگیز اثر کو قرار دیا ہے۔ بعضوں نے اس کی بنیاد جنسی خواہشوں پر رکھی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ خرافات محتاجِ تردید نہیں ہیں۔

باپ سے مستغنی ہونے کے ساتھ ہی مجازی باپ سے حقیقی خالق تک پہنچ جائے اور اس کے ساتھ باپ سے زیادہ محبت کرے اور باپ سے زیادہ اس کی تعظیم بجا لائے ۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کر سکا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ارتقار کی اصلی شاہراہ پر مارچ کرنے کے بجائے کسی اندھی گلی (BLIND ALLEY) میں جا پڑا اور یہ روحانی ارتقاء میں اسی طرح کا غیر فطری جمود ہے جس طرح کے غیر فطری جمود کی مثالیں ہمیں مادی زندگی کے ارتقاء میں ملتی ہیں ۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ قدیم ترین جذبہ والدین کی محبت کا جذبہ اور قدیم ترین تصور والدین کی تعظیم کا تصور ہے ۔ لیکن یہ جذبہ جیسا کہ واضح ہوا ، بچہ کو بلوغ کے بعد خدا کی طرف لے جاتا ہے ، نہ کہ آبا پرستی اور قبائلی دیوتاؤں کی طرف ۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن اور تورات میں خدا کی عبادت اور والدین کے ساتھ احسان کا حکم ساتھ ساتھ ہوا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی فطرت میں خدا اور والدین کے حقوق کا شعور قدیم ترین ہے اور اگرچہ شعور میں والدین کا حق پہلے آتا ہے ، لیکن درجہ میں خدا کا حق والدین کے حق پر مقدم ہو جاتا ہے ۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے بالاخانہ پر چڑھنے سے پہلے زینہ اوپر ہوتا ہے ، لیکن اس پر پہنچ جانے کے بعد زینہ نیچے ہو جاتا ہے ۔ خدا تک پہنچ جانے کے بعد انسان پر یہ راز کھلتا ہے کہ والدین بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہیں ، ان کو پوجنا تو درکنار اس نعمت کے ملنے پر بھی خدا ہی کا شکر واجب ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے والدین کے لیے بیٹے پر تمام حقوق تسلیم کیے ، لیکن ان کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ بیٹے سے شرک کرائیں :

وَ اِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا (لقمٰن - ۳۱ : ۱۵) (اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا ، جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں ، تو ان کی بات نہ مانیو) ۔

اس کا سبب یہ ہے کہ فطرت کے اندر جو داعیہ حقوقِ والدین کے احترام اور ان کی محبت

تعظیم کے لیے موجود ہے اس سے قوی تر داعیہ اللہ اور اس کے حقوق کے احترام اور اس کی محبت کے لیے موجود ہے۔ پھر والدین کو یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ جس جذبہ و تصور سے وہ ایک چیز پاتے ہیں بعینہٖ اسی جذبہ و تصور کے اس سے قوی تر مقتضی کا خدا کے بارہ میں وہ اپنی اولاد سے انکار کرائیں۔

بعض لوگوں کو یہاں ایک شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں جگہ جگہ اہل ایمان کی تعریف میں تقویٰ، خشیت اور خوف کا ذکر آیا ہے۔ اس سے علمائے ارتقاء کی اس بات کی تائید نکلتی ہے کہ مذہب کا نقطۂ آغاز خوف کا جذبہ ہے لیکن یہ شبہ بالکل بے بنیاد ہے۔ اسلام میں وہ خوف و خشیت معتبر نہیں ہے۔ جس کی بنیاد مجرد ضرر رسانی کے اندیشہ پر ہو۔ اس طرح کا خوف چنگیز، تیمور، شیر، ہاتھی، سانپ، بچھو ہر ایک چیز سے ہو سکتا ہے۔ اس طرح کا خوف اگر خدا سے ہو تو اس کی کیا وقعت ہے؟ مذہب میں جو خوف و تقویٰ مطلوب و محبوب ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس خوف و تقویٰ کی بنیاد محبت پر ہوتی ہے۔ یہ مجرد خدا کے قہر و غضب کے تصور سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے بے پایاں افضال و عنایات کے تصور اور اس کے اسمائے حسنیٰ کے تذکرے سے پیدا ہوتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس کی اعلیٰ صفتوں کو سب سے زیادہ جانتے ہیں وہی لوگ اس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور جو اس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہی اس سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں: إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَٰؤُا (فاطر - ۳۵ : ۲۸) (اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈریں گے جو علم رکھنے والے ہیں)۔

ہماری اس بحث سے علمائے ارتقاء کے نظریہ کی تو پوری تردید ہو گئی کہ مذہب کا آغاز خوف کے جذبہ اور مظاہر پرستی سے ہوا ہے، لیکن ایک شبہ یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کی فطرت خالص خدا پرستی ہے اور اس کے ارتقاء کا اصلی رخ یہی ہے تو

اس کی کیا وجہ ہے کہ دنیا میں کثرت سے شہادت بت پرستی اور مردہ پرستی وغیرہ ہی کی ملتی ہے؟ تاریخ کے عہدِ ظلمت کے آثار و قرائن بھی اسی بات کی گواہی دیتے ہیں اور جس عہد کا مدون سرمایہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اس کی شہادت بھی یہی ہے۔ نصاریٰ پر پوری چھ صدیاں بھی نہ گزرنے پائیں کہ ان میں تصویر پرستی رائج ہو گئی، حالانکہ تورات میں اس کی سخت ممانعت تھی۔ یہود، باوجودیکہ تورات کا پہلا حکم توحید تھا، بارہا کھلم کھلا بت پرستی میں مبتلا ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض توحید کے لیے وطن چھوڑا اور ایک سنسان جگہ میں اللہ واحد کی عبادت کے لیے ایک گھر بنایا، لیکن انہی کی اولاد نے بہت مدت نہیں گزری کہ اس گھر میں بتوں کو لا بسایا۔ جبکہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ خالص توحید ہی انسان کی فطرت ہے لیکن واقعات کی شہادت اس کے خلاف ہے تو اس کا جواب دینا ضروری ہے۔ اسی جواب سے علمائے ارتقاء کے اس دوسرے نتیجۂ بحث کی تردید ہوگی جو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔

یہ بات کہ دنیا میں ابتداء سے کثرت بت پرستی اور شرک ہی کی رہی ہے اور اب تک ہے، اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ شرک و بت پرستی انسان کی فطرت ہے۔ آدمی کا بچہ جب تک بچہ رہتا ہے سامنے کی ہر چیز بلا امتیاز اس کے کہ وہ اینٹ ہے یا پتھر، لکڑی ہے یا لوہا، پاک ہے یا ناپاک، منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ ماں کی چھاتی ہی ہے۔ کچھ دیر تک اس کو چوستا ہے، پھر کوئی دوسری چیز اٹھا لیتا ہے، پھر کوئی تیسری چیز اٹھا لیتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ یہ ساری چیزیں بچہ کو فطرۃً مطلوب ہیں محض حماقت ہے۔ بچے کی فطری غذا تو ماں کی چھاتی کے اندر ہوتی ہے، لیکن چونکہ اس کو ابھی پورا پورا امتیاز نہیں ہوتا ہے اس وجہ سے وہ ہر چیز کو ماں کی چھاتی ہی خیال کرنے لگتا ہے۔ پس اگر انسان اپنے عہدِ طفولیت میں بت پرستی اور مظاہر پرستی وغیرہ کی نجاستوں میں آلودہ رہا تو اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ یہی اس کی فطرت کا تقاضا تھا، بلکہ درحقیقت

اس کی یہ ساری پریشانی و سرگردانی معبودِ حقیقی کی تلاش میں تھی۔ اسی کی طلب نے اس تمام کوچوں کی خاک چھنوائی۔ بچے کی یہ خصوصیت بھی قابلِ لحاظ ہے کہ بسا اوقات ماں کو پکارتی بھی ہے، لیکن وہ جس چیز میں مشغول ہوتا ہے اسی میں مشغول رہتا ہے، تا آنکہ ماں اسے گود میں نہ اٹھالے اور اپنی چھاتی اس کے منہ سے نہ لگا دے۔ پھر جوں ہی اس کو سینہ سے الگ کر دیتی ہے، وہ حسبِ سابق ہر چیز منہ میں ڈالنے اور نگلنے لگ جاتا ہے۔

پس یہ بات بالکل مطابقِ عقل معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ کے عہدِ ظلمت میں بھی خدا کے ایسے بندے تھے جو خود بھی بیدار تھے اور جنہوں نے دوسروں کو بھی بیدار کیا، لیکن تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد، جیسا کہ بچوں کی فطرت ہے، کھلونوں کی دلچسپی عود کرتی رہی اور انسان کی جستجو اپنا مدعا پا پا کے کھوتی رہی۔

یہاں پہنچ کر بعض لوگوں کو ایک اور شبہ بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جو چیز انسان کی فطرت ہے چاہیے کہ وہ اسی پر پیدا ہو، اسی پر بڑھے اور اسی پر مرے۔ یہ پا پا کر کھونا اور کھو کھو کر پانا کیا معنی؟ کم از کم یہ تو ہو کہ جستجوئے بسیار کے بعد جب پا جائے تو پھر اسے نہ کھو سکے۔

یہ شبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ حیوانات کی جبلت اور انسانوں کی فطرت کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ حیوانات کی جبلت اپنے بندھے ٹکے قاعدے رکھتی ہے۔ اگر کوئی خارجی خلل نہ واقع ہو تو انہی قاعدوں پر ابھرتی، نشوونما پاتی اور اپنے مقررہ درجۂ کمال تک پہنچتی ہے۔ قدرت نے ان کو اس سے انحراف کرنے، اس کو بدل دینے، یا اس میں ترقی کرنے کا موقع نہیں بخشا ہے۔ وہ اپنے ڈھرے کے پابند اور اپنے طبعی نظام کے اندر جکڑے ہوئے ہیں۔ ایک کبوتر کو اگر آپ گوشت کی دکان کے اندر بند کر دیں تو وہاں وہ بھوکا مر جائے گا، لیکن گوشت کے سارے ذخیرے سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔ ایک بلی کو اگر آپ پھلوں کی الماری کے اندر بند کر دیں تو وہ بھی بھوکی مر جائے گی، لیکن پھلوں

کے ذخیرہ سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گی۔ لیکن انسان کی فطرت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ہم انسانی فطرت کی نوعیت واضح کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ مستعار لے لیتے ہیں جو انہوں نے تفسیر سورۂ اخلاص میں مذکورہ بالا سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھے ہیں اور سورۂ روم کی آیات ۴۸ - ۳۴ کی روشنی میں لکھے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں :

"حکمت اور رحمت کی نشانیاں جو انسان کو تمام عالم میں نظر آرہی ہیں اور اپنے رب کی طرف کشش، جسے وہ مصیبت کے وقت محسوس کرتا ہے، بتا رہی ہیں کہ کسی عالم مطلق ہستی پر اسے اپنے اندر اور باہر سے گواہی مل رہی ہے۔ ایسی کوئی شہادت بتوں یا مردوں کے لیے نہیں ملتی۔ مگر انسان کی فطرت مثل اور حیوانات کے نہیں۔ وہ غلام بنائے گئے اور اس کو آزادی بخشی گئی جس کا لازمہ تھا کہ وہ اپنی کوشش سے ترقی کرے۔ پس ان کو جس ڈگر پر چلانا تھا جما دیا اور ویسے ہی چل رہے ہیں مگر انسان کو چراغ عقل اور توشۂ قابلیت ہے۔ جس قدر انسان نے آج تک ترقی کی ہے، یہ سب اس کی قابلیت ہی کے آثار ہیں اور اس کی قابلیت ہی کے برگ و بار۔ یہ امر کہ قابلیت کا نام فطرت ہے، کچھ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بچۂ طاؤس جو ایک مضغۂ گوشت ہے جب جوان ہوتا ہے تو اس کے پروں کی گلکاری کو ہم فطرت ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بچۂ انسان جو اکثر جانوروں کی نسبت زیادہ ضعیف الجثہ ہے اور اس سے بڑھ کر ضعیف العقل ہے۔ جب اپنے شباب پر پہنچتا ہے تو کیا اس کی دانائی اور توانائی کو ہم اس کی اصل فطرت کا نتیجہ نہ سمجھیں؟ پس انسان اور دیگر چیزوں میں فطرت کے ایک ہی معنی ہیں، البتہ اس کی فطرت میں ایک جداگانہ بات ہے، جو اوروں میں نہیں۔ یہ اوّل میں نہایت کمزور اور بے حقیقت ہوتا ہے، مگر آخر میں سب پر فائق ہو جاتا ہے۔ اس کی طاقت کی تھاہ اب تک نہیں ملی بجز یہ سب وہ

ناتوانیوں کے درمیان ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان سے دعوائے زبونی بھی ناموزوں نہ ہوتا۔ پس محض اس بات سے کہ انسان کی فطرت ترقی کے انتہائی مراحل طے کرتی ہے، یہ امر قرین قیاس ہے کہ وہ اکثر غلط راستہ پر پڑ جائے۔ پس آزادیٔ رائے اور پھر دوزخ راہ اس کے حصہ میں آئی۔ ان دو شکلوں کے ساتھ ایک تیسری شکل بھی لگ گئی۔ جو ان دونوں سے کبھی جدا ہو ہی نہیں سکتی۔ یعنی انسان نیکی اور بدی کے دوراہہ پر کھڑا کیا گیا، جس کے بغیر اس کا حق آزادی لفظ بے معنی ہوتا اور مراتب کے لیے میدان تنگ ہوتا۔ پس کشش اور کشمکش انسان کی فطرت کا لازمہ ہوا اور نیکی اور بدی کی کشمکش میں آگے بڑھنا اور نفسِ امّارہ اور عقلِ آوارہ کو جادۂ طاعت پر لانا اس کا فریضہ ٹھہرا۔

* انسان کو خدائے تعالیٰ نے ان دقتوں میں ڈال کر اس کی دستگیری کا وعدہ کیا ہے۔ اس کے اندر اور باہر سامانِ ہدایت موجود کر دیے ہیں جس طرح بچۂ ناتواں کے لیے ماں کا آغوش مہیا کیا، اسی طرح نوعِ انسان کے لیے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا۔ جو خدا زمینِ مردہ کو بارش سے سیراب کرتا ہے وہی خدا اپنے کلام سے دلوں کو آباد کرتا ہے۔ جس طرح وہ بعض بلند پہاڑوں میں سے قدرتی چشمے نکالتا ہے، اسی طرح بعض اعلیٰ دلوں میں سے الٰہی کلمے جاری فرماتا ہے۔ پس اس قدر سامان مہیا کر دینے کے بعد اگر انسان خدا سے روگرداں ہو تو یہ نتیجہ فطرت نہیں بلکہ اس کی غفلت ہے۔ اگر تاریخ سے بت پرستی کی مثالیں ملتی ہیں تو اس سے کہیں زیادہ پرزور اس کے ابطال کی مثالیں ملتی ہیں۔ توحید پر شرک کا غبار آہستہ جمتا ہے، مگر توحید کا ذرا سا چمکارا شرک کی ظلمت پر غالب ہو جاتا ہے، جس سے یہ نتیجہ بدیہی طور پر نکلتا ہے کہ فطرتِ انسانی کو توحید سے مناسبت ہے، ورنہ وہ کیوں اس طرح تیزی سے دوڑتا اور دوسری طرف آہستہ آہستہ گھسٹتا ہے:

اس تقریر سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ انسان کی فطرت اور حیوانات کی جبلت میں

چند بنیادی فرق ہیں۔

پہلا فرق یہ ہے کہ انسان کو اعلیٰ فطرت اور اعلیٰ خلقت کے ساتھ آزادی بھی ملی ہے۔ اس آزادی کی وجہ سے، وہ اگر چاہے تو احسنِ تقویم میں ہونے کے باوجود اسفلِ سافلین کے گڑھے میں گر جائے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ انسان کی قوتیں اور قابلیتیں اتھاہ ہیں۔ اس کو ترقی کی ایک لمبی منزل طے کرنی پڑتی ہے۔ حیوانات کی طرح اس کا راستہ کوس دو کوس کا نہیں ہے کہ چلے اور پہنچ گئے۔ اس درازیٔ راہ اور آزادیٔ رائے کے ساتھ اس کا گرنا اور اٹھنا، ڈوبنا اور اچھلنا، بالکل قدرتی بات ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ آزادیٔ رائے اور درازیٔ منزل کے ساتھ ساتھ اس کی آزمائش بھی کی گئی ہے۔ اس کے سامنے دنیا کو نقد، آخرت کو نسیہ، نیکی کو دشوار، بدی کو آسان، حرام کو لذیذ اور کثیر، اور حلال کو بے مزہ اور قلیل، ثمرۂ حق کو آجل، اور نتیجۂ باطل کو عاجل، حقیقت کو مستور، اور وہم و فریب کو دلکش اور پر جمال بنا کر رکھ دیا گیا ہے، تاکہ اس کا امتحان ہو کہ وہ خیر کی طرف لپکتا ہے یا شر کی طرف، اپنی فطرت کے مخفی مگر پُر حقیقت اشاروں کی طرف بڑھتا ہے یا نفس کی خلافِ فطرت مگر پُر فریب دعوتوں کی طرف۔ بلاشبہ یہ امتحان بڑا کڑا ہے، لیکن فطرت کا نفسِ لوامہ بھی ضعیف نہیں ہے۔ وہ ہر تاریکی کے اندر جھانکنے کی راہ پیدا کر لیتا ہے اور انسان کی رہنمائی کے لیے اشارے کرتا ہے اور آدمی محسوسات کے کتنے ہی نقاب اپنے اوپر ڈال لے، لیکن اس کے اشارے دیکھتا اور اس کی صدائیں سنتا ہے۔ اگرچہ اس کی صدائیں سنتے ہوئے اس کی نا فرمانیاں کرتا ہے اور اس کی حجتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے لیے معذرات تلاش کر لیتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جو سورۂ قیامہ کی آیات وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (۲) (اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی) (۲) بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ (۵) (بلکہ انسان اپنے ضمیر کے آگے شرارت کرنا

جاتا ہے) اور بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ ۝ (۱۴۔ ۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے۔ اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے) میں بیان ہوئی ہے اور تفصیل اس اجمال کی استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر سورۂ قیامہ میں دیکھنی چاہیے۔

۔ امتحان کی یہ سختی اس بات کی متقضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے انبیا مبعوث فرمائے۔ ہر چند فطرت کی کشش خدا کی طرف ضعیف نہیں تھی لیکن دنیا اور اس کی گیرائیاں، نفس اور اس کی فریب کاریاں، شیطان اور اس کی دل ربائیاں بھی اپنے اندر اتنا وزن رکھتی تھیں کہ رحمتِ الٰہی متقضی ہوئی کہ اس کسر کا جبر مہیا کرے اور نفس کے پہلو پر جو نقص ہے اس کی تلافی فطرت کے پلڑے میں پاسنگ رکھ کے کر دے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو شیطان کے ساتھ اس آزمائش گاہِ دنیا میں اتارا تو ساتھ ہی اپنی ہدایتیں اور اپنے انبیاء بھیجنے کا وعدہ فرمایا: فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی (البقرۃ - ۲ : ۳۸) (تو اگر آئے تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت) تاکہ اس میدانِ مقابلہ میں انسان کی فطرت تنہا نہ پڑ جائے، بلکہ اس کے ساتھ اللہ کے نبیوں، اس کی کتابوں اور اس کے ملائکہ کی نصرت بھی ہو۔ یہ فطرت کی تائید میں ایک مزید کمک مہیا کی گئی، جس کے بعد انسان پر اللہ کی حجت تمام ہو گئی اور اس کی ہدایت کا معاملہ اتفاق و امکان پر نہیں رہ گیا۔ اب اس کے لیے قیامت کے دن یہ عذر باقی نہیں رہا کہ تاریکی اتنی سخت تھی کہ اس سے اپنی فطرت کے مدھم نقوش پڑھے نہ جا سکے۔ بلاشبہ تاریکی سخت تھی، لیکن نورِ مبین اور سراجِ منیر بھی موجود تھے، جو فطرت کے باریک سے باریک نقوش کو اجاگر کر رہے تھے۔

قدرت کسی گوشے میں بھی اپنی فیض بخشیوں میں بخیل نہیں ہے۔ یہ ممکن تھا کہ انسان کو سننے کے لیے ایک ہی کان دیا جاتا، یا دیکھنے کے لیے ایک ہی آنکھ ملتی۔ لیکن قدرت

نے دو کان بخشے اور دو آنکھیں عنایت کیں۔ اسی طرح یہ ممکن تھا کہ انسان کی رہنمائی اس کی فطرت ہی پر چھوڑ دی جاتی۔ لیکن رحمتِ الٰہی نے اس معاملہ کو امکان و اتفاق پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے ہدایت کا بہتر سے بہتر سامان مہیا کر دیا۔ اندر اور باہر کی اتنی قوتیں رکھنے کے باوجود اگر انسان خدا پرستی کی حمایت میں شیطان سے لڑنے کے لیے تیار نہ ہوا، بلکہ اس کے ساتھ اس نے سازگاری ہی چاہی تو ظاہر ہے کہ یہ فطرت کی خرابی نہیں ہے، بلکہ اس کے اسباب دوسرے ہیں جو ان شاءاللہ تفصیل کے ساتھ آئندہ باب میں بیان ہوں گے۔

اس تقریر کے بعد اب اس بات کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے۔ اوپر کے مباحث سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اسلام اور دوسرے آسمانی مذاہب کا نقطۂ آغاز خوف کا جذبہ نہیں ہے، بلکہ محبتِ الٰہی کا جذبہ ہے اور شرک و بت پرستی کی بنیاد ایک بالکل دوسری ہی شے ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ پس اسلام ——— اور تمام مذاہبِ حقہ کا اصلی نام اسلام ہے اور یہی ابتدائے آفرینش سے خدا کا اصلی دین ہے ——— اور شرک و بت پرستی میں اصل و نسل کا فرق ہے اور ان کا قدرتی تعلق صلح و آشتی کا نہیں، بلکہ نفرت و عداوت کا ہے۔ ایک فطرت کا ارتقاء ہے، دوسرا فطرت کی رجعت قہقری۔ دونوں کی سمت سفر اور منزل مختلف ہے۔ ان میں رواداری اور مسالمت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

دنیا میں انسان محض جینے نہیں آیا ہے۔ اس لیے آیا ہے کہ اس کی فطرت میں جو اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت ہیں ان کو ارتقاء کے اس نقطۂ کمال تک پہنچا دے، جہاں تک وہ اس عالمِ آب و گل میں رہتے ہوئے پہنچ سکتی ہیں۔ اسی مقصد کے لیے انسان کو دنیا میں جینے کی ایک مہلت ملی ہے۔ اگر یہ مقصد پورا نہ ہو رہا ہو تو اس کا جینا لاحاصل اور اس کا زندہ رہنا عبث ہے۔ اور قدرت جو ہر گوشہ میں نہایت حکیم واقع ہوئی ہے وہ ایک

کار عبث نہیں کر سکتی۔ انسان کے ارتقائے روحانی کا نقطہ آغاز، جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، خالص خدا پرستی کا جذبہ ہے۔ جب انسان اپنے اس رخ پر بڑھ چلتا ہے تو وہ ارتقائے روحانی کی اصل شاہراہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اگر اس سے اس نے رخ پھیر لیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ارتقائے فطری کی راہ کے خلاف بڑھ چلا ہے۔ چونکہ قدرت حد درجہ مہربان ہے، اس لیے اس نے فطری ہدایت بخشنے کے ساتھ ساتھ اس کا بھی سامان کیا ہے کہ وہ اپنے انبیاء و رسل بھیجتی رہی ہے، جو انسانوں کو ان کے ارتقاء کی صحیح سمت میں ڈالتے رہے ہیں۔ یعنی ان کو خالص خدا پرستی کے نقطہ تک لانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

انبیاء کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ جس گروہ کی طرف بھیجے جاتے ہیں اس کے نخلِ فطرت کے بہترین ثمر ہوتے ہیں، بہترین سیرت رکھتے ہیں، بہترین کلام سناتے ہیں، بہترین عمل دکھاتے ہیں اور ایک طویل مدت تک ایک اعلیٰ ترین فطرت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک بہترین جماعت تیار کر دیتے ہیں، جو فطری ارتقا کی اصل شاہراہ پر اپنا مارچ بھی شروع کر دیتی ہے۔ اب اس کے بعد بھی اگر کچھ بلید ایسے ہیں جن کے کان فطرت کی صداؤں اور نبی کی نداؤں سے بالکل غافل ہیں تو ان کو قدرت کس کام کے لیے باقی رکھے؛ انسان بنا کے محض جینے، کھانے پینے اور بچے پیدا کرنے کے لیے تو ان کو رکھ چھوڑنا لاحاصل ہے۔ اس کے لیے تو حیوانات موجود ہی ہیں جو یہ سارے کام بھی کر رہے ہیں اور اپنے سے برتر نوع کی خدمت کر کے ارتقاء کی شاہراہ پر بڑھ بھی رہے ہیں۔ ان کی ہدایت کے لیے جو جتن کیے جا سکتے تھے وہ کیے جا چکے۔ اب صرف یہ چیز باقی رہ گئی کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے یا تو حقائق کے تمام پردے اٹھا دے اور انہیں تمام عالمِ غیب و شہادت کی سیر کرا دے یا ہدایت پر مجبور کر دے۔ لیکن یہ اکراہ اور کشفِ حجاب اس آزادی اور اس قانونِ آزمائش کے خلاف ہے، جس کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، تو اب قدرت ان کو کس کام کے لیے جینے کی مہلت دے؟ یہ انسان

بجز اس کے اب کیا کرے گا کہ جس غلط راہ پر خود چل پڑا ہے اسی پر ان کو بھی چلائے گا۔ جن پر اس کا قابو چلے گا اور ان کو بھی جو اس کی صلب سے پیدا ہوں گے: اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (نوح ۲۷ - ۷۱) (اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور نابکاروں اور کافروں ہی کو جنم دیں گے)۔

اسی وجہ سے جن قوموں کے اندر انبیاء اور رسل بھیجے گئے، ان کے بارہ میں خدا کا قانون یہ رہا ہے کہ تکمیلِ دعوت اور اتمامِ حجت کے بعد ان کے صالحین کو چھانٹ کر الگ کر دیا گیا اور ان کے فاسقین و اشرار کو عذابِ الٰہی کے ذریعے سے، یا اہلِ حق کے ہاتھوں ختم کر دیا گیا اور بقائے اصلح کا قانون اسی کا مقتضی ہے۔

یہ سنۃ اللہ انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے متعین ضوابط ہیں جو قرآن حکیم میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۂ کافرون میں اس پر اجمالی اشارات ملیں گے۔ انبیاء کے علاوہ دوسرے اشخاص اور دوسری جماعتیں اس درجہ کا اتمامِ حجت نہیں کر سکتے کہ یہ طے ہو جائے کہ اب اس قوم میں قبولِ ہدایت کی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس لیے ان کو یہ حق نہیں ملا کہ وہ غیر صالح افراد کو ختم کر دیں، الا آنکہ ایک شخص نے قبولِ ہدایت کے بعد رجعت و ارتداد اختیار کیا ہو۔ کیونکہ اس کا ایک مرتبہ ہدایت کو قبول کرنا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ اس پر حق روشن ہو چکا ہے۔ ان کو غیر صالح افراد کے باب میں صرف یہ حق ملا ہے کہ ان کے ہاتھوں سے قیادت کی باگ چھین کر ان کو اپنی ماتحتی میں رکھیں، تاکہ وہ زمین میں فساد پھیلانے کے بجائے، ایک صالح قیادت میں رہ کر اور ایک سازگار ماحول میں پل کر، اگر کچھ گنجائش ہے تو اپنی اصلاح کر سکیں۔

اس تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مذہب کا آغاز محبت کے جذبہ سے ہوا جو بچہ کی فطرت میں والدین کے لیے اور بالغوں کی فطرت میں والدین کے سوا منعمِ حقیقی

کے لیے پیدا ہوا۔ اس محبت سے منعم حقیقی کے لیے شکر و حمد کا اور والدین کے ساتھ احسان کا جذبہ پیدا ہوا۔ منعم حقیقی کی حمد کے جذبہ نے اللہ کی عبادت کا تصور پیدا کیا جس نے نماز کی صورت اختیار کی اور والدین کے ساتھ احسان کے جذبہ نے ان کی خدمت، اور ان کے لیے انفاق کا تصور پیدا کیا جس نے ترقی کر کے ایتاء ذی القربیٰ اور زکوٰۃ کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح روح انسانی کا ارتقاء شروع ہوا۔ حقوق اللہ کی ادائیگی کے تصور نے تمام عقائد و عبادات کو استوار کیا اور حقوق العباد کی ادائیگی کے تصور نے تمام اخلاق و معاملات کو استوار کیا۔ یہ فطرت اور خدا پرستی کی صراط مستقیم ہے۔ یہی ارتقائے روح کی اصلی شاہراہ ہے۔ اس کے ایک سرے پر ابونا آدم علیہ السلام ہیں اور دوسرے پر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اس کے بیچ میں وسط راہ پر، خدا کے ہزاروں لاکھوں انبیاء و رسل اور داعیانِ حق، تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے کھڑے ہیں۔ انہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں اسی راہ پر چلنے کی دعوت دی، لیکن انسان بار بار اس راہ پر آ کر اس سے منحرف ہوتا رہا اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں خرابیاں پیدا کرتا رہا۔ چنانچہ ہر نبی کو یہ کہنا پڑا "وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا" (الاعراف ۷: ۵۶) (اور ملک میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو)۔

باب ۱۰

شرک کا اصلی سبب

پچھلے باب میں یہ بات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکی ہے کہ انسان کی فطرت کے اندر ایک منعم حقیقی کی محبت اور اس کے حمد و شکر کا جذبہ سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ راسخ ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا ہے اور ہر ابنِ آدم نے 'بلیٰ' کہہ کر اس عہد و اقرار میں شرکت کی ہے:

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيٓ آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰٓ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ ۙ

(الاعراف ۷: ۱۷۲)

اور یاد کرو، جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے —— ان کی پیٹھوں سے —— ان کی ذریت کو، اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر، پوچھا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بولے: ہاں، تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبری رہے۔

بعض لوگ اس پر شبہ وارد کرتے ہیں کہ کیا معلوم اس قسم کا کوئی عہد ہوا ہے۔

ہمیں نہ تو اس 'السْتُ بِرَبِّکُم' کے سوال کی کوئی خبر ہے اور نہ ہی یاد ہے کہ ہم نے 'بَلیٰ' کہہ کر کسی عہد کی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ یہ دونوں باتیں محتاجِ ثبوت ہیں۔ بالخصوص جب کہ اس کی اہمیت اس درجہ ہے کہ قیامت کے دن ہر شکل یہ عہد ہر ابنِ آدم پر حجت ہوگا۔

حیرت ہے کہ لوگوں کو کیا یہ بات نہیں معلوم ہے کہ ایک انسان پانی کی ایک حقیر بوند کی شکل میں ماں کے پیٹ میں پڑتا ہے۔ ماں، نہیں معلوم کتنے مصائب جھیل کر اور کتنے دکھ اٹھا کر، نو مہینے اس کو پیٹ کے اندر ہی پالتی ہے۔ اپنے گوشت و خون سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ پھر جان کی بازی کھیل کر ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں اس کو جنتی ہے۔ پھر اپنے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون دودھ بنا کر اس کو پلاتی ہے اور برسوں کی جان کاہیوں کے بعد اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر سکے۔ اس کے بعد باپ کے ایثار، اس کی شفقتوں، اس کی خور پرداخت اور تربیت و نگہداشت کا دور آتا ہے۔ جو ایک طویل عرصہ تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصہ میں باپ جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے، اس سے زیادہ بچہ کے لیے چاہتا ہے۔ وہ خود کم کھاتا ہے تاکہ بچہ کو کھلائے۔ وہ خود تکلیف اٹھاتا ہے تاکہ بچہ کو آرام پہنچائے۔ وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا ہے تاکہ بچہ ہر خطرہ سے محفوظ رہے۔ ماں باپ کی محبتوں، شفقتوں اور جانبازیوں کا یہ سلسلہ ہے جو ایک بچہ کو پال کر جوان بناتا ہے۔ اگر اس میں سے ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو بچہ کی زندگی ہی خطرہ میں پڑ جائے۔ اب فرض کیجیے بچہ جوان ہوا اور والدین بڑھاپے کو پہنچے۔ اب یہ محتاج ہیں اور وہ مستغنی۔ لیکن بیٹا ان کا کوئی خیال نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اس کو والدین کے حقوق و فرائض یاد دلاتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ ماں باپ کے کچھ حقوق و فرائض بھی ہیں۔ مجھے اس قسم کے کسی فرض یا ذمہ داری کی کوئی خبر نہیں ہے۔ میں نے اس قسم کے کسی حق کا کبھی اقرار نہیں کیا ہے تو کیا اس کا یہ جواب معقول ہوگا؟ ہر شخص ایسے بیٹے کو کمینہ اور لئیم کہے گا۔ کیونکہ وہ ایک ایسے حق اور ایسی ذمہ داری کا انکار کر رہا ہے جس سے زیادہ ثابت حق

اور مسلّم ذمہ داری کوئی اور نہیں ہے۔ یہ ذمہ داری ہر استحقاق کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بغیر تحریر کے نوشتہ، بغیر گواہی کے ثابت اور بغیر مطالبے کے مسلّم ہے۔ یہ استحقاق (PRIVILEGE) اور ذمہ داری (RESPONSIBILITY) کا وہ فطری عہد ہے جس سے زیادہ انسان پر کسی عہد کی بھی پابندی عائد نہیں ہوتی۔

اسی بنیاد پر ایک انسان اس عورت کے لیے نان نفقہ اور حفاظت و حرمت کا حق تسلیم کرتا ہے جس سے متمتع ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر آدمی پر اس کے خاندان اور قبیلہ کی حفاظت و نصرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک شہر کی میونسپلٹی اپنے شہریوں کی کمائی میں حصہ دار بنتی ہے۔ اسی بنیاد پر ایک سلطنت اپنی رعایا سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم و قابلیت، اپنے وقت اور آزادی اور اپنے جان و مال میں اس کو شریک کریں اور اگر سلطنت کا وجود خطرہ میں پڑ جائے تو رعایا اس کے بچاؤ کے لیے سب کچھ قربان کر دے۔

اب فرض کیجیے ایک شخص ایک عورت کی حرمت کا مالک بن بیٹھا، لیکن اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری اور اس کے حقوق و فرائض سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہیں کیا ہے یا ایک شہری میونسپلٹی کی سڑکوں پر چلتا تو ہے، اس کے حفظانِ صحت کے انتظام سے فائدہ تو اٹھاتا ہے، اس کے پارکوں اور چمنوں سے متمتع تو ہوتا ہے، اس کی جلائی ہوئی لالٹینوں سے روشنی تو حاصل کرتا ہے، اس کے قائم کیے ہوئے مدرسوں سے متمتع تو ہوتا ہے، لیکن جب اس کے مطالبات کا وقت آئے تو کہہ دے کہ میں اس قسم کی کوئی ذمہ داری تسلیم نہیں کرتا یا اسی طرح ایک آدمی ایک سلطنت کے اندر شہریت کے جملہ حقوق سے متمتع ہو رہا ہے، اس کے امن و عدل سے فائدہ اٹھا رہا ہے، اس کے قانون اور نظام کی بدولت وہ ایک ملکیت کا مالک، ایک بیٹے کا باپ، ایک بیوی کا شوہر، ایک سلطنت کا شہری تو بنا ہوا ہے، لیکن جب سلطنت کے مطالبات

کا وقت آئے تو وہ جواب دے دے کہ میں اس مطالبہ کی ذمہ داری سے بری ہوں، میں نے اس قسم کے بار اٹھانے اور اس قسم کی جوکھم میں پڑنے کا کبھی اقرار نہیں کیا تھا تو کیا اس کے جوابات صحیح ہوں گے؟ بیوی کہے گی یہ عذر غلط ہے۔ جس دن تو نے میری حرمت پر آزادانہ تصرف کیا اور میں نے اپنا جسم تیرے سپرد کیا، اسی دن تو نے ان ساری ذمہ داریوں کے لیے مجھ سے ایک میثاق غلیظ کیا ہے اور زبان خلق بیوی کو برحق اور شوہر کو لئیم اور کمینہ قرار دے گی۔ یہی جواب ایک قبیلہ اپنے بزدل اور حق ناشناس فرد کو دے گا۔ یہی جواب ایک میونسپلٹی اپنے نادہند شہری کو، ایک حکومت اپنے نمک حرام باشندے کو دے گی اور تمام دنیا اس جواب کو بالکل جائز اور ایسے لوگوں کے لیے ہر سزا کو بالکل واجبی قرار دے گی۔ کیونکہ ہر استحقاق کے ساتھ ذمہ داری کا لزوم اس قدر بدیہی ہے کہ آسمان کا سورج بھی اتنا بدیہی نہیں ہے۔

اسی استحقاق اور ذمہ داری کے فطری اور ہمہ گیر قانون کی بنا پر ہمارے گھر کی پلی ہوئی مرغی، ہمارے تھان پر بندھی ہوئی گائے اور گھوڑے، ہمارے چمن میں لگے ہوئے پودے اور ہمارے باغ میں اُگے ہوئے درخت کے بھی ہم پر حقوق ہیں اور ہم نہایت لئیم ٹھہریں گے، اگر ان حقوق کا انکار کر دیں۔ جس مرغی کے انڈے اور چوزے ہم کھاتے ہیں، لازم ہے کہ بلیوں اور کتوں سے اس کی حفاظت کریں، ہم جس گائے کا دودھ پیتے ہیں اور جس گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں، ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے گھاس اور دانے کے کفیل ہوں، ہم جس پودے کے پھول سے معطر مشام اور جس درخت کے پھل سے لذت اندوز اور خوش کام ہوتے ہیں، ہم پر واجب ہے کہ ان کو سینچیں، ان کو گوڑیں اور ان کو کھاد دیں اور سردی کی آفتوں اور لُو کی مصیبتوں سے ان کو بچائیں۔ ہم ان کے حقوق کا انکار نہیں کر سکتے۔ ہم نے جس دن ان کے وجود سے کسی قسم کی لذت و راحت حاصل کی، اسی دن ان کے حقوق کا اقرار کر لیا۔ یہ استحقاق اور ذمہ داری کا عہد ہے جو ہر نافع اور منتفع میں از خود

واقع ہوتا ہے اور انسان کی فطرت اور دنیا کے معروف میں اس سے زیادہ کوئی چیز اہم اور واجب الاحترام نہیں ہے۔

اب غور کیجیے کہ جب ہم کو ماں باپ کے حقوق سے انکار کا حق نہیں ہے تو ان سے کہیں بڑھ کر اس کا حق ہے جس نے ماں باپ کو پیدا کیا ہے۔ جب ہمارے لیے بیوی کے حقوق سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے حق سے کیسے انکار ممکن ہے جس نے مرد کی سکینت کے لیے عورت کو وجود بخشا! جب ہم خاندان اور قبیلہ، بادشاہ اور سلطنت کے حقوق مانتے ہیں تو وہ جس نے خاندان اور قبیلہ کو وجود بخشا، جس نے بادشاہی اور سلطنت کی شیرازہ بندی کے لیے انسانی فطرت کے اندر عصبیت کی چسپیدگی اور اجتماعیت پسندی کی یوستگی بخشی، ان سے کہیں بڑھ کر اس بات کا حق دار ہے کہ ہم اس کے عہد ربوبیت کا اقرار کریں۔ جب ہم مرنی اور رقی تک کا حق مانتے ہیں، گائے اور گھوڑے تک سے ایک خاموش معاہدۂ استحقاق و ذمہ داری کا اعتراف کرتے ہیں تو آخر اس کے عہد سے ہمیں کیوں انکار ہو جس نے گائے اور گھوڑے، دشت و چمن، دریا اور پہاڑ، سورج اور چاند، ہوا اور پانی، آگ اور مٹی سب کو وجود بخشا اور سب کو ہماری ہستی کے قیام کے لیے سازگار اور نفع رساں بنایا۔[1]

پس یہ بات تو بالکل غلط ہے کہ انسان کو اس عہد کا علم نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس عہد سے عہدہ برآ ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اپنی محبت اور طلب کا جذبہ دے کر اس کی راہ میں خوف اور طمع، رغبت اور رہبت کے بہت سے عقبات ڈال دیے ہیں تاکہ اس کے اختیار و

---

[1]: یہاں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ گیتا میں اس شخص کی مثال چور سے دی گئی ہے جو خدا کی نعمتوں سے فائدہ تو اٹھاتا ہے، لیکن اس کے لیے قربانی نہیں کرتا ہے۔

آزادی کا امتحان ہو اور ہر شخص اپنی ہمت و قابلیت کے اعتبار سے خدا کے یہاں درجہ اور عزت حاصل کر سکے۔ یہی عقبات ہیں جو ایک طالبِ صادق اور ایک بوالہوس کے درمیان امتیاز کی کسوٹی ہیں جو اہل ہمت ہوتے ہیں وہ تو ہر پست و بلند اور ہر سہل و صعب کو طے کرتے ہوئے خدا تک پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں۔ نہ راہ کے کسی خطرہ کی پروا کرتے اور نہ کسی طمع کی طرف ملتفت ہوتے ہیں۔ وہ اپنی فطرت کی صدائے جرس برابر سنتے ہیں اور اس کی کشش انہیں اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ وہ تلووں کے آبلوں اور کانٹوں کی جلن اور چبھن کا خیال کریں لیکن جو پست ہمت اور دنی الفطرت ہوتے ہیں وہ ان عقبات میں سے کسی عقبہ کے پاس ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بس یہی دنارت اور پست ہمتی ہے جو درحقیقت غیر اللہ کی بندگی اور شرک کا اصل سبب ہے۔ انسان اپنے درجہ اور علوئے منصب کا خیال نہیں کرتا اور اور جہاں کوئی گھنی چھاؤں یا کوئی خطرہ دیکھتا ہے وہیں کمر کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ دنارت اور پست ہمتی جن گوناگوں شکلوں میں ظاہر ہوئی ہے اور اس نے انسان کو جس جس طرح غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا کیا ہے۔ اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے، لیکن ذہن میں اس کا تصور پیدا کرنے کے لیے چند ضروری باتیں یہاں ہم ذکر کریں گے۔

سب سے پہلے اس بات پر غور کیجیے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات کے اندر ایک چھوٹی سی بادشاہی بخشی ہے۔ اس کے وجود کی تقویم اس طرح فرمائی کہ اس کو بہترین قابلیتوں اور بہترین قوتوں سے آراستہ کیا۔ اس کو کھانے پینے، اوڑھنے پہننے، بیوی بچے، گھر گرہستی کی خواہشیں دیں تاکہ ان خواہشوں کی تحریک سے وہ اپنی بقائے ذات اور بقائے نوع کی قابلیتوں کو بروئے کار لا سکے۔ اس کو عقل عنایت فرمائی جو خیر و شر میں امتیاز کرنے والی ہے۔ دل عنایت فرمایا جو بلند ارادوں کا مخزن ہے۔ روح عنایت فرمائی جس میں اپنی طلب و جستجو ودیعت کی اور سب پر اس کو اختیار بخشا کہ وہ ان سب پر حکومت کرے اور ان کو اپنے رب کی رضا کی راہ میں استعمال کر کے خدا کے یہاں بلند سے بلند تر

مرتبہ حاصل کرے۔ لیکن اس نے دیکھا کہ اس کو جتنی چیزیں ملی ہیں ان میں خواہشیں سب سے زیادہ لذیذ ہیں، ان کی لذت نقد اور ان کا نفع عاجل ہے۔ پس وہ ان کا اس درجہ گرویدہ ہوا کہ اس نے اپنی ساری سلطنت ان کے حوالہ کردی۔ اس نے اپنے حواس خمسہ کو حکم دیا کہ وہ خواہشوں کی اطاعت کریں اور جو کچھ انہیں مطلوب ہے صرف اس کی تلاش میں اپنے آپ کو سرگرم رکھیں۔ اس نے عقل کی عدالت معطل کردی تاکہ ان خواہشوں کے خلاف کوئی مرافعہ نہ ہوسکے۔ اس نے دل کو بھی ان خواہشوں ہی کے تصرف میں دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بس وہ بطن و فرج کا بندہ بن کر رہ گیا۔ اور اس کی مثال بالکل اس بادشاہ کی ہوگئی جو اپنی کسی لونڈی پر اس درجہ فریفتہ ہوجائے کہ اپنے آپ کو اور اپنی پوری مملکت کو اس کے امر و نہی کے حوالہ کردے اور اس کی سلطنت کے تمام شرفاء و علماء اور تمام مدبرین ملک و اعضائے سلطنت اس لونڈی کے غلام بن کر رہ جائیں یہ "أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ" (الجاثیۃ ۴۵ : ۲۳) (کیا دیکھا تم نے اس کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے) کی صورت ہوئی اور ظاہر ہے کہ انسان کی فطرت نہیں بلکہ اس کی دنائت کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ماں باپ بنائے، بیوی بچے بخشے، خویش و اقارب دیئے، کنبہ و خاندان اور قبیلہ و قوم کی جمعیت بخشی، مال و جائداد عنایت فرمائی، جانوروں کے گلے دیئے تاکہ انسان ان کے اندر اور ان کے ذریعہ سے اپنی ان مدنی و اجتماعی قابلیتوں کو بروئے کار لائے جو اس کے اندر ودیعت ہیں۔ اور اس مدنیتِ فاضلہ کی تخلیق کرے جس کا وہ خدا کا خلیفہ ہونے کی وجہ سے اہل ہے۔ لیکن انسان نے ان سارے وسائلِ مقصد کو اصلِ مقصد بنا لیا۔ وہ ماں باپ کی محبت میں ایسا مستغرق ہوا کہ اس نے پدر پرستی کی بنیاد ڈال دی۔ بیوی بچوں کی محبت میں ایسا گرفتار ہوا کہ اس کے حکموں کو بھول گیا۔ کنبہ و خاندان اور قبیلہ کی عصبیت میں اتنا پھنس گیا کہ ان کے لیے خدا اور اس کے رسولوں سے بغاوت کر بیٹھا۔ یہاں تک کہ اس محبت کے غلو میں اس نے آبا پرستی اور قبائلی دیوتاؤں

کی پرستش شروع کردی۔ وہ مال و جاہ اولاد کے عشق میں ایسا مبتلا ہوا کہ انہی کو معبود خیال کرنے لگا۔ حد یہ ہے کہ جن جانوروں کو اس نے مسخر پایا ان کو بھی اس نے دیوتا بنا لیا گائے، بیل، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ، سب اسی طرح اس کے دیوتا بن گئے۔ اللہ تعالٰی نے جو چیزیں بطور مرکب اسے عنایت کیں ان کو اس نے راکب بنا لیا اور جو چیزیں بطور کمند کے دیں کہ ان کے سہارے سے خدا تک پہنچ سکے، ان کمندوں کو اس نے اپنے پاؤں اور اپنی گردن میں پھندا بنا کر ڈال لیا۔

اللہ تعالٰی نے بے شمار نعمتیں ایسی بخشیں جو انسان کے لیے یکسر نفع ہی نفع تھیں۔ اپنی نفع رسانیوں کے عوض میں، بیوی بچوں، قوم و قبیلہ اور گائے گھوڑے کی طرح آدمی سے کسی حق اور ذمہ داری کا مطالبہ نہیں کرتی تھیں، مثلاً سورج، چاند ستارے، قوسِ قزح، ابر، ہوا، آگ، پانی، زمین، دریا، پہاڑ، فضا کی چڑیاں وغیرہ۔ یہ چیزیں اللہ تعالٰی نے اس لیے عنایت فرمائی تھیں کہ انسان ان کے وجود سے متمتع ہو اور ان کے حقوق کی ذمہ داری سے بالکل بے فکر رہ کر اپنے اوقات صرف رضائے مولا کے کاموں میں مشغول رکھ سکے۔ لیکن انسان نے جب دیکھا کہ اتنے نافع ہونے کے باوجود یہ اس سے کسی عوض کے طلب گار نہیں ہیں تو ان کی اس مفت فیض رسانی پر ایسا ریجھا کہ ان میں سے ہر نعمت کو اس نے منعم کا درجہ دے کر اس کی عبادت شروع کر دی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک بادشاہ اپنے کسی مقربِ خاص کو بہت سے غلام اور لونڈیاں عنایت کرے اور ان کی ساری ذمہ داریاں بھی اپنے سر لے تاکہ وہ مقربِ خاص اپنی اور اپنے خدام کی ساری ذمہ داریوں سے بالکل سبک دوش رہ کر اپنی ساری توجہ صرف سلطنت کے امورِ مہمہ پر صرف کر سکے، لیکن وہ مقربِ خاص ان غلاموں اور لونڈیوں کی اس بے مزد و بے صلہ خدمات پر اس طرح ریجھ جائے کہ ان ہی کو بادشاہ تصور کر کے ان ہی کی بندگی اور اطاعت کرنے لگ جائے اور بادشاہ اور اس کی سلطنت کو بالکل بھول جائے۔

اسی طرح جنتوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کی بارش کی، ان کو ملک و مال دیا، عزت و رتبہ بخشا، تخت و تاج عنایت کیا تاکہ ان کو آزمائے کہ وہ اس کی بندگی کرتے ہیں یا اس سے بغاوت کرتے ہیں، زمین پر اس کا قانون چلاتے ہیں یا اپنا قانون چلاتے ہیں، امن و عدل پھیلاتے ہیں یا ظلم و فساد پھیلاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ سب کچھ ان کے استحقاق و قابلیت کا ثمرہ ہے، تکبر کیا اور بندگی کی جگہ خدائی شروع کر دی۔ کوئی یہ سمجھ بیٹھا کہ ہم خدا کے اوتار ہیں، جیسے مصر کے اوتار بادشاہ (God Kings) اور ہندوستان کے قدیم راجے اپنے آپ کو دیوتا کی حیثیت سے اپنی رعایا سے پجواتے تھے۔ مسلمان بادشاہوں میں سے اکبر کو بھی اس کے جاہل اور خوشامدی درباریوں نے اسی قسم کے خبط میں مبتلا کر دیا تھا۔ کوئی اپنے تئیں آسمانی مخلوق خیال کرنے لگا۔ مثلاً چین جاپان کے بادشاہ اپنے آپ کو بشریت سے ماوراء سمجھتے تھے۔ مصر میں پہنچ کر سکندر بھی اسی مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ان طاغوتوں کی مثال ایسی ہے کہ کوئی بادشاہ اپنے کسی غلام کو کچھ خدم و حشم دے کر اپنی مملکت کے کسی علاقہ میں انتظام پر مامور کرے اور وہ غلام خدم و حشم پا کر ایسا بدمست ہو کہ وہاں پہنچ کر اپنی بادشاہی کا علم گاڑ دے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بہتوں کو مال و متاع کی ذمہ داریوں سے سبک دوش رکھا اور مقصود اس سے انسان کے صبر و رضا کا امتحان تھا کہ دیکھے کہ یہ لوگ طمعِ دنیا میں پھنس کر خدا کے باغیوں ہی کو معبود بنا لیتے ہیں یا اپنے خشک نوالوں پر قانع رہ کر اپنی فطرت کے عہد پر قائم رہتے ہیں۔ لیکن بہتیرے اس امتحان میں پورے نہیں اترے اور خدا کی جگہ اس کے باغیوں ہی کے تقرب کے طالب ہوئے اور ان کے لیے بندگی و نیازمندی کی وہ ساری رسمیں بجالائے جو رب کائنات کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں ہو سکتیں۔ ان ہی لوگوں نے خدا کے ان باغیوں کو ان کی زندگی میں خداوند نعمت اور اَن داتا وغیرہ بنایا اور مرنے کے بعد ان کے مقبرے، اسٹیچو اور بت تعمیر کرائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بہت سے بندوں پر روحانی برکتیں نازل کیں۔ بعض کو اپنا سفیر و پیغمبر بنایا۔ اللہ کے ان خالص و مخلص بندوں نے کبھی لوگوں کو غیر اللہ کی بندگی کی دعوت نہیں دی، لیکن کچھ زمانہ گزرنے کے بعد ان کے دنیا طلب مریدوں اور ان کی محبت کے جھوٹے مدعیوں نے بیشتر اپنے دنیاوی اغراض کے لیے ان کو لے جا کر خدا کی صف میں بٹھا دیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور بہت سے اولیاء و مشائخ اسی طرح خدا کے شریک بنا دیے گئے۔

اسی طرح سیاسی و معاشی اغراض بھی اکثر شرک و بت پرستی کے باعث ہوئے۔ قدیم تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی قوموں نے دوسری قوموں کے بت محض ان کے ساتھ سیاسی تعلقات استوار رکھنے کے لیے پوجے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ فاتح قوموں نے مفتوح قوموں کی دل جوئی کے لیے ان کے بتوں کو اپنے معبدوں میں جگہ دی۔ ہندوستان میں اکبر نے اسی مقصد سے بہت سی خفیف الحرکتیاں کیں۔ قریش نے خانہ کعبہ کو تمام قبائل عرب کے بتوں کا معبد اعظم بنا دیا تاکہ اس طرح تمام قبائل پر اپنی سیادت رکھ سکیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی بار ہا اس قسم کے رذیل مقاصد کے لیے پڑوس کی مشرک قوموں کے بت پوجے اور یہ تو ان کی تاریخ کی ایک عام حکایت ہے کہ انھوں نے مشرک قوموں کی عورتوں سے شادیاں کیں اور ان کے ساتھ ان کے اصنام اور ان کے مشرکانہ عقائد و رسوم بھی اپنے گھروں میں لائے اور پھر ان سے جو اولادیں پیدا ہوئیں وہ بھی لازماً شرک پر اٹھیں۔ مسلمانوں پر انگریزوں اور مغربی قوموں کے غلبہ اور ہندوؤں کے ساتھ اشتراک و ارتباط کی وجہ سے جو اثرات پڑتے یا پڑ رہے ہیں ——— اور اگر حالات نہ بدلے تو پڑیں گے ——— وہ ہر واقف حال کے سامنے ہیں۔

یہ چند مثالیں طمع و رغبت کے عقبات کی بیان ہوئی ہیں۔ اب چند مثالیں عقبات

خوف کی بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں جو چیزیں ضرر ناک، خطرناک اور ہولناک نظر آئیں انسان نے ان کو بھی خدا کی خدائی میں شریک بنا لیا۔ انسان اپنی بے اعتدالیوں، اپنی گندگیوں اور اپنی کاہلیوں کے نتیجے میں بیماریوں میں مبتلا کیا گیا تاکہ وہ اعتدال اور پاکیزگی و مستعدی کے اس نقطۂ کمال تک ترقی کرے جو اس کے احسن تقویم میں پیدا کیے جانے کا مقتضی ہے، لیکن انسان کے نفس پر اعتدال کی پابندیاں، صفائی کی احتیاطیں اور مستعدی کی زحمتیں شاق گزریں اور یہ سارے پاپڑ بیلنے کے بجائے اس نے سہولت اس میں دیکھی کہ ان بیماریوں کے اندر روحیں مان کر ان کی دُہائی دینے لگا اور ان کو نذریں اور قربانیاں پیش کرنے لگا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کسی شخص کو کسی پتھر سے ٹھوکر لگ جائے اور وہ بجائے اس کے کہ آئندہ آنکھیں کھول کر چلنے کا عہد کرے اور جلد بازی سے احتراز کرے، ٹھوکر لگانے والے روڑے کے پاس ایک مندر بنا کے بیٹھ جائے اور اس کے سامنے ڈنڈوت شروع کر دے۔ یا ایک شخص کے کپڑے میں جوئیں پڑ جائیں اور اس کو ستانے لگیں۔ تو نہانے اور کپڑے دھونے کی زحمت اٹھانے کے بجائے وہ ان کے دفع کرنے کی یہ تدبیر کرے کہ ہر صبح اس کی جے پکارنے لگے۔

اسی طرح انسان نے دیکھا کہ سانپ ڈستے ہیں، بچھو ڈنک مارتے ہیں، شیر اور بھیڑیے پھاڑ کھاتے ہیں۔ ان چیزوں کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی جہاں بہت سی حکمتیں ہیں وہاں ایک بہت بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ یہ انسان کو مدنیت، اجتماعیت اور صفائی کی اعلیٰ قابلیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے محرک کا کام دیتی ہیں۔ یہ چیزیں انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ جنگلوں کو صاف کر کے میدان بنائے، پہاڑوں کو تراش کر گھر بنائے، انفرادی زندگی کو ترک کر کے مدنی و اجتماعی زندگی اختیار کرے اور اس کے اندر حفاظت و مدافعت کی جو قابلیتیں پوشیدہ ہیں ان کو فروغ دے۔ اگر یہ درندے اور اژدہے نہ

تو انسان خود ہی درندوں کے جنگلوں اور اژدہوں کے غاروں میں رہنے والی ایک مخلوق بن جاتا اور مدنیت کے یہ سارے جلوے جو آج نظر آرہے ہیں، ان میں سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا۔ لیکن جن انسانوں کو یہ ساری تبدیلیاں شاق معلوم ہوئیں اور وہ جس حال میں تھے اسی میں انہوں نے پڑے رہنا چاہا! انہوں نے یہ سارے سبق کرنے کے بجائے ان کو جنگل کے دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش شروع کر دی کہ اس طرح ان کو راضی رکھ کر ان کے خطرات سے مامون رہ سکیں گے۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی کاہل الوجود انسان کسی گندی جگہ میں گھر گیا ہو یا کسی دھوئیں بھرے ہوئے مکان کے اندر بند ہو گیا ہو اور اس کی قوتِ شامہ اور اس کے تنفس کا دباؤ اسے مجبور کر رہا ہو کہ وہ باہر کسی کھلے میدان میں اور تازہ ہوا میں نکلے، لیکن اس کی کاہلی اس سے مانع ہو رہی ہو اور وہ غلاظت کے ڈھیر یا دھوئیں کی عبادت شروع کر دے کہ اے غلاظت کی روح! اور اے دھوئیں کے دیوتا! مجھ پر ترس کھاؤ، تمہاری دہائی ہے!

اسی طرح قدرت نے جو ہر گوشہ میں نہایت رحیم و مہربان واقع ہوئی ہے کبھی کبھی اپنے عدل اور جبروت کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے زمین کو ہلا دیا، کبھی پہاڑوں سے آگ برسا دی، کبھی ہواؤں کو طوفان بنا دیا، کبھی آسمان سے بجلیاں گرا دیں تاکہ انسان خدا کی رحمت کے غرہ میں اس کے عدل کو بھول نہ بیٹھے۔ بلکہ اس کے قہر و غضب کو بھی یاد رکھے کہ اگر اس میں طغیان پیدا ہوا تو خدا ان ہی چیزوں میں سے، جو اس کی نفع رسانی کے لیے ہر وقت سرگرم کار ہیں، جس چیز کو چاہے گا اس کے لیے سرکش بنا دے گا۔ لیکن انسان بجائے اس کے کہ ان تازیانوں کے ڈر سے خدا کی طرف بھاگتا وہ ان تازیانوں ہی کی طرف بھاگا اور جس طرح اس نے نعمتوں کو منعم کی حیثیت دے دی تھی اسی طرح اس نے نقمتوں کے ان ذرائع کو منتقم کا درجہ دے دیا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک بادشاہ جس نے اپنی رعیت کو ہر طرح کا امن و چین دے رکھا ہو کبھی کبھی اپنی فوجی قوتوں کا مظاہرہ

کرے کہ رعایا یاد رکھے کہ جس بادشاہ کے پاس امن و راحت کے یہ سامان ہیں اس کے قبضۂ قدرت میں تادیب و تعذیب کی یہ قوتیں بھی ہیں، لیکن رعایا یہ کرے کہ ان قوتوں ہی کو بادشاہ بنا کر انہی کی تعظیم و بندگی کرنے لگ جائے اور خود بادشاہ کو نظر انداز کر دے۔

اسی طریقہ پر وہ لوگ بھی معبود بن گئے جن کو ان کی سرکشی اور طغیان کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس لیے مہلت دی کہ وہ اپنی اجل مقدر کو پہنچ جائیں۔ نیز ان کے ذریعہ سے ان لوگوں کی جانچ ہو سکے جو کسی نوعیت سے ان کے زیر دست ہیں کہ وہ اپنی روح کے عہد پر قائم رہتے ہیں یا اپنے جسم و تن کے مفاد کے لیے ان سرکشوں ہی کے آگے جھک جاتے ہیں اور انہی کی ہاں میں ہاں ملانی شروع کر دیتے ہیں۔ اس زمرہ میں انسانوں کے اندر کے سرکش بھی شامل ہیں اور جنات کے اشرار بھی۔ دنیا کی پوری تاریخ میں ڈھیل اور آزمائش کا یہ قانون نمایاں نظر آتا ہے۔ فرعون، قارون، ہامان، ابولہب، ابوجہل اور ان کے راستوں پر چلنے والے تمام سرکش انسان ایک صف میں ہیں اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور محمد علیہم السلام اور اللہ کے تمام صالح اور مخلص و موحد بندے اس کی دوسری صف میں ہیں۔ یہ کشمکش ابتدا سے جاری ہے اور قانونِ الٰہی کے مطابق قیامت تک جاری رہے گی۔ کتنے ہیں جو اپنی روح کے تقاضوں کو جانتے ہوئے کسی طمع یا کسی اندیشہ سے ان جباروں اور طاغوتوں ہی کی عبادت شروع کر دیتے ہیں اور انہی کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں لیکن خدا کے کتنے بندے ایسے بھی نکلتے ہیں جو کسی حال میں بھی اپنے خدا اور اپنی روح سے شرمسار نہیں ہوتے اور نہ صرف خود ہی عہدِ الٰہی پر قائم رہتے ہیں، بلکہ دوسروں کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شر کے اسی خوف نے شر پرستی کو ایک مستقل دین بنا دیا ہے اور مجوسیوں نے خیر و شر کے دو خدا قرار دے کر دونوں کی پرستش کی اور ہندوؤں نے دنیاوی سلطنتوں کے ڈھنگ پر زندگی بخشنے والے، زندگی کی حفاظت کرنے والے اور زندگی لینے والے کی ایک تثلیث قائم کر دی۔ ایران اور ہندوستان کی تہذیب میں زمانۂ قدیم سے فلسفہ کا ذوق غالب رہا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنی حماقتوں پر فلسفہ کا ملمع

ل دیا ہے ورنہ غور کیجیے تو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ ان کے اندر جو شرک پایا جاتا ہے وہ بھی انہی راستوں سے آیا ہے جن راستوں سے دنیا کی دوسری قوموں کے اندر آیا ہے۔ تعجب ہے کہ ان قوموں پر فلسفہ کے غلبہ کے باوجود کائنات کے اضداد کے اندر توافق کا راز واضح نہ ہو سکا، حالانکہ اس کے ہر تضاد کے اندر وہی وحدتِ مقصد مضمر ہے جو زوجین میں ہوتی ہے اور قرآن نے اس کو گوناگوں شکلوں میں بیان کیا ہے۔ جس کی تفصیل ہم نے 'حقیقتِ توحید' میں بیان کی ہے۔

یہ چند مثالیں محض رہنمائی کے لیے ذکر کی گئی ہیں۔ آپ بت پرستی کی کوئی تاریخ اٹھا کر اس نقطۂ نظر سے پڑھ جائیے، آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ غیر اللہ کی اطاعت و عبادت، خواہ وہ مردہ خداؤں کی پوجا کی شکل میں ہو یا زندہ خداؤں کی بندگی کی صورت میں، نتیجہ ہے صرف انسانوں کی دناءت کا۔

اسی دناءت ہی کی ایک شکل تقلیدِ اعمیٰ بھی ہے۔ انسانوں کے ایک حصہ نے نہ تو کبھی خود حقیقت پر غور کیا نہ دوسرے کرنے والوں اور خدا کے بھیجے ہوئے بندوں کی دعوت پر غور کیا۔ انہوں نے باپ دادا کو جس ڈھرے پر پایا اسی پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہے۔ ان کو یہ کام بڑا مشکل معلوم ہوا کہ باپ دادا کے رستے سے کوئی الگ راہ نکالیں۔ لیکن اگر انسان جانور نہیں ہے، بلکہ ایک عاقل اور صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق ہے، تو جانور بن جانا اور اپنی عقل کو معطل کر دینا اس کی دناءت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

دنیا میں بہت سے ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو طریقۂ آبا کے اندھے مقلد نہیں تھے، بلکہ انہوں نے روشِ قدیم میں بہت کچھ تبدیلیاں پیدا کیں اور اپنے فکر و نظر کے زور سے وقت کے رجحانات کا رخ پھیر دیا۔ بعضوں نے اس راہ میں بڑی بڑی قربانیاں بھی کیں۔ یہاں تک کہ بعض ہمت وروں نے زہر کا پیالہ تک پی لیا، بایں ہمہ توحید کا راز ان پر نہ کھل سکا اور وہ انہی ضلالتوں میں بھٹکتے رہے جن میں ان کی پوری قوم جنگ

رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے تھے جو بہت سے عقبات طے کرنے کے باوجود قوم پرستی کے عقبہ کو عبور نہ کر سکے اور توحید خالص تک پہنچنے کے لیے یہ شرط ہے کہ آدمی کوئی تسمہ لگا نہ چھوڑے اور یہ سعادت یا تو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کو حاصل ہوتی ہے یا ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ان کی پیروی کی ہمت کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توفیق پائیں۔

اوپر ہم نے شرک کا جو سبب بیان کیا ہے قرآن مجید اور قدیم صحیفوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ؕ (لقمٰن - ۳۱ : ۱۳) (بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے)۔ ظلم عدل کا ضد ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی کی حق تلفی کرنا۔ اوپر ہم یہ بات تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ انسان پر سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے۔ پس اس کے حق میں کسی کو ساجھی قرار دینا لازماً سب سے بڑے حق کو تلف کرنا ہے۔ اس وجہ سے یہ ظلم عظیم ہوا اور حق تلفی کا دناءت ہونا بدیہی ہے اور جس درجہ کی حق تلفی ہوگی اسی درجہ کی دناءت بھی ہوگی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قدیم صحیفوں میں شرک کو چھنال سے تشبیہ دی گئی ہے۔ تورات میں یہ مضمون اکثر بیان ہوا ہے کہ خداوند خدا غیور ہے، جس طرح تم یہ نہیں پسند کرتے کہ تمہاری بیوی غیر کی بغل میں سوئے، اسی طرح وہ پسند نہیں کرتا کہ اس کا بندہ غیر کی بندگی کرے۔ قرآن مجید کی پاکیزگی بیان نے اس تشبیہ کو بعینہٖ تو نہیں اختیار کیا ہے، لیکن اس کے مفہوم کو نہایت خوبی کے ساتھ لے لیا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ قرآن میں مشرک اور زانی اور مشرکہ اور زانیہ کو ایک جگہ جمع کیا ہے، مثلاً سورۂ نور میں فرمایا ہے: اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۫ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (النور - ۲۴ : ۳) (زانی نکاح نہ کرنے پائے مگر کسی زانیہ یا مشرکہ سے اور کسی زانیہ سے نکاح نہ کرے مگر کوئی زانی یا مشرک۔ اور اہل ایمان پر یہ چیز حرام ٹھہرائی) دو چیزوں کا

ایک ساتھ اجتماع بغیر کسی اشتراک کے نہیں ہوا کرتا۔ اس اصل کو سامنے رکھ کر آدمی جب غور کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مشرک اور چھنال عورت میں نہایت گہری اخلاقی مناسبت ہے۔ چھنال اپنے تئیں ایک مرد کے حبالۂ عقد میں دیتی ہے، اس کو اپنی حرمت کا مالک بناتی ہے، اس سے نان و نفقہ اور تمام حقوق حاصل کرتی ہے اور پھر اس کے حق اور اس کی حرمت میں ایک غیر مرد کو شریک کرتی ہے۔ ٹھیک یہی حال ایک مشرک کا ہے۔ وہ خدا سے ربوبیت کا اقرار کرتا ہے، بلیٰ کہہ کر اس کے ساتھ اپنی بندگی کا عہد باندھتا ہے، رہتا اس کے گھر میں ہے، کھاتا اس کا کھاتا ہے، پانی اس کا پیتا ہے، کپڑے اس کے دیئے ہوئے پہنتا ہے اور اس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب اللہ تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے، لیکن اس کے باوجود وہ بندگی غیر کی کرتا ہے، محبت کا دم دوسروں کے لیے بھرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت ایک زانیہ کی ہو سکتی ہے یا ایک مشرک کی۔ روئے زمین پر یہی دو بے وفائیاں ایسی ہیں جو ایک دوسرے کے لیے مثال بن سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکوں کو قرآن نے خائن بھی کہا ہے اور خیانت عورت کی بے وفائی اور عہد شکنی کے لیے عربی زبان کا ایک مشہور لفظ ہے۔

یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہو گیا کہ قرآن مجید میں کیوں بار بار یہ بات آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری خطاؤں کو، جس کے لیے چاہے گا، معاف کر دے گا مگر شرک کو نہیں معاف فرمائے گا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک شریف اور غیور شوہر اپنی بیوی کی ہر غلطی معاف کر سکتا ہے، لیکن اس کی بے وفائی کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایسا کرے تو وہ شوہر نہیں ہے، بلکہ ایک دیوث، کمینہ، لئیم اور بے غیرت جانور ہے۔ جب انسان کی غیرت کا یہ عالم ہے تو پھر اس کی غیرت کا تصور کون کر سکتا ہے، جس کے جمال غیرت کے ایک ادنیٰ پرتو سے یہ تمام عالم جمال عفت و حمیت سے نورانی ہوا! وہ اس بندہ کو کیسے معاف کر سکتا ہے جس نے غیر کی بندگی کا داغ اپنے دامن پر لیا

ہے، چنانچہ فرمایا ہے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا	وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں
هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ	بادشاہ، یکسر پاک، سراپا سکھ، امن بخش،
السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ	معتمد، غالب، زور آور، صاحب کبریاء
الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ	اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن
سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ	کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

(الحشر - ۵۹ : ۲۳)

اس آیت کے اسمائے حسنیٰ میں سے خصوصیت کے ساتھ متکبر کی صفت پر غور کرنا چاہیے اور پھر اس بات کو دیکھنا چاہیے کہ اس کے ساتھ ہی کس طرح شرکاء اور ہمسروں سے اپنا پاک اور برتر ہونا بیان کیا ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو متکبر اور غیور ہے اور جس کے سوا کسی کے لیے بھی کبریائی زیبا نہیں ہے، اس کی غیرت و کبریائی کبھی کسی شریک کو گوارا نہیں کر سکتی۔

زنا اور شرک کی اسی مناسبت کی وجہ سے شرک کو جگہ جگہ رجس (ناپاکی) کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور مشرکوں کو نجس بھی کہا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان خانوں سے جو اس ناپاکی سے آلودہ ہیں اپنے حرم کو پاک کرنے کا حکم دیا ہے کہ خدا اپنے حرم میں بے وفاؤں کی موجودگی گوارا نہیں کر سکتا۔ اور یہ قانونِ الٰہی مقرر ہے کہ جو جماعت اس نجاست میں آلودہ ہو جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کی زد میں آجاتی ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ شرک کی اصل حقیقت سے واقف ہیں وہ پہلے سے اس قوم کی موت کا فیصلہ کر دیتے ہیں جو شرک کے جراثیم قبول کر لیتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ کسی قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کا غضب اس وقت مقدر ہو جاتا ہے جب وہ شرک کی نجاست میں آلودہ ہو جاتی ہے:

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝ (الاعراف - ۷ : ۷۱)	اس نے کہا، تم پر تمہارے رب کی جانب سے ناپاکی اور قہر مسلط ہو چکے ہیں۔ کیا تم مجھ سے کچھ فرضی ناموں کے بارے میں جھگڑ رہے ہو، جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں جن کی خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری، سو تم بھی منتظر رہو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

شرک سے خدا کے حقوق جس طرح تلف ہوتے ہیں یہ بالاجمال اس کا بیان تھا اب اس پہلو پر غور کیجیے کہ شرک خود اپنے نفس پر بھی سب سے بڑا ظلم ہے، اور اس اعتبار سے بھی یہ دناءت اور رذالت ہی ہے۔

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عزت بخشی ہے اور اس کو جو قوتیں اور قابلیتیں عنایت کی ہیں اگر وہ دو ناتوانیوں، یعنی بچپن اور بڑھاپے کی بے چارگیوں کے درمیان گھری ہوئی نہ ہوتیں تو اس کے لیے دعوائے فرعونی بھی ناموزوں نہ تھا۔ اس کی طبیعت کی بلندی اور تمام کائنات پر اس کے شرف و فضیلت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ کسی کی بندگی کرنے کے بجائے خود معبود بننے کا خواہش مند ہو۔ لیکن ان تمام عظمتوں کے باوجود جب وہ دیکھتا ہے کہ نہ میں خود اپنے آپ کو اس دنیا میں لایا ہوں، نہ یہاں اپنے آپ کو رکھنے ہی پر قادر ہوں اور نہ میں نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان کسی چیز کو بنایا، نہ ایک مکھی یا بھنگے کے بنا سکنے کی ہی مجھے قوت حاصل ہے تو وہ ضعف و عجز کے تذلل اور شکر و سپاس کے خشوع کے ساتھ ایک ان دیکھی ہستی کے سامنے اپنے تئیں ڈال دیتا ہے اور یہ وہ اس لیے کرتا ہے کہ ایسا کرنے پر اپنے آپ

کو مجبور پاتا ہے۔ اس کے بغیر نہ اس کی عقل مطمئن ہوتی ہے، نہ اس کے دل کو چین نصیب ہوتا ہے، نہ اس کائنات کا معمہ ہی حل ہوتا ہے۔ یہ کر چکنے کے بعد جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے اس کے دل کی ساری پریشانیاں اور عقل کی ساری الجھنیں دور ہو جاتی ہیں اور کائنات کے اسرار کو حل کرنے کے لیے اس کو وہ سراغ جاتا ہے جس سے ساری گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اس ایک کے سوا کچھ اور بھی ہیں جن کے آگے سر جھکانا ہے تو اس کا بارِ ثبوت اس شخص کے ذمہ ہے۔ وہ تو یہ کہہ کر الگ ہو جائے گا کہ میرے نفس کی بلندی نے یہ ایک کے آگے پست ہونا اس لیے گوارا کر لیا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں تھی اور اس کے بارہ میں ہم اور تم دونوں متفق ہیں۔ باقی اس کے علاوہ جن کا تم ذکر کرتے ہو ان کی دلیل تم خود لاؤ، مجھے خواہ مخواہ بہت سے خدا بنانے کا شوق نہیں ہے۔ میرے لیے تو ایک ہی رب، و مولیٰ بس ہے۔ جب کوئی غلام یہ نہیں پسند کرتا کہ کئی آقاؤں کی غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے تو میں یہ ذلت، و دناءت کیوں گوارا کروں کہ بہت سے ارباب کا بندہ بنوں؟

ارباب متفرقون خیر ام
اللہ الواحد القھار۔

کیا الگ الگ بہت سے رب بہتر ہیں،
یا اکیلا اللہ ہی سب پر حاوی و غالب؟

(یوسف - ۱۲ : ۳۹)

ضرب اللہ مثلا رجلا فیہ
شرکاء متشاکسون ورجلا
سلما لرجل ہل یستوین مثلا
الحمد للہ بل اکثرھم
لا یعلمون۔

اللہ مثیل بیان کرتا ہے ایک غلام کی
جس میں کئی مختلف الاغراض آقا شریک ہیں
اور ایک دوسرے غلام کی جو پورے کا پورا
ایک ہی آقا کی ملک ہے۔ کیا ان دونوں کا
حال یکساں ہو گا۔ سزاوار شکر صرف اللہ ہے،
لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں سمجھتی۔

(الزمر - ۳۹ : ۲۹)

لیکن جاہل الفطرت تھے انھوں نے اپنے نفس کی کوئی قدر نہیں کی اور خدا کی خلافت کا رتبہ پاکر انھوں نے اپنے حقیر سے حقیر خادموں اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا رب بنایا اور اپنے نفس کی وہ اہانت کی جس سے بڑی کوئی اہانت نہیں ہو سکتی: "وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ" (الحج - ۲۲ - ۱۸) (اور جن کو خدا ذلیل کردے تو ان کو کوئی دوسرا عزت دینے والا نہیں بن سکتا)۔ "وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ" (الحج - ۲۲ - ۳۱) (اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے، اس کی مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے گرے اور چڑیاں اس کو اچک لیں یا ہوا اس کو کسی اور دور دراز جگہ میں لے جا پھینکے) میں اسی رذالت و دناءت کی طرف اشارہ ہے۔

۲

حقیقتِ توحید

مقدمہ

توحید کے دلائل پر غور کرنے سے پہلے چند امور کو بطور مقدمہ سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے۔

قرآن کے اولین مخاطب:

قرآن مجید کے اولین مخاطبوں میں سے کوئی گروہ بھی، جیسا کہ 'حقیقتِ شرک' میں ہم بیان کر چکے ہیں، خدا کا منکر نہیں تھا۔ بنی اسماعیل تھے جو نہ صرف یہ کہ خدا کو مانتے تھے بلکہ اس کے لیے بہت سی اعلیٰ صفتوں کا بھی اقرار کرتے تھے۔ ان میں جو کفر تھا وہ خدا کے انکار کی بنا پر نہیں تھا بلکہ بعض ایسی باتوں کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے تھا، جن سے خدا کی اعلیٰ صفات یا ان کے لوازم کا انکار لازم آتا تھا یا ان صفات اور ان کے لوازم میں دوسروں کی حصہ داری لازم آتی تھی۔ بنی اسرائیل تھے، جو خدا اور اس کی تمام صفاتِ حسنیٰ کے بھی قائل تھے اور ان کے لوازم اور نتائج کا بھی اقرار کرتے تھے لیکن ساتھ ہی بعض ایسی اعتقادی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے تھے جو ان کے تسلیم کردہ عقائد سے بالکل متناقض تھیں اور جن سے یا تو کفر لازم آتا تھا یا شرک —— چنانچہ قرآن مجید نے ان دو گروہوں سے ان کو منکرِ خدا فرض کر کے گفتگو نہیں کی ہے بلکہ ان کے مسلمات کو بنیاد قرار دے کر ان کی صرف ان باتوں کی تردید فرمائی ہے جو انہوں نے ان مسلمات

سے بالکل متناقض اپنے اندر جمع کر لی تھیں۔

یہ حال صرف قرآن کے ابتدائی مخاطبوں ہی کا نہیں تھا بلکہ، جیسا کہ ہم نے 'حقیقتِ شرک' میں بیان کیا ہے، دنیا کی قدیم قوموں میں خدا کا انکار بہت کم پایا جاتا ہے۔ ماضی کی تمام قوموں میں کسی نوعیت سے ایک معبود کا تصور ضرور موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تصور کے اردگرد ایسے اوہام کا حصار ہے کہ نہ تو اس سے اس کائنات کے معمہ کو حل کرنے کے لیے کوئی روشنی حاصل ہوئی نہ ایمان وعمل صالح کی بنیادیں استوار ہوئیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ خدا کا انکار، جو بداہت کا انکار ہے، صرف عہدِ حاضر کی پیداوار ہے۔ اس طرح کی سوفسطائیت اگر تاریخ میں کبھی ظاہر بھی ہوئی ہے تو وہ صرف ایک چھوٹے سے حلقہ کے اندر محدود رہی ہے۔ ایک باضابطہ دین کی حیثیت اس نے صرف اس زمانہ میں حاصل کی ہے۔

قرآن کا طرزِ استدلال:

یہی وجہ ہے کہ قرآن اثباتِ الوہیت کے باب میں، ہمارے متکلمین کے طریقہ پر، اثباتِ باری سے اپنی بحث کا آغاز نہیں کرتا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس کا سارا خطاب مقتضائے حال سے بعید اور کلامِ موثر کی خصوصیات سے محروم ہو جاتا اور وہ حکمتِ بالغہ، جس نے دلوں اور روحوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی، ایک خشک و بے اثر منطق نہ جدل کی شکل اختیار کر لیتی اور کلام کا یہ حصہ بالکل بے موقع اور بے ضرورت ہو جاتا۔ بلکہ قرآن نے اپنے مخاطبوں کی ذہنیت کے اعتبار سے ان پر حجت قائم کی اور ان کی رایوں اور ان کے عقائد میں جو غلطی اور کجی تھی وہ ان کے سامنے کھول کر رکھ دی کہ یا تو وہ صحیح اور صریح حق کو قبول کریں اور اگر اس سے انکار کریں تو ہٹ دھرمی اور حمیتِ جاہلیت کے سوا ان کے لیے کوئی اور جائے پناہ باقی نہ رہ جائے۔

لیکن چونکہ الوہیت کا مسئلہ نہایت اہم ہے، یہ مرکزِ دین اور مبدأ ایمان ہے، جب تک یہ سرا ہاتھ نہ آجائے اس وقت تک نہ اس کائنات کا معمہ حل ہو سکتا ہے نہ آدمی کا کوئی قدم آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ حق و باطل اور تبرّا و تم کے اصول قائم ہو سکتے ہیں۔ نیز قرآن مجید ایک ابدی ہدایت کا صحیفہ ہے۔ کسی خاص قوم یا کسی خاص عہد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس کو بنی نوع آدم کی تمام گمراہیوں کا قیامت تک کے لیے علاج کرنا ہے۔ اس وجہ سے اس نے اس باب میں ایک ایسا جامع اسلوب بیان اختیار فرمایا جس سے ایک طرف اللہ تعالیٰ کا تمام صفاتِ کمال مثلاً خلق، رحمت، علم، قدرت، عدل اور حکمت وغیرہ سے متصف ہونا ثابت ہو، تاکہ ان لوگوں پر حجت پوری ہو سکے جو کسی نہ کسی نوعیت سے کسی معبود کا عقیدہ تو رکھتے ہیں لیکن اس کی حقیقی صفات کے تصور سے قاصر ہیں اور دوسری طرف ان لوگوں پر بھی حجت قائم ہو سکے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کے قائل نہ ہوں۔

پس قرآن میں الوہیت کا دعویٰ، مخاطب کے اعتبار سے تین مختلف شکلوں میں نمودار ہوا ہے۔ ایک شکل وہ ہے جو خالص منکرین کے لیے حجت ہے۔ ان کے لیے جابجا توحید کی تقریر ایسے جامع اسلوب میں ہوئی ہے کہ اس سے خدا کا اثبات بھی ہوتا ہے اور اس کی یکتائی بھی ثابت ہوتی ہے۔ دوسری شکل ان لوگوں کے لیے اختیار کی گئی ہے جو خدا کو تو مانتے ہیں، لیکن اس کے صفاتِ حسنیٰ کے تصور میں بھٹک گئے ہیں۔ ان کے سامنے خدا کے صفاتِ حسنیٰ سے متصف ہونے پر تقریر کی گئی ہے۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو خدا کو صفاتِ کمال سے متصف تو مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی بعض متناقض اعمال و معتقدات میں گرفتار ہیں۔ ان کے سامنے ان باتوں کی تردید کی گئی ہے جو انہوں نے اپنے اقرار سے بالکل مختلف اپنے اندر جمع کر لی ہیں۔

استدلال کی مذکورہ بالا دو قسموں کے مخاطب بالعموم بنی اسماعیل ہیں۔ ہر چند وہ خدا

کے منکر نہ تھے، لیکن خدا کی صفات کے باب میں ان کا ذہن نہایت الجھا ہوا تھا۔ اس وجہ سے قرآن نے ان کے سامنے توحید کی تقریر اس طرح فرمائی کہ وجود باری کے باب میں بھی ان کے ذہن کی ساری الجھنیں دور ہو جائیں۔ چنانچہ ان کو مخاطب کر کے قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ قیامت تک کے لیے ان تمام گروہوں پر حجت ہے جو منکر و ملحد ہیں یا خدا کی صفات کے باب میں ان کے دماغ میں الجھنیں ہیں۔ استدلال کی تیسری قسم کے مخاطب اصلاً بنی اسرائیل ہیں جو تورات اور انجیل پر ایمان کے مدعی تھے، لیکن اپنے مسلمات کے بالکل خلاف انھوں نے بہت ساری باتیں مان رکھی تھیں۔ ان پر جس نہج سے دلیل قائم کی گئی ہے وہ قیامت تک کے لیے ان تمام گروہوں پر حجت ہے جو خدا کی صفات اور ان کے لوازم کے باب میں کسی علمی و اعتقادی تناقض میں مبتلا ہوں۔ بعض مقامات میں اس طرح کے استدلال کے مخاطب بنی اسماعیل بھی ہیں۔ لیکن اس کی ایک خاص حد ہے۔ جس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

قرآنی استدلال کی اساس:

اسی طرح قرآنی استدلال کی اساس اور اس کے مبدأ و ماخذ کو بھی سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ قرآن کے دلائل یا تو مخاطب کے اقرار پر مبنی ہوتے ہیں یا ایسے مستقل اصولوں پر قائم ہوتے ہیں جو مخاطب کے اقرار و انکار سے بالکل بالاتر ہوتے ہیں۔ پھر اس دوسری قسم کی دو قسمیں ہیں یا تو ان دلائل کا ماخذ خود انسان کے نفس کے اندر ہے یا خارج میں۔ پہلی قسم کو ہم دلائلِ انفس سے تعبیر کریں گے اور دوسری کو دلائلِ آفاق سے۔ یہ سب ملا کر قرآنی استدلال کی تین قسمیں ہوئیں۔

۱۔ وہ استدلال جو مخالف کے اقرارات و اعترافات پر مبنی ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں۔ مثلاً جو قومیں کسی الہ کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان تمام صفتوں اور باتوں

کو مانیں جن پر یہ لفظ مشتمل ہے یا جو قومیں اللہ کی بنیادی صفتوں کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان صفتوں کو بھی مانیں جو ان صفتوں کے لوازم میں سے ہیں۔ نیز ان صفات سے اس کی تنزیہ کریں جو ان صفات کے منافی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ان صفتوں کے تسلیم کرنے سے آدمی پر جو ذمہ داریاں اور حقوق واجب ہوتے ہیں ان کا بھی اقرار کریں۔ نیز جو قومیں کوئی آسمانی صحیفہ رکھتی ہیں یا اپنے پیچھے کوئی تاریخ رکھتی ہیں یا اپنی سوسائٹی کے اندر نیکی اور بدی کا کوئی اخلاقی ضابطہ رکھتی ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی بنیادی صداقتوں سے، ان کے معروف مسلمات سے، اور ان کے بدیہی منطقی نتائج سے گریز نہ کریں۔ ایسا کرنا اپنے تسلیم کردہ مقدمہ سے فرار اور خود اپنے منہ سے اپنے آپ کو جھٹلانا ہے۔

۲۔ دوسری قسم دلائلِ آفاق کی ہے۔ اس کے بھی مختلف پہلو ہیں۔ سب سے پہلے وہ قوانین ہیں جن کا اس کائنات میں ہر آن مشاہدہ ہو رہا ہے اور جن سے ایک خدا کی اور اس کی ان تمام صفتوں کی شہادت مل رہی ہے جو قرآن نے خدا کے لیے بیان کی ہیں۔ پھر وہ قوانین ہیں جو اس کائنات کے واقعات و حوادث اور قوموں کے عروج و زوال میں کارفرما نظر آتے ہیں اور جو درحقیقت انہی صفات کے مظاہر ہیں جن سے خالقِ کائنات متصف ہے۔

۳۔ تیسری قسم دلائلِ انفس کی ہے۔ ان کا ماخذ درحقیقت خود انسان کا نفس ہے اور اس سے ہماری مراد وہ فطری وجدان و اذعان ہے جو فاطر السمٰوٰت والارض نے نفوس کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔ اس کے بعض پہلو بالکل واضح ہیں اور ہم برابر ان کا احساس کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو غافل و جاہل انسانوں کی نگاہوں سے کبھی کبھی اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن قدرت مختلف آزمائشیں بھیج بھیج کر ان پر تنبہ کرتی رہتی ہے۔

قرآن نے اپنے استدلال کے ان تینوں ماخذوں کی خود تصریح کی ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ	ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں
وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ	گے اور خود ان کے اندر بھی یہاں تک کہ ان
لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ	پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن بالکل حق ہے۔
بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۔	اور کیا تیرے رب کا ہر بات کا شاہد ہونا کافی
اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ	نہیں ہے؟ آگاہ کہ یہ لوگ اپنے رب کے
رَبِّهِمْ ۭ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ	حضور پیشی کے باب میں شک میں ہیں!
مُّحِيْطٌ ۔	آگاہ کہ وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے!

(حٰمٓ السجدۃ - ۴۱: ۵۳-۵۴)

ان آیات میں دعویٰ روزِ جزا اور قیامت ہے۔ اس پر پہلے دلائلِ آفاق کا حوالہ دیا ہے۔ پھر دلائلِ انفس کا ذکر فرمایا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی صفات سے استدلال کیا ہے جن کا یا تو مخاطب کو اقرار ہے یا ان صفات کا اقرار ہے جن پر یہ صفتیں مبنی ہیں۔

اس سے زیادہ واضح مثال سورۂ ذاریات میں ہے:

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۔	اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین کرنے
وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۔	والوں کے لیے اور خود تمہارے اندر بھی،
وَفِي السَّمَاۗءِ رِزْقُكُمْ وَمَا	کیا تم دیکھتے نہیں! اور آسمان میں تمہاری
تُوْعَدُوْنَ ۔ فَوَرَبِّ السَّمَاۗءِ	روزی بھی ہے اور وہ چیز بھی جس کی تم کو
وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ	وعید سنائی جا رہی ہے۔ پس آسمان و
اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ۔	زمین کے خداوند کی قسم، یہ بات شدنی ہے
(الذّٰریٰت - ۵۱: ۲۰-۲۳)	جس طرح تم بول دیتے ہو۔

یہاں بھی دعویٰ جزا و سزا کا وقوع ہے۔ ان آیات سے اوپر اسی دعوے پر آسمان و زمین کی شہادتیں پیش کی ہیں جن سے نہایت واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کائنات

کے فاطر کی پسند یہ نہیں ہو سکتی کہ وہ اس دنیا کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ دے۔ اس کائنات کے سنن و قوانین اور اس کی تاریخی سرگزشتیں اور ان کے احوال و نتائج اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ بدلہ کا ایک دن ضرور آنے والا ہے جس دن بدکار اپنی برائیوں کا بدلہ پائیں گے اور نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ ملے گا اور پھر ایک جامع بات فرمائی کہ آسمان و زمین اور تمہارے نفوس کے اندر دلیلیں موجود ہیں۔ یہ آفاقی و انفسی دلائل کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد آسمان و زمین کے رب کی قسم بطور شہادت کھائی اور اصل دعویٰ پر اپنی ربوبیت سے استدلال کیا۔

یہ دو مثالیں قرآن مجید سے ہم نے محض یہ دکھانے کے لیے بیان کی ہیں کہ قرآن نے اپنے استدلال کی بنیادیں خود بیان فرما دی ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ ان تینوں ماخذوں سے قرآن نے اپنے بنیادی دعاوی: توحید، رسالت اور معاد پر کس کس طرح استدلال کیا ہے تو اس کی تفصیل اپنے اپنے محل میں آئے گی۔ یہاں ہمارا مقصود بالاجمال قرآنی استدلال کی اساسات کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

بعض ضروری تنبیہات:

لیکن ہمارے اس بیان سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم نے جس طرح قرآن کے استدلال کو علیحدہ علیحدہ قسموں میں بانٹ دیا ہے اسی طرح قرآن میں ان کا بیان بھی الگ الگ ہے بلکہ جس طرح آپ نے دیکھا کہ مخاطب کے اعتبار سے قرآن کے طرزِ استدلال اور اس کی اساسِ استدلال میں تبدیلیاں ہوئی ہیں اسی طرح مخاطب کے اختلاف ہی کی وجہ سے اس کے بیان کی بلاغتوں کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کہیں صرف مخاطب کے مسلمات سے حجت پیش کی گئی ہے۔ کہیں دلائلِ انفس مذکور ہوتے ہیں اور کہیں تینوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح اصل دعویٰ میں بھی اشتراک و انفراد ہے۔ کہیں

توحید پر استدلال ہے، کہیں صرف معاد پر، کہیں ان میں سے دو جمع کر دیے گئے ہیں اور کہیں تینوں کا اجتماع ہے۔ ان میں فرق و امتیاز کرنا ایک ناقد بصیر کا کام ہے۔ پھر قرآن میں استدلال کا طریقہ بالکل فطری ہے اس وجہ سے جو لوگ استدلال و نظر کے صرف مصنوعی طریقوں ہی کے عادی ہیں وہ قرآنی استدلال کی اصل قوت کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور طرح طرح کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

بعض بے خبر یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی تمام بنیاد تحکم پر ہے جو بات وحی سے معلوم ہو گئی وہ حق ہے، اس کی کوئی دلیل ہو یا نہ ہو۔ بلاشبہ اہلِ ایمان کے لیے اللہ اور رسول کا فرما دینا ہی دلیل ہے، لیکن مذہب مومنوں کے اندر نہیں منکروں کے اندر آیا ہے اور ان کے لیے اللہ و رسول کا فرمانا کوئی دلیل نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس فرمان کی بنیاد کسی ٹھوس عقلی و فطری حقیقت پر نہ ہو۔ چنانچہ قرآن نے، جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے، عالم انفس اور عالم آفاق کو بطور ماخذ استدلال کے استعمال کیا ہے اور ہر باب میں اپنے دعاوی کی مطابقت آفاق و انفس کے قوانین و سنن سے دکھائی ہے اور بار بار یہ بات واضح کی ہے کہ جن باتوں کی شہادت کائنات کے ہر گوشہ سے مل رہی ہے اور انسانی فطرت جن حقائق پر گواہی دے رہی ہے قرآن انہی حقائق کا داعی ہے۔ پس نہایت ضروری ہے کہ دین کے اساسی مسائل سے متعلق قرآن کے ان دلائل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تاکہ شریعت اور عالم انفس کی باہمی موافقت کے اسرار بے نقاب ہوں اور جو لوگ قرآن کی عقلیت کی طرف سے بدگمان ہیں ان کی بدگمانی رفع ہو۔

اس مقدمہ میں ان امور پر تنبیہ اس لیے ضروری تھی کہ جو لوگ قرآن کے اولین مخاطبوں کی مختلف جماعتوں اور ان کی خصوصیات و حالات سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں یا قرآن کے طرزِ استدلال میں مخاطب کا جس قدر لحاظ کیا گیا ہے اس کی اہمیت سے بے خبر ہیں، یا ان اساسات کو نہیں جانتے جن پر قرآن کا استدلال مبنی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ

قرآن کا سارا استدلال خطی اور الزامی قسم کا ہے۔ اس کو فلسفیانہ براہنیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ یونانی علوم سے متاثر و مرعوب ہوئے وہ اسی سوءظن کی وجہ سے قرآن سے محروم رہے۔ وہ یا تو قرآن کی طرف آئے نہیں اور اگر آئے تو اس معدن کو (العیاذ باللہ) مزبلہ سمجھ کر آئے، جہاں ان کو صرف الزامی اور خطیبانہ انداز کی دلیلوں کی توقع تھی، براہنیات کے جواہر ریزوں کی امید نہیں تھی۔ قرآن کی نسبت اسی بدگمانی میں اس زمانہ کے وہ مسلمان بھی مبتلا ہیں جو جدید فلسفہ و سائنس سے مرعوب ہیں۔ ان کو عام طور پر یہ وہم ہے کہ قرآن مجید کی عقلیت صرف متوسط درجہ کے دماغوں کو اپیل کر سکتی ہے، خواص اور عقلاء کے مبلغ ادراک سے اس کا استدلال (العیاذ باللہ) فروتر ہے۔ ان لوگوں کی غلط فہمی کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ وہ نہ تو قرآنی استدلال کی اساسات سے واقف ہیں اور نہ اس بات سے واقف ہیں کہ مخاطب کے اعتبار سے یہ استدلال کن گوناگوں شکلوں میں نمودار ہوا ہے۔ ہم اس حصہ میں چاہتے ہیں کہ توحید سے متعلق قرآنی استدلال کی وضاحت کریں تاکہ دین کی حجت واضح ہو۔

اس حصہ میں مباحث کی ترتیب :

اس حصہ میں مباحث کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے :

توحید کے عمومی دلائل :

۱۔ دلائلِ آفاق۔

۲۔ دلائلِ انفس۔

توحید کے خصوصی دلائل :

۱۔ دلائل بلحاظ مسلمات مخاطب۔

۲. پچھلے مباحث کا خلاصہ۔

۳. عقیدۂ توحید کے اثرات فرد اور جماعت پر۔

۴. عقیدۂ توحید کی اہمیت دین میں۔

یہ حصہ چونکہ حقیقتِ شرک کا تتمہ ہے اس وجہ سے اس کے مطالعہ سے پہلے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس حصہ کا اصل مقصود صرف توحید کے دلائل کی توضیح ہے۔ بقیہ مباحث جو اس باب سے متعلق ہیں وضاحت کے ساتھ 'حقیقتِ شرک' میں بیان ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو باتیں قلم سے حق نکلی ہیں ان کو دلوں میں جگہ دے اور جہاں کہیں کوئی لغزش ہوئی ہے اس کے اثر کو محو فرمادے۔

باب ا

توحید کے عمومی دلائل

دلائلِ آفاق

یہ دنیا، جو ہماری آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، مختلف پہلوؤں سے نہ صرف ایک علۃ العلل پر، بلکہ ایک ایسے معبودِ حقیقی پر شاہد ہے جو تمام صفاتِ کمال سے متصف ہے۔ اور اس شہادت کی بنیاد ایسے امور پر ہے جن کا ہم خارج میں مشاہدہ کرتے ہیں اور جن کے بارہ میں ہماری عقل اور ہماری فطرت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم ان کو کسی ایسی ذات کی طرف منسوب کریں جو ان کی مصدر ہو سکے۔ ان امور کو قرآن کی زبان میں آیاتؔ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہم اس باب میں بقدرِ ضرورت ان کی شرح کریں گے۔

۱- کائنات کا حسن وجمال:

سب سے پہلی چیز جو ہماری نظر کو متوجہ کرتی ہے وہ اس کائنات کا حسن وجمال ہے، جو ہر گوشہ میں جلوہ آرا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی سادہ و بے رنگ نہیں ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک کوئی چپہ ایسا نہیں ہے جہاں سے انسان غافل و بے پروا گزر سکے۔ ہر جگہ اس کے دل کو کھینچنے، اس کی آنکھوں کو بیدار کرنے اور کانوں کو کھولنے کے لیے دلفریب مناظر، بے حجاب جلوے اور شیریں نغمے موجود ہیں اور ساتھ ہی انسان کے اندر حسن کا نہایت گہرا احساس ودیعت کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے جب وہ اپنے

اردگرد حسن وجمال کے یہ بوقلموں جلوے دیکھتا ہے، دفعۃً اس کے اندر ان کے صانع کے متعلق سوال پیدا ہوجاتا ہے۔ کیونکہ وہ یہ تصور کرنے سے بالکل قاصر ہے کہ اتنی دلفریبیوں سے یہ معمور دنیا خود بخود وجود میں آگئی اور اگر اس پر حیوانی بلادت کا غلبہ نہیں ہوتا تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے:

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ؕ — پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا!

(المؤمنون - ۲۳: ۱۴)

یعنی صرف اسی بات کا احساس ہوتا کہ اس کائنات کا ایک خالق (DESIGNER) ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ بہترین خالق ہے، یکسر خیر و برکت ہے، اس نے جو چیز بھی بنائی ہے وہ کمال قدرت، کمال صنعت اور کمالِ خیر و برکت کا نمونہ ہے: اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (السجدۃ - ۳۲: ۷) (جس نے جو چیز بھی بنائی ہے خوب ہی بنائی ہے)۔

ظاہر ہے کہ دنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام رنگارنگ حسن آرائیوں کی محتاج نہ تھی ممکن تھا کہ یہ زمین ہوتی لیکن اس میں یہ باغ و چمن، یہ نشیب و فراز، یہ وادی و کہسار نہ ہوتے۔ ممکن تھا کہ یہ فضا ہوتی لیکن اس میں نسیم کے جھونکے اور چڑیوں کے چہچہے نہ ہوتے۔ ممکن تھا کہ یہ آسمان ہوتا مگر یہ ستاروں کی بزم آرائیاں، شفق کی جلوہ کاریاں اور قوسِ قزح کی رنگ رنگیاں نہ ہوتیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دنیا ان تمام جلوؤں سے معمور ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ انسان کی حسِ باطن کو بیدار کرے اور اس میں یہ بصیرت پیدا ہو کہ ایسی حسین و جمیل دنیا بغیر کسی خالق کے وجود میں نہیں آسکتی اور وہ خالق صرف خالق ہی نہیں بلکہ کمالِ قدرت، کمالِ صنعت و حکمت اور کمالِ خیر و برکت کی صفات سے

متصف ہے :

أَفَلَمْ يَنظُرُوٓا۟ إِلَى ٱلسَّمَآءِ	کیا انھوں نے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا
فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَـٰهَا وَزَيَّنَّـٰهَا	کس طرح ہم نے اس کو بنایا اور اس کو
وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ ۝ وَٱلْأَرْضَ	سنوارا اور کہیں اس میں کوئی رخنہ نہیں اور
مَدَدْنَـٰهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا	زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ گاڑ
رَوَٰسِىَ وَأَنۢبَتْنَا فِيهَا مِن	دیے اور اس میں ہر قسم کی خوش منظر چیزیں
كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَ	اگائیں ، ہر متوجہ ہونے والے بندے کی
ذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ۝	بصیرت اور یاد دہانی کے لیے !

(قٓ - ۵۰ : ۶-۸)

یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص آسمان و زمین کے ان جلووں کو دیکھے اور یوں ہی گزر جائے۔ اگر آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو اس دنیا کا مشاہدہ خود بخود انسان میں خدا اور اس کی صفاتِ حسنیٰ کا یقین پیدا کرتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ واقعہ کی اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے :

أَفَرَءَيْتُمُ ٱلنَّارَ ٱلَّتِى تُورُونَ ۝	ذرا غور کرو اس آگ پر جس کو جلاتے ہو!
ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَآ	کیا تم نے پیدا کیا ہے اس کے درخت کو
أَمْ نَحْنُ ٱلْمُنشِـُٔونَ ۝ نَحْنُ	یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں! ہم نے
جَعَلْنَـٰهَا تَذْكِرَةً وَمَتَـٰعًا	اس کو یاد دہانی اور صحرا کے مسافروں کے
لِّلْمُقْوِينَ ۝	لیے ایک نہایت نفع بخش چیز
(الواقعة - ۵۶ : ۷۱-۷۳)	بنا دیا ہے۔

آیت کا آخری حصہ خصوصیت کے ساتھ لائقِ توجہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا کی چیزیں صرف ہماری کسی مادی ضرورت ہی کو نہیں پورا کرتیں، بلکہ ان میں

سے ہر ایک کی تخلیق میں حسن و خوبروئی اور کمال صنعت کی ایسی نمود ہے کہ وہ آپ سے آپ ایک اعلیٰ اور برتر حقیقت پر ایمان لانے کے لیے متنبہ بھی کرتی ہیں۔ اور یہ متنبہ کرنا محض ان کا ضمنی مقصد نہیں ہے، بلکہ ان کا اصلی وظیفہ ہی یہی ہے چنانچہ آیت میں تذکرۃ کا لفظ متاع پر مقدم ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا اصلی مقصد یاد دہانی ہے۔ سامانِ معیشت ہونا ان کا ایک مزید فائدہ ہے۔ جن لوگوں کی حسِ باطن بیدار ہوتی ہے ان کو اشیاء کا یہی پہلو سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے، لیکن جن کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے اور بطن و فرج کی لذات کے سوا جن کے سامنے کوئی اور اعلیٰ مقصد نہیں رہ جاتا، ان کی آنکھیں خوردبینوں اور دوربینوں سے مسلح ہونے کے باوجود، اسی حقیقت کو دیکھنے سے قاصر رہ جاتی ہیں، جو فی الحقیقت ہر شے کے اندر سب سے زیادہ ابھری ہوئی ہے۔ چنانچہ قرآن نے ایسے لوگوں کو چوپایوں سے تشبیہ دی ہے اور ان کی نسبت فرمایا ہے کہ ان کے کان ہیں، لیکن سنتے نہیں، آنکھیں ہیں، لیکن دیکھتے نہیں، دل ہیں، لیکن سمجھتے نہیں۔

یہ رنگا رنگ جلوے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، صرف ایک علۃ العلل کی شہادت نہیں دیتے، بلکہ ایک ایسے خالق کی شہادت دیتے ہیں جو صفات جمال و کمال سے متصف ہے۔ کیونکہ ہم صرف یہی نہیں دیکھتے کہ یہ دنیا بنی ہے، بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ جو چیز بنی ہے خوب بنی ہے۔ جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ کامل ہے، حکیم ہے، قدیر ہے، علیم ہے، مہربان ہے، کریم ہے۔ اس نے ہمیں جیسا تیسا پیدا ہی نہیں کر دیا ہے، بلکہ بہترین ساخت پر، بہترین قویٰ اور قابلیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین - ۹۵ : ۴)

(ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا) نیز فرمایا:

يٰٓأَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ — اے انسان! تجھے تیرے رب کریم

بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ الَّذِیْ
خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ
فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ
(الانفطار ۸۲ : ۶ - ۸)

کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں
ڈال رکھا ہے، جس نے تیرا خاکہ بنایا،
پھر تیرے نوک پلک سنوارے اور تجھے
بالکل موزوں کیا، جس شکل پر چاہا تجھے
متشکل کر دیا۔

اس نے پیٹ بھرنے کے لیے ہمیں صرف غلہ ہی نہیں دیا، بلکہ لطف اندوزی کے لیے پھل اور طرح طرح کے میوے بھی پیدا کیے اور مشام نوازی اور نظر بازی کے لیے پھول بھی کھلائے اور چمن بھی اگائے:

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ
فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ
ذَاتُ الْاَكْمَامِ وَالْحَبُّ
ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ

(الرحمٰن ۵۵ : ۱۰ - ۱۲)

اور زمین کو اس نے بچھایا خلق کے لیے۔
اس میں میوے اور کھجوریں جن پر غلاف
چڑھے ہوئے ہیں اور بھس والے اناج
بھی ہیں اور خوشبو دار پھول بھی۔

ظاہر ہے یہ صرف خلق نہیں، بلکہ کمالِ خلق اور کمالِ قدرت ہے، صرف بخشنا نہیں بلکہ کرم و بخشش اور رحمت و عنایت کے ساتھ بخشنا ہے، صرف زندہ رکھنا نہیں ہے بلکہ اس طرح پالنا ہے جو کمالِ ربوبیت و پروردگاری کی شان ہے۔

یہ وہ نتیجہ ہے جو اس کائنات کے اجزاء کے حسن و جمال کے مشاہدہ سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن جب ہم ان اجزاء کے انفرادی وجود سے گزر کر ان سے ترکیب پائی ہوئی اس حسین وحدت یعنی اس مجموعی دنیا کے حسن و جمال کو دیکھتے ہیں تو ہم پر ایک اور حقیقت روشن ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اس کائنات کا خالق وحدہٗ ایک ہی ہے، کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ یہ کائنات آسمان سے لے کر زمین تک ایک ہی سجائی بزم

ہے جس کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ سے مجموعہ کے حسن و جمال میں اضافہ کر رہی ہے۔ جس طرح ہم ایک حسین، متناسب الاعضاء اور خوب صورت چیز کو دیکھتے ہیں تو لازماً اس سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایک ہی خوش ذوق اور کارفرما ہاتھ کی کاریگری کا کرشمہ ہے۔ اگر اس کے مختلف اعضاء و اجزاء کی تشکیل مختلف کاریگروں کے مختلف ارادوں کے ماتحت عمل میں آتی تو یہ تناسب اور یہ حسن و جمال اس میں پیدا نہ ہو سکتا، اسی طرح اس مجموعی دنیا کے حسن و جمال کا جو شخص مشاہدہ کرتا ہے وہ لازماً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صرف ایک ہی کی پسند اور ایک ہی کا ارادہ ہے جو ان تمام رنگا رنگیوں کے اندر کارفرما ہے اگر مختلف پسندیں اور مختلف ارادے اس کے اندر کارفرما ہوتے تو اولاً تو اس کا قیام ہی ناممکن تھا اور اگر اس کا قیام فرض بھی کر لیا جائے تو یہ ایک آراستہ بزم کی جگہ ایک مال گودام بلکہ کسی کباڑیے کی دکان کی شکل میں ہوتی ایک حسین وحدت کی جگہ ہم اس کو نہایت بھیانک صورت میں دیکھتے، جہاں ہر چیز بے قرینہ، بے ربط اور بے جوڑ ہوتی، کیونکہ مختلف ارادوں اور مذاقوں کے تصادم کے ساتھ تناسب کا وجود محال ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف اس کثرت کے ساتھ توجہ دلائی ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ کائنات کے مختلف اجزاء کا باہمی توافق:

دوسرا اہم اور قابلِ توجہ پہلو اس کائنات کے مختلف اجزاء کا باہمی توافق (HARMONY) اور ان کی باہمی سازگاری ہے۔ اس دنیا کے مختلف اجزاء میں جو باہم ایک دوسرے سے ضدین کی نسبت رکھتے ہیں اسی طرح کی سازگاری اور موافقت پائی جاتی ہے جس طرح کی سازگاری اور موافقت ہم زوجین میں دیکھتے ہیں۔ ایک عورت اپنے ظاہر و باطن میں مرد سے بالکل مختلف حالت رکھتی ہے، اسی طرح ایک مرد عورت سے بالکل مختلف خصوصیات و صفات کا حامل ہے، تاہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جیسا شدید روحانی و جسمانی اتصال رکھتے ہیں وہ ظاہر

ہے۔ عورت کے پاس جو کچھ ہے وہ مرد کو نہ صرف یہ کہ مطلوب و مرغوب ہے، بلکہ اگر عورت نہ ہو تو مرد کی ہستی اور اس کی قوتوں اور قابلیتوں کا بڑا حصہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مرد کے پاس جو کچھ ہے وہ عورت کے دواعی اور مقتضیات کا گویا جواب ہے، یہاں تک کہ اگر مرد کو معدوم فرض کر لیا جائے تو عورت کی خصوصیات و صفات کی سرے سے توجیہ ہی ناممکن ہو جاتی ہے۔ ٹھیک یہی حال اس کائنات کے تمام اجزائے مختلفہ کا ہے۔ زمین و آسمان، شب و روز، گرمی و سردی، نور و ظلمت، حرارت و برودت، سب زوجین کا سا اختلاف اور سب انھی کا سا شدید اتصال رکھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ عورت و مرد میں سے جس طرح ایک کا تنہا وجود بے غایت ہے اسی طرح ان تمام اجزائے مختلفہ میں سے ہر چیز اپنے جوڑے کے بغیر بالکل بے مقصد ہو جاتی ہے۔ کوئی چیز اپنے مقصد کو پورا ہی اس وقت کرتی ہے جب وہ اپنے جوڑے سے ملتی ہے۔

توافق کا یہ پہلو صرف ہم ضدین ہی میں نہیں پاتے، بلکہ اس کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق و سازگاری ہے۔ ہر چیز اپنی ہستی کے بقا اور اپنے وجود کی نشوونما کے لیے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ اس کے لیے سرگرم کار رہے۔ گیہوں کا ایک پودا وجود میں آ کر اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کائنات کے تمام عناصر اس کی پرورش و نگہداشت میں اپنا اپنا حصہ پورا نہ کریں، زمین اس کے لیے گہوارہ مہیا کرے، ابر اس کے لیے رطوبت فراہم کرے، سورج اس کو گرم رکھے، شبنم اس کو ٹھنڈک پہنچائے، ہوائیں اس کو لوریاں دیں، جب یہ سب کچھ ایک خاص ضبط و نظم کے ساتھ ہو لے تب کہیں جا کر گیہوں کا ایک دانہ کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے اور یہی حال اس دنیا کی ایک ایک چیز کا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کائنات کا ارتقا آپ سے آپ ہو رہا ہے یا اس

کے پیچھے ایک مدبر ہستی (DESIGNER) ہے جو ان تمام اجزائے مختلفہ کے اندر توافق و سازگاری پیدا کرتی ہے انسان کو پروان چڑھاتی ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ دنیا ایک اتفاقی واقعہ (ACCIDENT) ہے، آپ سے آپ وجود میں آگئی اور اس کے مختلف اجزاء کا ارتقاء بھی آپ سے آپ ہو رہا ہے، تو کیا اس کے اجزائے مختلفہ کے اندر توافق و سازگاری کا پیدا ہو جانا بھی ایک امر اتفاقی ہے؟ کیا کوئی عاقل ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکتا ہے کہ ہوا، پانی، آگ، مٹی، دریا، پہاڑ، سورج، چاند، چرند پرند سب اتفاقی حوادث کے طور پر ظہور میں آئے، ہر ایک کا بطور خود ارتقاء ہوا، پھر بالکل اتفاق سے ان میں یہ حیرت انگیز توافق پیدا ہو گیا اور پھر بالکل اتفاق ہی سے یہ سب انسان کے لیے نہ صرف سازگار، بلکہ اس کے خدمت گزار بن گئے؟ کیا عقل انسانی اس قسم کے حیرت انگیز اتفاقات کو ایک لمحہ کے لیے بھی تسلیم کر سکتی ہے۔

یہ صورت حال اس امر کا نہایت قوی ثبوت ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک حکیم و قوی ارادہ ہے جو اس کو وجود میں لایا ہے اور جو علم و قدرت اور ربوبیت و حکمت کی تمام صفات سے متصف ہے۔ وہی ہے جو اپنے علم و حکمت سے اس کے اجزائے مختلفہ میں ربط و اتصال پیدا کرتا اور ان کو صالح مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور ساتھ ہی اس امر کی بھی شہادت مل رہی ہے کہ آسمان سے لے کر زمین تک اور زمین و آسمان کے درمیان صرف ایک ہی ہستی ہے جو مالک و متصرف ہے کہ کوئی دوسرا ارادہ اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اگر زمین و آسمان کے الگ الگ ناظم و مدبر ہوتے یا بہت سے ارادوں کی کارفرمائی ہوتی یا خیر و شر اور نور و ظلمت کے الگ الگ خدا ہوتے تو کائنات کے ان مختلف اجزاء میں یہ [illegible] کا سا توافق اور ربط نہ ہوتا جو ہم اس دنیا کے ہر گوشہ میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ قرآن نے اس دلیل کو مختلف مقامات میں بیان فرمایا ہے۔ ہم بطور مثال صرف چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

یہ دلیل نہایت اختصار کے ساتھ سورۂ ذاریات میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ فَفِرُّوا إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝ وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝

(الذّٰریٰت - ۵۱ : ۴۹-۵۱)

اور ہر چیز سے ہم نے پیدا کیے جوڑے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ پس اللہ کی طرف بھاگو، میں اس کی طرف سے تمہارے لیے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ بناؤ۔ میں اس کی جانب سے تمہارے لیے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔

یہاں ہر چیز کے جوڑے جوڑے ہونے سے معاد اور توحید دونوں پر استدلال کیا ہے۔ معاد پر استدلال یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ ہماری کتاب "حقیقتِ معاد" میں آئے گی۔ توحید پر استدلال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز جوڑے جوڑے کی شکل میں پیدا ہوئی ہے اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر ہی اپنی غایت پوری کرتی ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کائنات کا وجود و بقا اس کے اضداد کے توافق و سازگاری سے ہے اور اس سے بدیہی طور پر یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا خالق و مدبر ایک ہی ہے جو ان کے اختلافات کے باوجود ان میں ربط و اتصال پیدا کر کے ان سے صالح نتائج پیدا کرتا ہے۔ پس یہ اختلاف جو ہم اس کائنات میں مشاہدہ کر رہے ہیں، محض ظاہری اختلاف ہے اور ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کے اندر مختلف ارادے کارفرما ہیں۔ ان اجزائے مختلفہ کا باہمی توافق اس امر کی نہایت کھلی ہوئی شہادت ہے کہ صرف ایک ہی ہے جس کے تصرف کے تحت اس کائنات کے تمام اجزا اپنے اپنے مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ اس دلیل کی تفصیل سورۂ بقرہ میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرۃ ۲: ۲۱-۲۲)

اے لوگو، بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں تاکہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہو۔ اس کی بندگی کرو جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کیے پھل تمھاری روزی کے لیے تو تم اللہ کے ہم سر نہ ٹھہراؤ درآنحالیکہ تم جانتے ہو۔

یعنی جو انسان اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ زمین و آسمان اس توافق و ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں سرگرم ہیں، زمین اس کے لیے بستر کی طرح بچھی ہوئی ہوئی اور آسمان شامیانہ بن کر اس پر تنا ہوا ہے، پھر آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین اس سے اپنے پھل پیدا کرتی ہے اور وہ پھل انسان کے لیے لذت اور بقائے زندگی کا وسیلہ بنتے ہیں، وہ انسان یہ کیسے تصور کر سکتا ہے کہ آسمان کے دیوتا الگ ہیں اور زمین کے دیوتا الگ ہیں، بارش کوئی لاتا ہے اور پھل کوئی پیدا کرتا ہے۔ ان اضداد اور عناصر مختلفہ کی یہ سازگاری تو اسی وقت ممکن ہے جب ان سب کو ایک ہی کارفرما اور مدبر قوت حکمت و رحمت کے ساتھ، ایک خاص مقصد کے لیے، تصرف میں لائے۔ یہی دلیل ذرا اور پھیلاؤ کے ساتھ دوسری جگہ بیان ہوئی ہے:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اور تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ رحمان اور رحیم ہے۔ بے شک آسمانوں اور زمین

وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ	کی خلقت، رات اور دن کی آمد و شد اور
وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ	ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لیے سمندر میں
بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ	نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اس پانی
اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ	میں جو اللہ نے بادلوں سے اتارا اور جس سے
فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	زمین کو موت کے بعد زندگی بخشی اور جس
وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ	سے اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے اور
وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ وَالسَّحَابِ	ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ	آسمان و زمین کے درمیان مامور
لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝	ہیں، ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں
(البقرۃ - ۲ : ۱۶۳ - ۱۶۴)	ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

سورہ نحل میں اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کائنات کی ہم آہنگی کو واضح فرمایا ہے:

وَاللَّهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً	اور اللہ ہی نے آسمان سے پانی اتارا پس اس
فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	سے زمین کو زندہ کر دیا اس کے خشک ہو
إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ	جانے کے بعد۔ بے شک اس میں ان لوگوں
يَسْمَعُونَ ۝ وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ	کے لیے بڑی نشانی ہے جو بات کو سنتے ہیں
لَعِبْرَةً نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي	اور بے شک تمہارے لیے چوپایوں میں بھی
بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَ	بڑا سبق ہے۔ ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور
دَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا	خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں
لِلشَّارِبِينَ ۝ وَمِنْ ثَمَرَاتِ	پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار اور
النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ	کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے بھی

مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ
وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ
اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا
وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۙ
ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ
سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ
بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ
فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ
ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝
(النحل - ۱۶ : ۶۵ - ۶۹)

تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی۔ بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر القا کیا کہ تو پہاڑوں اور درختوں اور لوگ جو چھتیں اٹھاتے ہیں ان میں چھتے بنا۔ پھر ہر قسم کے پھلوں سے رس چوس۔ پھر اپنے پروردگار کے ہموار راستوں پر چل۔ اس کے پیٹ سے مشروب نکلتا ہے، جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ بے شک اس کے اندر بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔

ان آیات میں اس عالم کی ہمہ گیر ہم آہنگی کی طرف اشارات ہیں۔ بادلوں سے پانی برستا ہے۔ اس سے زمین لہلہا اٹھتی ہے۔ اس کی نباتات کو چوپائے چرتے ہیں۔ اس سے ان کے اندر دودھ بنتا ہے۔ آلائشوں اور خون کے اندر سے سفید دودھ کی دھاریں نکلتی ہیں اور یہ دودھ پینے والوں کے لیے نہایت لذیذ اور قوت بخش غذا کا کام دیتا ہے۔ پھر اسی بارش کے پرورش کیے ہوئے انگور اور کھجور کے پھلوں سے انسان اپنی لذت اور ضرورت کی طرح طرح کی چیزیں پیدا کر لیتا ہے۔ پھر شہد کی مکھیاں ہیں جو پہاڑوں کی بلندیوں پر، درختوں کی شاخوں پر، انگور کی ٹٹیوں میں اپنے چھتے بنا لیتی ہیں۔ پھول پھول کا رس چوس کر ان کو جمع کرتی ہیں، جن کے رنگ بھی مختلف اور مزے بھی مختلف۔

انسان ان کو پیتا ہے۔ ان سے لذت بھی حاصل کرلیتا ہے اور بیماریوں میں شفا بھی۔ ان مناظر کو جو شخص بھی دیدہ عبرت سے دیکھے گا کس طرح باور کرسکتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے یہ تمام حیرت انگیز مظاہر بالکل ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آگئے ہیں یا یہ کہ یہ آسمان و زمین اور ان کے مختلف جلوے مختلف دیوتاؤں کی کارفرمائیوں کے کرشمے ہیں۔ جس دنیا کے اتنے بعید اجزاء کے اندر اتنے گہرے رشتے ہیں اور جو کائنات اپنے متضاد اجزاء کی کشمکشوں کے اندر توافق و سازگاری کے اتنے پہلو رکھتی ہے وہ نہ تو ایک اتفاقی واقعہ ہوسکتی، نہ مختلف ارادوں کی رزم گاہ ہوسکتی۔ ظاہر بین نگاہیں صرف موجوں کے تلاطم کو دیکھتی ہیں، موجوں کے اندر کے صدف اور صدف کے اندر پرورش پانے والے گہر تک ان کی رسائی نہیں ہوتی اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن مجید بار بار توجہ دلاتا ہے کہ اس کائنات کے صرف اضداد کو نہ دیکھو بلکہ ان صالح نتائج کو دیکھو جو ان کے اضداد کی کشمکش کے اندر پیدا ہورہے ہیں اور اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک ہی حکیم ہاتھ اس کائنات پر متصرف ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ ۖ هَٰذَا	اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں ایک
عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ	شیریں، پیاس بجھانے والا، پینے کے
وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۖ وَمِنْ	لیے خوش گوار ہے اور ایک کھاری کڑوا
كُلٍّ تَأْكُلُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا	ہے اور تم دونوں سے تازہ گوشت کھاتے
وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ	اور زینت کی چیز نکالتے ہو جس کو پہنتے
لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ	ہو اور تم دیکھتے ہو کشتیوں کو اس میں
تَشْكُرُونَ ۔ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي	پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم اس کے فضل
النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي	کے طالب بنو، اور تاکہ تم شکرگزار بنو۔ وہ
اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ	داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل

كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ
(فاطر- ۳۵ : ۱۲-۱۳)

کرتا ہے دن کو رات میں اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، ہر ایک گردش کرتا ہے ایک معین وقت کے لیے، وہی اللہ تمہارا رب ہے، اسی کی بادشاہی ہے۔

کھاری پانی کے ایک سمندر اور شیریں پانی کے ایک دریا میں کتنا کھلا ہوا تضاد ہے۔ تاہم دیکھو، یہ دونوں کس طرح ایک مشترک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، کس طرح ان دونوں سے انسان اپنے لیے غذا کا ذخیرہ حاصل کر لیتا ہے، کس طرح ان دونوں سے اپنی زینت و آرائش کے لیے موتی حاصل کر لیتا ہے پھر کس طرح یہ جہاز رانی اور تجارت کے نہایت آسان ذرائع فراہم کرتے ہیں۔ پھر شب کی ظلمت اور دن کے نور پر غور کرو۔ دونوں اپنی صفات و خصوصیات میں کس قدر ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود، پوری ہم آہنگی اور سازگاری کے ساتھ، ایک دایہ کی طرح اس کائنات کی پرورش اور اس کے اندر بسنے والے حیوانوں، انسانوں اور نباتات کی خدمت میں سرگرم ہیں۔ سورج دن میں طلوع ہوتا ہے، اور گرمی اور دھوپ کا سرچشمہ ہے، چاند شب میں نمودار ہوتا ہے اور روشنی اور خنکی کا منبع ہے۔ بظاہر دونوں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں، لیکن دیکھتے ہو کہ اس دنیا کا ایک ایک وجود ان سے متمتع ہو رہا ہے اور یہ انسان کو بالواسطہ اور بلاواسطہ فیض رسانی پر مامور ہیں۔ کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے؟ ان مشاہدات کے باوجود جو لوگ دنیا کے اتفاقی حدوث پر اصرار کرتے ہیں ان کا یہ اصرار محض نہ ماننے کی خواہش پر مبنی ہے، علم و تحقیق سے اس ذہنیت کو کچھ سروکار نہیں ہے۔

۳۔ ضد سے ضد کا وجود:

اسی طرح ایک اور پہلو پر غور کرو۔ اس کائنات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ضد سے ضد کا وجود

ہوتا ہے۔ سرسبز و شاداب درخت سے چنگاریاں جھڑتی ہیں:

جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ	تمہارے لیے سرسبز درخت سے
نَارًا ۙ	آگ پیدا کر دی۔

(یٰسٓ - ۳۶ : ۸۰)

موت سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور زندگی سے موت:

یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ	وہ برآمد کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور وہی
مُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ ذٰلِكُمُ	برآمد کرنے والا ہے مردہ کو زندہ سے،
اللّٰهُ فَاَنّٰی تُؤْفَكُوْنَ ۝	سو وہی اللہ ہے تو تم کہاں اندھے
(الانعام - ۶ : ۹۵)	ہوئے جاتے ہو۔

ظاہر ہے کہ علت و معلول کے عام قانون سے یہ شے بالاتر ہے اور پیدائش کا وہ معروف ضابطہ جس پر ہم کو اس درجہ اعتماد ہے کہ اس کی ادنیٰ خلاف ورزی کا بھی ہم تصور نہیں کرسکتے، یہاں آکر بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ کیا یہ اس امر کا نہایت واضح ثبوت نہیں ہے کہ کوئی ہستی ان تمام ضوابط سے بالاتر بھی ہے جو ان سب پر اپنی قدرتِ کاملہ سے تصرف کرتی رہتی ہے اور اضداد سے اضداد کو وجود میں لاتی ہے اور ان کو اپنی مخلوقات کے لیے نافع بناتی ہے؟ جو لوگ اس کائنات کو محض علت و معلول کے اندھے بہرے قواعد کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اسی روشنی میں اس کی توجیہ کرنا چاہتے ہیں وہ موت سے زندگی اور زندگی سے موت کے پیدا ہونے کی کیا توجیہ کریں گے اور ہرے بھرے درخت سے تر و تازہ پھلوں کی جگہ آگ کے شرارے جھڑنے کی کیا تعلیل کریں گے؟ کیا علت و معلول کا عام ضابطہ یہی چاہتا ہے کہ ضد سے ضد پیدا ہو؟ اگر ایسا نہیں ہے تو لازماً ایک ہستی کا اقرار کرنا پڑتا ہے جو ان تمام سننِ طبعی پر حاکم و متصرف ہے۔

۴. متحدات سے مختلفات کا وجود :

اسی سے ملتی جلتی ہوئی ایک اور حقیقت بھی ہے. ہم اس کائنات میں دیکھتے ہیں کہ متحدات سے مختلفات کا وجود ہوتا ہے. سائنس کا دعویٰ ہے کہ یہ کائنات اپنے آغاز میں بسیط ہے۔ پھر درجہ بدرجہ اس کے اجزا میں تنوع پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑھتا جاتا ہے. یہ اگر سچ ہے اور اس کی سچائی سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کوئی تفریق و تقسیم کرنے والا ہے جو ایک کو دو اور دو کو چار کرتا ہے اور یہیں سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ مظاہر کا تنوع اللہ کے تعدد اور تنوع کی دلیل نہیں ہے. زمین ایک ہی ہے. ہوائیں بھی ایک ہی طرح کی چلتی ہیں. تاہم نباتات بے شمار قسم کی اُگتی ہیں. پھولوں کے رنگ قسم قسم کے ہوتے ہیں، پھلوں کی شکل وصورت، ان کی مقدار، ان کے رنگ و بو، ہر چیز کے اندر تفاوت ہوتا ہے. ایک ہی گٹھلی سے کبھی ایک سے زائد انکھوے نکلتے ہیں اور ان سے متعدد تنے اور شاخیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور کبھی ایک ہی انکھوا نکلتا ہے اور ایک ہی تنا پیدا ہوتا ہے :

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ٥ (الرعد - ۱۳ : ۴)	اور زمین میں پاس پاس کے قطعے ہیں، انگوروں کے باغ ہیں، کھیتی ہے اور کھجوریں جڑواں بھی ہیں اور اکہرے بھی. سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں لیکن ہم پیداوار میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دے دیتے ہیں. بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں.

یعنی جس شخص میں عقل ہوگی لازماً اس سے اس کو تنبہ ہوگا اور وہ ہر چیز کے رنگ اور اس کے پھلوں اور پھولوں کے تنوعات پر غور کرے گا تو اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ کوئی خالق ہے جو کمالِ حکمت و قدرت اور کمال رحمت کے ساتھ تصرف فرما رہا ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس پر واضح ہوگی کہ وہ اکیلا اور لاشریک لہ ہے کیونکہ جب ایک ہی پانی سے سیراب ہونے والے پودے اور ایک ہی قطعۂ زمین کے درختوں سے یہ سارے تنوعات ہم دیکھتے ہیں اور اس کو پانی اور زمین کے اختلاف کا نتیجہ نہیں قرار دیتے تو اس کائنات کی اس گوناگونی کو آلہ کے تعدد کی دلیل کیوں ٹھہرائیں؟ نیز یہ بات بھی اس پر واضح ہوگی کہ یہ سارے تنوعات پیدائش کے کسی اندھے بہرے ضابطہ کے کرشمے نہیں ہیں بلکہ کوئی علیم و قدیر ہستی ہے جو ہر چیز کو اپنے اندازہ کے ساتھ وجود میں لاتی ہے اور اپنی حکمت کے مطابق اس میں کمی بیشی کرتی رہتی ہے۔

۵۔ مظاہرِ کائنات کی تسخیر:

توحید کی ایک بہت بڑی دلیل وہ عجز و مقہوریت اور انقیاد و اطاعت بھی ہے جس کے آثار ہم اس کائنات کی تمام بڑی اور شاندار مخلوقات میں پاتے ہیں۔ یہ اس بات کا نہایت قوی ثبوت ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی طرف بھی الوہیت کی نسبت نہیں کی جا سکتی۔ الوہیت کی صفت کے ساتھ کوئی ایسی ہی ذات متصف ہے جو ان سب سے اعلیٰ اور ان سب سے برتر ہے۔ سورج، چاند، ستارے، اپنے حسن و عظمت کے باوجود، اور زمین، دریا، پہاڑ، ہوا، ابر، برق و رعد اپنی وسعت، قوت اور جلالت کے علی الرغم ایک محکم نظام حکمت کے ماتحت مقہور و مسخر ہیں تو لازماً ان کے سوا کوئی اور ہے جو ان سب کا خالق اور سب پر فرمانروا ہے۔ اب غور کرو وہ کون ہے جو ان سب کا خالق اور سب پر آمر و متصرف ہے؟ اس سوال کو قرآن نے بار بار اٹھایا ہے اور اس کا جواب مشرک

عربوں کی زبان سے بھی یہی نقل کیا ہے کہ اس عالم کا خالق ایک عزیز وحکیم ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ (الزخرف - ۴۳ : ۹) (اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ لازماً یہی جواب دیں گے کہ ان کو خدائے عزیز وعلیم نے پیدا کیا ہے) کیونکہ جو شخص اس کائنات کے مظاہر پر غور کرے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان میں سے کسی کی طرف اس کائنات کی تخلیق کی نسبت نہیں کی جا سکتی۔ اس کائنات کی خالق کوئی ایسی ہی ذات ہو سکتی ہے جو عزت وکبریائی اور علم وحکمت کی تمام صفات کے ساتھ متصف ہو۔

یہاں اس امر کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان مظاہر میں سے جو جتنے ہی زیادہ شاندار ہیں ان کی پیشانی پر اطاعت کا داغ اسی قدر زیادہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ دنیا نے سورج اور چاند کی سب سے زیادہ پرستش کی ہے، حالانکہ ذلت واطاعت، سجود وہبوط اور کسوف وخسوف کے آثار جو ہم ان میں دیکھتے ہیں، دوسری کسی چیز میں نہیں دیکھتے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب حماقت ہے کہ ان آثار کے مشاہدہ کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس نے ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش کی بلکہ اس نے ان کی ذلت کی ان علامتوں کو بھی ان کی الوہیت کے دلائل میں سے گن لیا۔

توحید کی یہ دلیل، اجمال وتفصیل کی مختلف شکلوں میں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ ہم صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس حجت کو یہاں نقل کرتے ہیں، جو انہوں نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی اور ابراہیمی حسن مجادلہ کی بہترین تصویر ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ	پس یوں ہوا کہ جب رات نے اس کو
كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ	ڈھانک لیا اس نے ایک تارے کو دیکھا۔
فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ	بولا کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ ڈوب
فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ	گیا اس نے کہا: میں ڈوب جانے والوں

هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ
لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ
مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۔ فَلَمَّا
رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ
هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ
فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ
اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۔
اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ
فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا
وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔
(الانعام - ٦ : ٧٦-٧٩)

کو وسعت نہیں رکھتا۔ پھر جب اس نے
چاند کو چمکتے دیکھا، بولا: یہ میرا رب ہے
پھر جب وہ بھی ڈوب گیا، اس نے کہا:
اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی
تو میں گمراہوں میں سے ہو کر رہ جاؤں گا۔
پھر جب اس نے سورج کو چمکتے دیکھا
بولا کہ یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔
پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو اس نے اپنی
قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، میں ان
چیزوں سے بری ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے
ہو۔ میں نے تو اپنا رخ بالکل یکسو ہو کر
اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین
کو پیدا کیا ہے اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

٦۔ کائنات کی محکم تدبیر:

اسی طرح خدا کے وجود اور اس کی توحید کی ایک بہت بڑی شہادت وہ محکم اور ہمہ گیر تدبیر و نظام ہے جس کا، اس کائنات کے ہر گوشہ میں، ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دنیا مختلف قوتوں کی ایک رزم گاہ ہے، دوسری طرف یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان قوائے مختلفہ کے اس تصادم کے اندر نہ صرف یہ کہ تمام چھوٹی بڑی مخلوقات قائم و باقی ہیں، بلکہ اپنی صلاحیت و استعداد کے اعتبار سے پھل پھول رہی ہیں۔ ایک طرف یہ حال ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی ہر قوت شتر بے مہار کی طرح اپنے رخ

بڑھتی چلی جارہی ہے۔ نہ وہ کسی نظامِ قاہر کی پابند معلوم ہوتی نہ کسی برتر قوت کی محکوم و مطیع۔ لیکن پھر دفعۃً ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی مخفی ہاتھ اس کی باگ موڑ کر اس کو ایک سمت سے دوسری سمت پر لگا دیتا ہے۔ کتنی بار ہم دیکھ چکے ہیں کہ بعض بڑے بڑے اجرامِ سماویہ کسی خاص رخ پر بڑھ چلے اور اگر وہ اسی رخ پر بڑھتے چلے جاتے تو لازم تھا کہ ہمارے کرۂ زمین سے ٹکرا جاتے اور یہ کرۂ زمین پاش پاش ہو کے رہ جاتا۔ چنانچہ اس طرح کے مشاہدات کی بنا پر کبھی کبھی ماہرینِ فلکیات نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ فلاں مدت کے اندر یہ زمین فلاں جرمِ سماوی سے ٹکرا جائے گی، لیکن جب وہ متعین وقت آیا، دفعۃً اس جرم نے اپنا رخ اس طرح بدل دیا گویا کسی سوار نے مرکب کی باگ موڑ دی اور وہ عظیم خطرہ جو ہماری اس دنیا کے بالکل سر پر آگیا تھا یکایک دفع ہو گیا۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

غور کرو، یہ راکب کون ہے؟ کون ہے جو قویٰ اور عناصر اور اجرام و اجسام کی باگیں تھامے ہوئے ہے؟ جس حد تک چاہتا ہے ان کو ڈھیلتا ہے اور پھر جہاں چاہتا ہے روک لیتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک انچ بھی بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتے؟ کیا یہ محض اتفاق ہے؟ کیا یہ اندھی بہری قوتوں کی اپنی صواب دید سے سب کچھ ہو رہا ہے؟ کیا عقلِ بشری اور قلبِ انسانی کو ان جوابات سے تشفی و طمانیت مل سکتی ہے؟ قرآن اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ:

"إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا" (فاطر۔ ۳۵ : ۴۱)

(اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں۔ اگر وہ ٹل جائیں تو اس کے بعد کوئی اور ان کو تھامنے والا نہیں بن سکتا۔ بے شک وہ نہایت حلیم و غفور ہے)۔

اور کون ہے جو اس جواب کی سچائی کا انکار کر سکتا ہے؟

یہ وہ تدبیر و نظام ہے جو اس مادی دنیا کے قویٰ اور عناصر کے درمیان ہم دیکھتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر ہم اس کائنات کے اخلاقی قویٰ کے تصادم اور اس کے احوال و نتائج پر غور کریں تو وہاں بھی ہمیں یہی قانون کار فرما نظر آتا ہے۔ ایک باطل نظریہ جنم لیتا ہے، اس نظریہ کے علم بردار پیدا ہوتے ہیں۔ اس پر ایک باطل نظامِ اخلاق، ایک باطل نظامِ معیشت اور ایک باطل نظامِ سیاست کے روئے چڑھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس غلبہ کے نیچے دب کر صلاحِ اخلاق کے تمام عناصر دم توڑ دیں گے۔ تاہم اس نظامِ باطل کو مہلت ملتی رہتی ہے، یہاں تک کہ تمام خشکی و تری میں فساد کی سیاہی چھا جاتی ہے اور اس عالم کے مصلحین اس دنیا کی ازسرِ نو اصلاح سے مایوس ہونے لگتے ہیں۔ پھر دفعتہً ایک وقت آتا ہے کہ کوئی مخفی ہاتھ نمودار ہو کر اس پورے نظامِ باطل کو اس طرح جھنجھوڑ دیتا ہے کہ اس کی ایک ایک اینٹ بکھر جاتی ہے:

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ	یہاں تک کہ جب یہ نوبت آ گئی کہ رسول
وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا	اپنی قوم سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے
جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ	یہ گمان کیا ان کو جھوٹ ڈراوے سنائے گئے
(یوسف - ۱۲ : ۱۱۰)	تو ان کو ہماری مدد آ پہنچی۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ	اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى	ان کے ساتھ ایمان لانے والے پکار
نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ	اٹھتے ہیں کہ اللہ کی مدد کب نمودار ہوگی!
اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○	بشارت ہو کہ اللہ کی مدد قریب ہے!
(البقرۃ - ۲ : ۲۱۴)	

ان مشاہدات کے بعد کون ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکے کہ یہ دنیا آپ سے آپ وجود میں آئی اور خود بخود قائم ہے ؟ یا یہ گمان کر سکے کہ مختلف قویٰ اور عناصر کی ایک رزم گاہ ہے اور یہ قویٰ اور عناصر کسی بالاتر طاقت کے زیرنگیں نہیں ہیں؟ یا یہ خیال کر سکے کہ اس بالاتر قوت کی حاکمیت منقسم ہے ؟ یا یہ سوچ سکے کہ اس دنیا کو اس کے پیدا کرنے والے نے پیدا کر کے اندھے بھینسے کی طرح چھوڑ دیا ہے۔ اس کے اوپر کوئی بالاتر اخلاقی اصول کارفرما نہیں ہے ؟

۷۔ ہر نظمِ اجتماعی کے لیے لازم ہے کہ حاکمیت غیر منقسم ہو:

اس عالم کا مجرد قیام ہی اس بات کا شاہد ہے کہ اس کا حاکم ایک ہے جس کی حاکمیت غیر منقسم ہے۔ ہم اپنی اجتماعی زندگی میں کسی سیاسی تنظیم کا تصور اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک حاکمیت کو کسی ایک خاص مرکز میں مرتکز نہ کریں۔ حاکمیت کی تقسیم کے ساتھ کسی محکم تنظیم اجتماعی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تمام سیاسی تنظیمات میں جمہوریت وہ نظام ہے جس نے حاکمیت کو ایک وسیع دائرہ میں پھیلانے کی کوشش کی ہے تاہم اس میں بھی ایک ایسا نقطہ لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے جہاں اس کی پھیلی ہوئی حاکمیت سمٹتی اور مجتمع ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نراج اور انارکی کے طوفان میں منتشر ہو جانا لازمی ہے۔ بہر حال یہ امر بالکل قطعی ہے کہ حاکمیت کی تقسیم کے ساتھ کسی اجتماعی تنظیم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اب غور کرو کہ یہ دنیا اتنے بے شمار اجزا پر مشتمل ہونے کے باوجود نہ صرف قائم ہے بلکہ پوری قوت و استحکام کے ساتھ قائم ہے۔ اس میں مختلف قویٰ کا تصادم بھی ہے، اضداد کی آویزشیں بھی ہیں، خیر و شر کے معرکے بھی ہیں، لیکن اس دنیا کی کشتی ہے کہ ان موجوں کے تلاطم کے اندر سے ہچکتی، سنبھلتی، اچھلتی اور کتراتی ہوئی چلی جا رہی ہے اور اس خوبی اور صفائی کے ساتھ کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کا مشاہدہ ہم میں سے ہر

وہ شخص کر رہا ہے جو اس بادشاہی کے نظام پر غور کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کون سی بات عقل سے قریب تر ہے۔ کیا مشرکین کا یہ عقیدہ کہ آسمان و زمین کے معبود الگ الگ ہیں، یا یہ حقیقت کہ ایک ہی ہے جو آسمانوں کا بھی خدا ہے اور زمین کا بھی؟ کیا اس کائنات سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ نور و ظلمت کے الگ الگ الٰہ ہیں، یا اس بات کی روشنی اور تاریکی دونوں کا نکالنے والا ایک ہی ہے؟ کیا یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ دنیا بے شمار دیوتاؤں کی ایک رزم گاہ ہے، یا یہ بات نظر آتی ہے کہ اس سارے نظام کا ناظم و مدبر صرف اللہ واحد و قہار ہے؟ اگر پہلی بات صحیح ہے تو یہ شیرازہ بکھر کیوں نہیں جاتا، یہ نظام درہم برہم کیوں نہیں ہو جاتا؟ عرش والے کے خلاف بغاوت کیوں نہیں پھوٹ پڑتی؟ حاکمیت کے ایسے تشتت و انتشار کے ساتھ یہ وحدت قائم کیونکر ہے؟ یہی حقیقت ہے جو قرآن کریم نے عربوں کے سامنے اور ان تمام مشرک قوموں کے سامنے پیش کی ہے جو اس کائنات میں کسی نہ کسی نوعیت سے حاکمیت کے انقسام کو تسلیم کرتی ہیں:

أَمِ اتَّخَذُوا آلِهَةً مِنَ الْأَرْضِ هُمْ يُنْشِرُونَ ۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ۔

(الانبیآء ۔ ۲۱ : ۲۱ - ۲۲)

کیا انھوں نے زمین کے الگ معبود ٹھہرا لیے ہیں وہ زمین کو شاداب کرتے ہیں؟ اگر ان دونوں کے اندر اللہ کے سوا الگ الگ الٰہ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو کر رہ جاتے۔ تو اللہ عرش کا مالک ان چیزوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا ۔ سُبْحَانَهُ

کہہ دو کہ اگر کچھ اور الٰہ بھی اس کے شریک ہوتے جیسے یہ دعویٰ کرتے ہیں تو وہ عرش والے پر ضرور چڑھائی کر دیتے۔ وہ پاک

وَتَعٰلیٰ عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا	اور بہت برتر ہے ان باتوں سے جو یہ
كَبِيْرًا ؁	کہتے ہیں۔

(بنی اسرآئیل - ۱۷ : ۴۲-۴۳)

۸۔ حق و باطل کی آویزش اور حق کا غلبہ :

بعض قوموں کو خدا کی توحید، بلکہ خود خدا کے باب میں بڑا سخت مغالطہ، دنیا میں شرِ باطل کے وجود سے، پیش آیا ہے۔ ان کی نظر باطل کے جھاگ پر جم گئی اور اس جھاگ کے نیچے جو حق کا مخفی تھا وہ ان کو نظر نہ آسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یا تو سرے سے کسی عزیز و رحیم اور پاک و قدوس خدا کے وجود ہی سے منکر ہو گئیں، یا مانا تو یہ مانا کہ یہ دنیا بہت سے خون آشام دیوتاؤں کی لیلا ہے اور وہ اس کو پیدا کر کے، دور بیٹھے ہوئے، اس کے مصائب و شدائد اور اس کے دکھوں اور آفتوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ یا پھر یہ کیا کہ خیر و شر اور نور و ظلمت کے الگ الگ خدا ٹھہرا لیے اور دنیا کو ان متضاد قوتوں کی ایک رزم گاہ بنا دیا۔ یہ غلط فہمی قوموں کو محض قلتِ تدبر، قلتِ صبر اور ظاہر بینی کی وجہ سے ہوئی۔ نہ انھوں نے اس دنیا کے اصلی مزاج و قوام کو پہچانا اور نہ حق و باطل کی اس آویزش کے اندر حق کے غلبہ کا مشاہدہ کیا۔ قرآن نے ان تمام اوہام کی نہایت تفصیل کے ساتھ تردید کی ہے۔ ہم اجمال کے ساتھ بعض حقائق کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن نے اس دنیا کے اصلی مزاج کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے :

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ	اس نے آسمان سے پانی برسایا تو وادیاں
اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ	اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہہ نکلیں پھر
السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا	سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھا لیا اور
يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِى النَّارِ	اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں کے اندر سے

ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ؕ	بھی ابھر آتا ہے جن کو وہ زیور یا اسی قسم کی کوئی اور چیز بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کو ٹکراتا ہے تو جھاگ تو بے مصرف ہو کر اڑ جاتا ہے لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہوتی ہے وہ زمین میں تھم جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تمثیلیں بیان کرتا ہے۔

(الرعد - ۱۳ : ۱۷)

یعنی اس دنیا کا اصل مزاج یہ ہے کہ جس طرح ایک خوش مذاق اور سلیم الفطرت انسان مکھی کو نہیں ہضم کر سکتا اسی طرح یہ باطل کو ہضم نہیں کر سکتی۔ یہ ہر گوشہ میں باطل کو چھانٹتی رہتی ہے اور حق و نافع کو قبول کرتی ہے۔ بارش ہوتی ہے اور وادیاں بہہ نکلتی ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ پانی کی سطح پر جھاگ ابھر آتے ہیں، پھر پانی زمین میں تھم جاتا ہے اور جھاگ خشک ہو کر ہوا میں اڑ جاتا ہے۔ اسی طرح تم چاندی کو زیور بنانے کے لیے کٹھالی میں پگھلاتے ہو، اس کا میل الگ ہو جاتا ہے اور خالص چاندی بچ رہتی ہے۔ یہی اس دنیا کا اصل مزاج ہے۔ اس میں مجرد باطل کا وجود نہیں ہے۔ باطل جب بھی پایا جاتا ہے حق کے ساتھ مخلوط ہو کر۔ جس طرح صالح درختوں اور صالح جانداروں کے ساتھ طفیلی پودے اور طفیلی کیڑے چمٹ جاتے ہیں، اسی طرح حق کے ساتھ باطل چمٹ جاتا ہے۔ تم تنگ نظری کی وجہ سے ان طفیلی کیڑوں اور طفیلی پودوں ہی کو اصل سمجھنے لگتے ہو اور پھر قدرت کی زیادتیوں اور بے حکمتیوں پر معترض ہوتے ہو حالانکہ یہ اعتراض محض تمہاری بوالفضولی اور حماقت کا نتیجہ ہے۔ قدرت ہر گوشہ میں نہایت حکیم اور حق دوست ہے۔ اگر کسی مصنوع سے صانع کے مذاق و طبیعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو اس دنیا کے اس مزاج کو دیکھ کر نہایت آسانی سے

ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق حق ہے، حق کو پسند کرتا ہے اور اپنے کلمات سے حق کو قائم و ثابت کرتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جو ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے :

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ۝ (الانبیآء - ۲۱ : ۱۶ - ۱۸)	اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھیل ہی بنانا چاہتے تو خاص اپنے پاس ہی بنا لیتے، اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے ؛ بلکہ ہم حق کو اس پر دے ماریں گے تو وہ اس کا بھیجا ہی نکال دے گا تو دیکھو گے کہ وہ نابود ہو کے رہے گا اور تمہارے لیے اس چیز کے سبب سے جو تم بیان کرتے ہو، بڑی خرابی ہے!

اس دنیا کے اندر جو مصائب و آلام ہیں وہ بھی اس امر کی دلیل نہیں ہیں کہ یہ دنیا مختلف المزاج دیوتاؤں کی رزم گاہ ہے۔ قرآن نے تمام آسائشوں اور تمام دکھوں کو ایک ہی حکیم و قدیر خدا کی مشیت و حکمت کے تحت، اور ان قوموں کے اخلاق و اعمال کا نتیجہ قرار دیا ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ یہ سمجھایا ہے کہ بعض مرتبہ یہ آفتیں اس لیے آتی ہیں کہ جو مغرور اپنی سرکشی میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں وہ ان سے متنبہ ہوں اور اپنے ضعف و عجز کو محسوس کر کے خدا کی طرف لوٹیں۔ بعض مرتبہ ان کا ظہور اس لیے ہوتا ہے کہ سرکش قوم، جس پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو چکی ہے، ان کے ذریعے سے تباہ کر دی جائے۔ بعض حالات میں اہل حق بھی ان میں سے کچھ حصہ پاتے ہیں تاکہ ان کے ایمان و عقیدہ اور صبر و عزیمت کا امتحان ہو، کمزوریاں دور ہوں اور خوبیاں اور قابلیتیں بروئے کار آئیں۔ ان ساری باتوں کو قرآن حکیم

نے مختلف اسلوبوں سے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، جس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس طرح رات اور دن، سردی اور گرمی دونوں اس دنیا کے مادی بقا کے لیے یکساں ضروری ہیں اسی طرح نعمتوں اور خوش حالیوں کے ساتھ ساتھ آفات و آلام بھی اس دنیا کی اخلاقی زندگی اور روحانی حیات کے لیے ناگزیر ہیں اور یہ ہرگز اس امر کا ثبوت نہیں ہیں کہ اس دنیا میں کون و فساد اور رحمت و نقمت کے الگ الگ دیوتا ہیں بلکہ صرف ایک ہی ہے جو منعم بھی ہے اور وہی منتقم بھی ہے اور اس کا یہ انتقام بھی درحقیقت اس کے انعام ہی کا ایک پہلو ہے، جیسا کہ قرآن میں اس امر کو واضح فرمایا ہے۔

یہی حال گناہوں اور معاصی کا ہے۔ یہ بھی خدا کی مشیت کے تحت ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت، جو انسان پر ہوئی ہے، یعنی اختیار، یہ اس کے ظلال میں سے ہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی و بدی کی پہچان دے کر اس کا امتحان کیا ہے۔ یہ امتحان مقتضی ہوا کہ انسان کو فی الجملہ آزادی بخشی جائے۔ اس آزادی کی وجہ سے انسان نیکی اور بدی دونوں کی راہیں اختیار کر سکتا ہے۔ پہلی راہ اس کی فطرت کی راہ ہے اور اس پر اس کا چلنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ دوسری راہ فطرت اور خدا سے بغاوت ہے اور اس پر چلنا اللہ تعالیٰ کو نہایت ناپسند ہے۔ لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اس راہ پر چلنے کی بھی مہلت دیتا ہے کیونکہ اس مہلت کے بغیر آزادی کی نعمت بے معنی ہو جاتی ہے۔ انسان کی یہ آزادی خدا کی بخشش اور اس کی مشیت کے تحت ہے اور یہ لازم نہیں ہے کہ جو بات خدا کی مشیت کے تحت ہو وہ اس کو پسند بھی ہو۔ وہ اتمامِ حجت کے لیے ان کاموں کے لیے بھی لوگوں کو ڈھیلا ہے، جو صریحاً اس سے بغاوت کے حکم میں داخل ہوتے ہیں۔ پس خیر ہو یا شر، کُل اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ کوئی چیز بھی اس کی مشیت اور اختیار کے دائرہ سے باہر نہیں ہے نہ جبرِ محض کا دعویٰ صحیح ہے، نہ اختیارِ مطلق کا۔ حق ان دونوں کے درمیان ہے اور تفصیل اس کی ان شاءاللہ اپنے محل میں آئے گی۔

اوپر کی تفصیل سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اس کائنات میں شر محض کا وجود نہیں ہے۔ شر حق کے ظلال کی حیثیت سے پایا جاتا ہے اور حق ہی کی خدمت کے لیے ہے۔ پس لازماً اس کائنات کا خالق حق ہے اور حق کو دوست رکھتا ہے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی آپ سے آپ نکل آئی کہ خیر و شر، نور و ظلمت، راحت و مصیبت، نیکی و بدی اور کون و فساد کے الگ الگ دیوتا نہیں ہیں، ایک ہی ہے۔ جس کے تحت تصرف یہ سارا کارخانہ چل رہا ہے۔

۹۔ اشارات :

اسی طرح توحید کی نہایت اہم دلیلیں ان لطیف اشارات (SUGGESTIONS) میں ملتی ہیں جو اس کائنات کے مختلف مظاہر میں مضمر ہیں اور یہ صرف ان کو نظر آتے ہیں جو باریک بین نظر اور عبرت پذیر قلب رکھتے ہیں۔ یہ قرآن دلائل کی ایک مخصوص قسم ہے۔ جو منطق کی گرفت سے بالکل بالا ہے اور اس سے وہ قومیں بہت کم فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو استدلال کے مصنوعی طریقوں کی خوگر ہو کر استنباط و استنتاج اور عبرت و تنبہ کا وہ فطری جوہر کھو بیٹھی ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ہر سلیم الفطرت انسان میں ودیعت فرمایا ہے۔ یہ جوہر صرف ان قوموں میں محفوظ رہتا ہے جو فطری سادگی پر قائم رہتی ہیں اور اس اعتبار سے تمام قوموں میں اہل عرب کو جو بلند مقام حاصل تھا وہ معلوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ نہایت ذکی الحس تھے اور اشاروں میں وہ سب کچھ پڑھ لیتے تھے جو دوسرے موٹی موٹی کتابوں میں بھی پڑھ کے نہیں سمجھ سکتے تھے۔ جو لوگ عرب کے خطباء اور شعرائے جاہلیت کے کلام پر نظر رکھتے ہیں وہ ان کے اس ذوق سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ منزل یار کے ایک ایک مٹے ہوئے نقش کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں، اس سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں اور پھر اس کی عبرتوں اور اس کے مخفی اشاروں اور پیغاموں کی ایسی موثر تصویر کھینچتے ہیں کہ سننے والے کا بھی دل بھر آتا ہے۔ قرآن سے پہلے ان کا یہ ذوق نظر، جس کے لیے عربی ادب میں صحیح لفظ "توسم"

بے صرف دیار یار کے آثار و نشانات تک محدود تھا اور لازماً اس کے اثرات بھی معمولی اور ادنیٰ درجے کے تھے۔ قرآن نے ان کے اس ذوق کو شہ دی اور کائنات کے آثار و عجائب اور اس کے اشارات کی وسعتوں کی طرف توجہ دلائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو قوم زیادہ سے زیادہ امرؤالقیس اور زہیر کے درجہ کے اشخاص پیدا کر سکی تھی اس کے اندر سے ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ جیسی عظیم الشان ہستیاں اٹھیں۔

یہ اشارات قرآن کے تمام بنیادی مسائل: توحید، رسالت اور معاد کے سلسلہ میں نمایاں کیے گئے ہیں۔ یہاں سب کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ ہم صرف توحید سے متعلق ایک اشارہ کی توضیح کریں گے تاکہ دوسرے اشارات پر غور کرنے کے لیے نمونہ کا کام دے۔ سورۂ رعد میں فرمایا ہے:

ؔ اس کائنات کے اشاراتِ حقیقت کی کوئی حد نہیں ہے جس طرح ہم عیسائیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے گرجوں کی ہر چیز میں اپنے بنیادی عقائد کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مثلاً اگر تثلیث پیش نظر ہے تو عمارت کے ایک ایک گوشے سے تثلیث نمایاں ہوگی، یہاں تک کہ فرنیچر کی قسم کی بھی جو چیزیں ہوں گی، سب مثلث ہوں گی۔ میز، قلم دان، قلم اور پیپر ویٹ تک سے تثلیث پکار رہی ہوگی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر چیز میں توحید اور معاد کے حقائق کا مظاہرہ فرمایا ہے اور جس گوشہ پر بھی انسان تدبر کی نظر ڈالے، وہیں سے اس کو توحید اور معاد کی کوئی نہ کوئی دلیل ہاتھ آجائے گی۔ اسی کو بعض عارفوں نے کہا ہے: ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار۔ لیکن غافل انسان اتنے دلائل کے باوجود خدا کی توحید اور جزا کے باب میں بھٹک جاتا ہے: ’وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ‘ (یوسف - ۱۲: ۱۰۵) (اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ گزرتے ہیں اور ان سے منہ موڑے ہوئے ہیں)۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ	اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب
وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّ	خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں، خواہ طوعاً خواہ
ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۩	کرہاً اور ان کے سائے بھی صبح اور شام۔
قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ	ان سے پوچھو: آسمانوں اور زمین کا مالک
الْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ	کون ہے؟ کہہ دو، اللہ!

(الرعد - ۱۳ : ۱۵-۱۶)

طَوْعًا وَّكَرْهًا، کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے اندرونی داعیہ سے خدا کو سجدہ کرتے ہیں وہ تو کرتے ہی ہیں، لیکن جو اپنے اندرونی داعیہ سے خدا کے آگے نہیں جھکتے انہیں مجبوراً جھکنا پڑتا ہے اور اس کے بعد اس مجبورانہ سجدہ کی شرح فرمادی کہ ان کے سائے صبح وشام خدا کا سجدہ بجا لاتے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہر شخص اپنے وجود کے اندر مشاہدہ کر رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر چیز کا سایہ آفتاب کے زوال کے ساتھ آفتاب کی بالکل مخالف سمت میں زمین پر اس طرح جھکنا شروع ہوتا ہے جس طرح ایک رکوع کرنے والا خدا کے آگے جھکتا ہے اور غروب آفتاب کے ساتھ یہ سایہ اس طرح زمین پر بچھ جاتا ہے جس طرح ایک ڈنڈوت کرنے والا اپنے معبود کے سامنے ڈنڈوت کرتا ہے یا ایک ساجد خشوع وخضوع سے سجدہ کرتا ہے اور پھر ایک شب زندہ دار کی طرح رات بھر اسی حالت میں پڑا رہتا ہے، پھر جب صبح ہوتی ہے تو یہ سایہ بالتدریج سورج کی بالکل مخالف سمت سے اٹھنا شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ پورے قیام کی حالت میں آجاتا ہے، جس طرح ایک مصلی سجدے سے قیام کی حالت میں آگیا ہو اور پھر سورج کے زوال کے ساتھ اسی رکوع اور سجود کا دور آجاتا ہے، جو اوپر مذکور ہوا۔

یہ صورت حال دو نہایت اہم حقیقتوں کی شہادت دے رہی ہے، ایک یہ

کہ اس کائنات کی ہر چیز چوبیس گھنٹے رکوع و سجود میں ہے۔ دوسری یہ کہ یہ سجدہ آفتاب پرستی کے بالکل ضد ہے۔ آفتاب جب مشرق سے طلوع ہوتا ہے، ہر چیز کا سجدہ مغرب کی طرف ہوتا ہے اور جب مغرب میں غروب ہونے لگتا ہے، ہر چیز کا سجدہ مشرق کی طرف ہوتا ہے۔ کسی وقت بھی کوئی چیز اپنے تکوینی سجدہ میں آفتاب کی موافقت نہیں کرتی۔ پھر اگر ایک انسان، جو ایک بااختیار مخلوق ہے، خدا کو سجدہ نہ کرے، بلکہ اس کے سامنے اکڑے یا سورج اور چاند کو سجدہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خود تو خدا کے سامنے اکڑتا ہے لیکن اس کے سارے وجود کا سایہ خدا کے آگے بچھا ہوا ہے یا وہ خود تو سورج اور چاند کے آگے سجدہ کر رہا ہے، لیکن اس کا سایہ ابراہیمی فطرت رکھتا ہے، جو کواکب پرستی سے بالکل بیزار۔ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (الانعام - ۶ : ۷۹) (میں نے تو اپنا رخ بالکل یکسو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں) پر عامل ہے۔ عالم اختیار اور عالم تکوینی کی یہ بے ربطی "من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید" کی مصداق ہے۔

یہی دلیل ہے جس کو قرآن نے دوسری جگہ کسی قدر مختلف الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ	کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ خدا نے جو
مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ	چیز بھی پیدا کی ہے ان کے سائے دائیں
الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا	اور بائیں منقلب ہوتے ہیں اللہ کو سجدہ
لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ۝	کرتے ہوئے اور ان پر فروتنی ہوتی ہے

(النحل - ۱۶ : ۴۸)

قرآن میں اس طرح کے اشارات بہت ہیں اور ہر جگہ ان سے توحید، معاد اور رسالت کے نہایت اہم حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو قوموں میں صغریٰ و کبریٰ کی

ترتیب کے بغیر کوئی بات نہیں سمجھ سکتی ہیں ان کے لیے بے شبہ ان اشارات کے اندر کوئی تعلیم نہیں ہے لیکن عرب جیسی حساس قوم اس طرح کے اشارات سے نہ صرف یہ کہ فائدہ اٹھاتی تھی بلکہ ان کی اصلی عقلی غذا ان اشارات ہی میں تھی۔ یہ چیز تربیتِ عقل کے لیے بھی نہایت نافع ہے اور تاثیر کے اعتبار سے تو اشارات کی زبان تصریحات کے مقابلہ میں ہمیشہ بلیغ تر سمجھی گئی ہے۔ ہم ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے بھی اپنے قلب پر وہ اثر نہیں کر سکتے جو تغلق آباد اور دلی مرحوم کے کھنڈروں پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر کر سکتے ہیں: ؎

از نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

باب ۲

توحید کے دلائلِ انفس

انسان پہلے ظاہر پر نظر ڈالتا ہے پھر جب عقل و تمیز میں پختگی پیدا ہوتی ہے، اپنے باطن کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور یہ بات محض متوجہ ہونے کی حد تک مؤخر ہے ورنہ درحقیقت باطن ہی ہے جو اس کے سامنے ظاہر کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ اتنے دنوں تک اپنے باطن سے بے پروائی کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کا باطن اس سے بہت دور ہے۔ نہیں، بلکہ یہ بے پروائی اس کے غایت قرب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دلائلِ آفاق کی بنیاد درحقیقت انفسی دلائل ہی پر ہے۔ آسمان و زمین کے دلائل میں سے کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جس کی اساس کسی نفسی دلیل پر نہ ہو۔ اسی پر ہمارے تمام استدلال کی عمارت قائم ہے۔ اگر یہ نفسی دلائل نہ ہوتے تو جس طرح جمادات و بہائم کے لیے یہ تمام عالم تیرہ و تار ہے اسی طرح انسان کے لیے بھی یہ عالم ظلمات ہوتا۔ چنانچہ جو لوگ آسمان و زمین کی آیتوں پر غور نہیں کرتے ہیں ان کے لیے یہ تمام عالم بالکل بے غایت اور بے معنی ہے اور قرآن نے ان کو چوپایوں سے بھی زیادہ بے عقل قرار دیا ہے۔

اب ہم اس باطن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جس کے دلائل ہم سے قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی، دل نشین بھی ہیں اور مستحکم بھی، جن کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۙ اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین کرنے

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ دلوں کے لیے اور خود تمہارے اندر بھی، کیا تم دیکھتے نہیں؟

(الذّٰریٰت - ۵۱ : ۲۰-۲۱)

اس آیت کا اسلوب بول رہا ہے کہ عالمِ نفس کے دلائل قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ اس قرب اور اس وضاحت کے باوجود وہ انسان کو نظر کیوں نہیں آتے! ان سارے دلائل کا احاطہ انسان کے لیے مشکل ہے۔ ہم صرف بعض ایسی دلیلوں کی طرف اشارہ کریں گے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں اور نہایت واضح ہیں۔

۱۔ عہدِ فطرت :

توحید کے نفسی دلائل میں سب سے پہلی دلیل وہ ہے جس کی تشریح ہم نے اپنی اس کتاب کے حصہ "حقیقتِ شرک" کے آخری دو ابواب میں کی ہے۔ یعنی انسانی نفس کے اندر ایک منعمِ حقیقی کا شعور سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ واضح ہے وہاں ہم نے علمائے سائنس کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ انسان کے اندر سب سے زیادہ قدیم جذبہ خوف کا جذبہ ہے، جو کائنات کے مظاہر سے پیدا ہوا اور پھر اسی سے ان کی عبادت کا تصور ہوا۔ اور بدلائل ثابت کیا ہے کہ خوف کا جذبہ اس بات کو مستلزم ہے کہ اس سے پہلے زندگی اور اسبابِ زندگی کے نعمت ہونے کا شعور انسان میں موجود ہو جب تک زندگی کے نعمت ہونے کا احساس نہ ہو اس وقت تک اس کے متعلق کسی اندیشہ کا احساس بالکل بے معنی ہے اور نعمت کا شعور ایک منعم کے شعور کو مستلزم ہے اور منعم اور نعمت کا شعور انسان میں منعم کی شکرگزاری کا جذبہ اور تصور پیدا کرتا ہے۔ یہ جذبہ نہ تو مجرد الفت و عادت کی پیداوار ہے اور نہ محض اجتماعی و تمدنی زندگی کے تکلفات کا نتیجہ ہے۔ حیوانات تک میں یہ جذبہ موجود ہے۔ ہم جن جانوروں کو اپنے گھروں میں پالتے ہیں ان کے اندر بھی اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ

کرتے ہیں۔ ایک بلی سے لے کر ایک ہاتھی تک جن پر بھی ہم کوئی احسان کرتے ہیں، وہ اپنی مختلف اداؤں کی زبان سے اپنی سپاس گزاری اور ممنونیت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی جذبہ بہتر سے بہتر ترقی یافتہ صورت میں، انسان کے اندر موجود ہے جس کو ہم دوسرے لفظوں میں عدل سے تعبیر کرتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کا یہ حال ہے کہ جس پیمانہ سے اس کے لیے ناپا جاتا ہے اسی پیمانہ سے وہ دوسروں کے لیے ناپتا ہے اور اسی جذبۂ عدل نے خالص خدا پرستی اور توحید کی بنیاد ڈالی اور یہ توحید کے نہایت اہم دلائل میں سے ہے۔ اس عدلِ فطری کا تقاضا ایک طرف تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق واجب کا پورا پورا اقرار کیا جائے اور دوسری طرف اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو حقوق خدا کے لیے واجب ہیں ان میں بلا وجہ دوسروں کو ساجھی نہ قرار دیا جائے۔ اس کو قرآن میں ظلمِ عظیم یعنی سب سے بڑی ناانصافی اور حق تلفی سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ بھی ہوئے کہ سب سے بڑا عدل توحید ہے اور سب سے بڑا ظلم شرک۔

اس عدل کو قرآن نے انسانی فطرت کے عہد سے تعبیر کیا ہے:

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ ۚ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ ۝ (الاعراف - ۷ : ۱۷۲)	اور یاد کرو جب نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے —— ان کی پیٹھوں سے —— ان کی ذریت کو، اور ان کو گواہ ٹھہرایا خود ان کے اوپر۔ پوچھا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ بولے، ہاں، تو ہمارا رب ہے۔ ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ مبادا قیامت کو تم عذر کرو کہ ہم تو اس سے بے خبر ہی رہے۔

اس عہد کی حقیقت پر ہم نے "حقیقتِ شرک" کے آخری باب میں ایک مختصر تقریر

لکھی ہے جس کے بعض حصے ہم یہاں نقل کرتے ہیں :

"بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ کیا معلوم اس قسم کا کوئی عہد ہوا ہے ؟ ہمیں نہ تو اس 'اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ' کی کوئی خبر ہے نہ اس 'بلیٰ' کی۔ یہ دونوں باتیں محتاج ثبوت ہیں۔ بالخصوص جب کہ اس کی اہمیت اس درجہ ہو کہ قیامت کے دن یہ عہد ہر نسل پر ابن آدم پر حجت ہوگا لیکن حیرت ہے کہ لوگوں کو کیا یہ بات نہیں معلوم ہے کہ ایک انسان پانی کی ایک حقیر بوند کی شکل میں ماں کے پیٹ میں پڑتا ہے۔ ماں، نہیں معلوم کتنے مصائب جھیل کر اور کتنے دکھ اٹھا کر نو مہینے اس کو پیٹ کے اندر ہی پالتی ہے۔ اپنے گوشت و خون سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ پھر جان کی بازی کھیل کر ایک مضغہ گوشت کی صورت میں اس کو جنتی ہے۔ پھر اپنے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون دودھ بنا کر اس کو پلاتی ہے اور برسوں کی جان کاہیوں کے بعد اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر سکے۔ اس کے بعد باپ کے ایثار، اس کی شفقتوں اور اس کی خورو پرداخت اور تربیت و نگہداشت کا دور آتا ہے جو ایک طویل عرصہ تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصہ میں باپ جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ بچے کے لیے چاہتا ہے۔ وہ خود کم کھاتا ہے تاکہ اس کو کھلائے وہ خود تکلیف اٹھاتا ہے تاکہ بچے کو آرام پہنچے۔ وہ اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے تاکہ بچہ خطرے سے محفوظ رہے۔ ماں باپ کی محبتوں، شفقتوں اور جاں بازیوں کا یہ سلسلہ ہے جو ایک بچہ کو پال کر جوان بناتا ہے۔ اگر اس میں ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو بچہ کی زندگی ہی خطرہ میں پڑ جائے۔ اب فرض کیجیے، بچہ جوان ہوا اور والدین بڑھاپے کو پہنچے۔ اب یہ محتاج ہیں اور وہ مستغنی، لیکن بیٹا ان کا کوئی خیال نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اس کو والدین کے حقوق و فرائض یاد دلائے تو وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ ماں باپ کے کچھ حقوق و فرائض بھی ہیں۔ مجھے اس قسم کے کسی فرض یا ذمہ داری کی کوئی خبر نہیں ہے۔ میں نے اس قسم کے کسی حق کا کبھی اقرار نہیں کیا ہے۔ تو ہر شخص ایسے بیٹے کو کمینہ اور لئیم کہے گا کیونکہ وہ ایسے حق اور

ذمہ داری کا انکار کر رہا ہے جس سے زیادہ ثابت اور مسلم ذمہ داری کوئی نہیں۔ یہ ذمہ داری ہر استحقاق کے ساتھ خود بخود لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بغیر تحریر کے نوشتہ، بغیر گواہی کے ثابت اور بغیر مطالبہ کے مسلم ہے۔ یہ استحقاق (PRIVILEGE) اور ذمہ داری (RESPONSIBILITY) کا وہ فطری عہد ہے جس سے زیادہ انسان کو کوئی عہد بھی یاد نہیں"۔

"اسی بنیاد پر ایک انسان اس عورت کے لیے نان و نفقہ اور حفاظت حرمت کا حق تسلیم کرتا ہے جس سے وہ متمتع ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر آدمی پر اپنے خاندان اور قبیلہ کی حفاظت و نصرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک شہری میونسپلٹی شہریوں کی کمائی میں حصہ دار ہوتی ہے۔ اسی بنیاد پر ایک سلطنت اپنی رعیت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم و قابلیت، وقت اور آزادی جان اور مال میں اس کو شریک کریں اور اگر سلطنت کا وجود کسی خطرہ میں پڑ جائے تو اس کے بچانے کے لیے سب کچھ قربان کر دیں۔ اب فرض کیجیے ایک شخص ایک عورت کی حرمت کا مالک تو بن بیٹھا لیکن اس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اور اس کے حقوق و فرائض سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔ یا ایک شہری میونسپلٹی کی سڑکوں پر چلتا تو ہے، اس کے حفظان صحت کے انتظام سے فائدہ تو اٹھاتا ہے، اس کے پارکوں اور چمنوں سے متمتع تو ہوتا ہے، اس کی جلائی ہوئی بتیوں سے روشنی تو حاصل کرتا ہے، اس کے قائم کیے ہوئے مدرسوں سے منتفع تو ہوتا ہے، لیکن جب اس کے مطالبات کا وقت آئے تو وہ جواب دے دے کہ میں اس مطالبہ کی ذمہ داری سے بری ہوں۔ یا اسی طرح ایک آدمی ایک سلطنت کے اندر شہریت کے حقوق سے متمتع ہو رہا ہے، اس کے امن و عدل سے فائدہ اٹھا رہا ہے، اس کے قانون اور نظام کی بدولت وہ ایک حیثیت کا مالک، ایک بیٹے کا باپ، ایک بیوی کا شوہر، ایک سلطنت کا شہری ہے، لیکن جب سلطنت کے مطالبات کا وقت آئے تو کہہ دے کہ میں نے اس قسم کے بار

اٹھانے اور اس قسم کی دکھ میں پڑنے کا کبھی اقرار نہیں کیا تھا، تو کیا اس کا جواب صحیح ہو گا؟ بیوی کہے گی کہ یہ عذر غلط ہے۔ جس دن تو نے میری حرمت پر آزادانہ تصرف کیا اور میں نے اپنا جسم تیرے سپرد کیا اسی دن تو نے ان ساری ذمہ داریوں کے لیے مجھ سے ایک میثاقِ غلیظا کیا ہے اور زبانِ خلق بیوی کو برحق اور شوہر کو ذلیل اور کمینہ قرار دے گی۔ یہی سزا ایک قبیلہ اپنے بزدل اور حق ناشناس فرد کو دے گا۔ یہی سزا ایک پولیٹکل اپنے نادہند شہری کو اور ایک حکومت اپنے نمک حرام باشندے کو دے گی اور تمام دنیا اس سزا کو بالکل جائز اور واجبی قرار دے گی۔ کیونکہ ہر حق کے ساتھ فرض کا لزوم اس قدر بدیہی ہے کہ آفتاب کا سورج بھی اتنا بدیہی نہیں ہے۔"

"یہاں تک کہ اسی استحقاق اور ذمہ داری کے فطری اور ہمہ گیر قانون کی بنا پر ہمارے گھر کی پلی ہوئی مرغی اور ہمارے تھان پر بندھے ہوئے گائے اور گھوڑے، ہمارے چمن میں اُگے ہوئے پھول اور ہمارے باغ میں لگے ہوئے درخت کے بھی ہم پر حقوق ہیں اور ہم نہایت ظالم آدمی ہوں گے اگر ان کا انکار کریں۔ ہم جس مرغی کے انڈے اور چوزے کھاتے ہیں لازم ہے کہ چیلوں اور کتوں سے اس کی حفاظت کریں۔ ہم جس گائے کا دودھ پیتے ہیں اور جس گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے گھاس اور دانے کے کفیل ہوں۔ ہم جس پودے کے پھول سے معطر مشام اور جس درخت کے پھل سے لذت اندوز اور خوش کام ہوتے ہیں ہم پر واجب ہے کہ ان کو سینچیں، گوڑیں، کھاد دیں اور سردی کی آفتوں اور لُو کی مصیبتوں سے بچائیں۔ ہم ان کے حقوق کا انکار نہیں کر سکتے۔ ہم نے جس دن ان کے وجود سے کسی قسم کی لذت و راحت حاصل کی اسی دن ان کے حقوق کا اقرار کیا ہے۔ یہ استحقاق اور ذمہ داری کا وہ عہد ہے جو ہر نافع اور منتفع میں از خود واقع ہو جاتا ہے اور انسان کی فطرت اور دنیا کے معروف میں اس سے زیادہ کوئی چیز اہم اور واجب الاحترام نہیں۔"

> اب غور کرو کہ جب ہم کو ماں باپ کے حقوق سے انکار نہیں ہے تو ان سے کہیں بڑھ کر اس کا حق ہے جس نے ماں باپ کو بھی پیدا کیا۔ جب ہمارے لیے بیوی کے حقوق سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے حق سے کیسے انکار ممکن ہے جس نے مرد کو صحبت کے لیے عورت کو وجود بخشا۔ جب ہم خاندان اور قبیلہ، بادشاہ اور سلطنت کا حق مانتے ہیں اور اس کو ایک معاہدۂ عمرانی کا درجہ دیتے ہیں تو وہ جس نے خاندان و قبیلہ کو وجود بخشا، جس نے بادشاہ اور سلطنت کی شیرازہ بندی کے لیے انسانی فطرت کے اندر عصبیت کی چسپیدگی اور اجتماعیت پسندی کی پیوستگی بخشی، اس سے کہیں بڑھ کر اس بات کا حق دار ہے کہ ہم اس کے عہدِ ربوبیت کا اقرار کریں۔ جب ہم مرغی اور بلی تک کا حق مانتے ہیں اور گائے اور گھوڑے تک سے ایک خاموش معاہدۂ استحقاق و ذمہ داری کا اعتراف کرتے ہیں تو آخر اس عہد سے ہمیں کیوں انکار ہو جس نے گائے، گھوڑے، دشت و چمن، دریا اور پہاڑ، سورج اور چاند، ہوا اور پانی، آگ اور مٹی سب کو وجود بخشا اور سب کو ہماری ہستی کے قیام کے لیے سازگار اور نفع رساں بنایا؟

اس تقریر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ عدل انسان کی فطرت ہے اور اس فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے منعم کے حقوق کا اعتراف کرے اور منعم کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اس کی شکرگزاری کی جائے اور اس شکرگزاری میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔ یہی حقیقت ہے جو بعض احادیث میں یوں وارد ہوئی ہے کہ بندہ پر خدا کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ کسی کو اس کا ساجھی نہ ٹھہرائے۔ یہی دلیل ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ۝	اور ان کو ابراہیم کی سرگزشت سناؤ جب
إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا	کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے
تَعْبُدُونَ ۝ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا	لوگوں سے کہا کہ بھلا یہ تم لوگ کن چیزوں

فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ . قَالَ هَلْ
يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۙ اَوْ
يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ . قَالُوْا
بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ
يَفْعَلُوْنَ . قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا
كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۙ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ
الْاَقْدَمُوْنَ ۙ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ
اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الَّذِيْ
خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۙ وَالَّذِيْ
هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۙ وَالَّذِيْ
يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۙ وَالَّذِيْٓ
اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ
يَوْمَ الدِّيْنِ ۙ
(الشعراء ۲۶: ۶۹ - ۸۲)

کی پرستش کرتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ
ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور برابر ان کی پوجا پر
جمے رہیں گے! اس نے کہا کیا یہ تمھاری
سنتے ہیں جب تم ان کو پکارتے ہو؟ یا تمھیں
نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں! انھوں نے کہا
بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے
ہوئے پایا ہے۔ اس نے کہا، کیا تم نے ان
چیزوں پر غور کیا ہے جن کو تم پوجتے رہے ہو۔
تم بھی اور تمھارے اگلے آبا و اجداد بھی، یہ سب
میرے تو دشمن ہیں، بجز اللہ رب العالمین کے،
جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہ میری رہنمائی
فرماتا ہے اور جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب
میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے اور جو مجھے
موت دے گا، پھر مجھے زندہ کرے گا اور وہ جس سے میں
متوقع ہوں کہ جزا کے دن میرے گناہ معاف کرے گا۔

یعنی ایک منعم حقیقی جس نے پیدا کیا اور پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ نہیں دیا، بلکہ ہم کو فطرت کی اور پھر الہام کی ہدایتیں بخشیں، جس نے ہمیں کھلایا پلایا، جس نے ہمیں بیماری کے بعد صحت بخشی، جو ہمیں موت دیتی ہے اور پھر ہمارے اعمال کا بدلہ دینے کے لیے ہمیں زندہ کرے گی اور جس کے رحم و کرم سے توقع ہے کہ اس کا معاملہ آخرت میں بھی ہمارے ساتھ اچھا ہوگا، بلا شبہ اس بات کی مستحق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ اس کی شہادت اور دلیل ہمارے پاس موجود ہے۔ ہمارا فطری عدل تقاضا کرتا ہے کہ ہم منعم کے احسان کا حق، اس کی شکر گزاری کی

صورت میں ادا کریں اور اسی عدل ہی کا تقاضا ہے کہ جو حق اللہ تعالیٰ کا ہے بے دلیل اس میں دوسروں کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ یہ حد درجہ کی ناانصافی اور نہایت کھلا ہوا ظلم عظیم ہے۔

۲۔ علم و یقین کی فطری طلب :

انسانی فطرت کی دوسری نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کو تاریکی کے مقابل میں روشنی، جہل کے مقابلے میں علم اور حیرانی و سرگشتگی کے مقابل میں طمانیت اور شرح صدر بالطبع مرغوب ہے۔ انسان اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کائنات کا اس کے سامنے کوئی حل نہ ہو، اس کے آغاز و انجام کے بارہ میں وہ بالکل اندھیرے میں ہو، وہ اپنی ہستی کی غایت، اور اس کے نیک و بد سے بالکل بے خبر ہو، کچھ نہ جانتے کہ کہاں سے آیا ہے، کہاں جائے گا، اپنے ساتھ کیا معاملہ کرے اور دوسروں کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرے۔ اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ان سارے سوالات پر غور کرے، ان کا حل تلاش کرے اور ہر ایک پر نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم لگائے۔ وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ کسی سوال کا کوئی غلط حل پیدا کر لے اور اسی پر جم جائے، لیکن یہ نہیں کر سکتا کہ ان سوالات سے یکسر کوئی تعرض ہی نہ کرے۔ انسان کے لیے ظلمات میں بھٹکتے پھرنا بالکل ناممکن ہے۔

انسان کی یہی وہ فطری طلب ہے جس کی وجہ سے وہ جستجو کی مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھاتا رہا ہے اور بسا اوقات اس نے کوئی صحیح چیز نہ پا کر کسی غلط چیز کو اختیار کر لیا ہے، لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ ان سوالات سے بالکل بے پروا ہو کر بیٹھ رہا ہو۔ یہ ایک فطری پیاس ہے جس کا بجھنا ضروری ہے اور جس چیز سے یہ پیاس ٹھیک ٹھیک بجھ جائے وہی اس کا صحیح جواب ہے۔ یہ پیاس صرف اللہ کے ایمان سے بجھتی ہے۔ اس کے سوا دوسری چیزیں صرف غیر فطری بہلاوے ہیں۔ جن سے طبیعت کو دھوکا تو دیا جا سکتا ہے، لیکن طمانیت نہیں حاصل کی جا سکتی۔ طمانیت صرف اللہ کو ماننے میں ہے: "اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ

الْقُلُوْبُ" (الرعد - ۱۳ : ۲۸) (یں لوگ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔
یہی وہ روشنی ہے جس کے چمکتے ہی یہ پوری کائنات اور اس کا سارا آغاز وانجام آشکارا ہوجاتا ہے: اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور - ۲۴ : ۳۵) (اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے) ۔ اس کو پالینے کے بعد انسان کے سارے سوالات حل ہوجاتے ہیں۔ اب وہ اس کائنات کے آغاز وانجام کا تصور کر سکتا ہے ۔ اس وسیع کائنات میں اپنی ہستی کا مقام متعین کر سکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اب اس کے لیے اخلاق کے اصول، معیشت کے ضابطے، سیاست کے آئین، سب طے ہو سکتے ہیں۔ اب وہ اپنے ماضی اور مستقبل دونوں کے بارہ میں علیٰ وجہ البصیرت ایک فیصلہ کر سکتا ہے۔ محض انکل کے تیر تکے نہیں چلائے گا۔ اب اسے اپنے عقل وحواس کی طرف سے بدگمانی بھی نہیں رہے گی اور اپنے آپ کو مایوسی اور حقارت کی نظر سے بھی نہیں دیکھے گا اور جس راہ میں جو بھی قدم رکھے گا وہ نہایت مضبوط اور محکم ہوگا۔

اس کے بعد اگر کوئی شخص اس حل کو اس وجہ سے نہیں قبول کرتا کہ ممکن ہے اس کے عقل وحواس اسے دھوکا دے رہے ہوں تو یہ نہایت بدترین قسم کی سوفسطائیت ہے۔ بے شبہ انسان کے حواس غلطی کرجاتے ہیں، لیکن وہ غلطی ہی کرنے کے لیے نہیں بنے ہیں۔ بے شک ہماری عقل کبھی نتائج نکالنے میں چوک بھی جاتی ہے، لیکن یقیناً وہ انسان کو فریب دینے پر نہیں مامور ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانوں کی رایوں اور ان کے فیصلوں میں نہایت شدید اختلافات ہیں، لیکن ان کے اندر اتفاق کے جو پہلو ہیں ان کو نظر انداز کر دینا بداہت کا انکار ہے۔ یہ ارتیابیت انسان کی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ یہ ایک مصنوعی حالت ہے جو بتکلف انسان نے اختیار کی ہے، ورنہ اس کی زندگی کا ایک ایک فعل اس کے یقین کا شاہد ہے۔ وہ یقین پر مجبور ہے اور بغیر یقین کے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ وہ ایک "لا ادری" کہنے میں اپنے متعدد یقینوں کا اعلان کرتا

ہے اور اس کے تمام یقینوں میں سب سے بڑا یقین اس ہستی کا یقین ہے جس کی شہادت اسے اپنے اندر اور باہر سے مل رہی ہے اور جس کو مانے بغیر یہ تمام عالم بالکل ظلمات ہے۔ انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ تاریکی پر راضی ہو سکے، الا یہ کہ وہ اپنی فطرت کو مسخ کر ڈالے۔ پس خدا کے وجود اور اس کے تمام صفاتِ کمال سے متصف ہونے کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ اس کے بغیر اس کائنات کے معمہ کا اور خود اپنی ہستی کا انسان کو کوئی حل نہیں ملتا۔ صرف یہی ایک حل ہے جو تشفی بخش ہے، جس سے ساری گرہیں کھل جاتی ہیں۔ اس حل کی صحت اور صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ قلب کی تشنگی کا صحیح تر جواب اور عقل کی جستجو کا اصل مطلوب ہے۔ اس کے لیے کسی اور عقلی و نقلی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ دلیل وہاں کارگر ہوتی ہے جہاں دلیل اصل دعویٰ سے زیادہ روشن ہو یہاں خود دعویٰ اس قدر روشن ہے کہ کوئی دلیل اس سے زیادہ روشن نہیں۔

پس ایک خدا کو ماننا، جو تمام کمال سے متصف ہے، انسان کی فطرت ہے۔ یہ حق ہے۔ اس کے بعد اگر کسی نے کچھ اور خدا بنا لیے ہیں تو یہ ضلالت اور گمراہی ہے۔ کیونکہ ایک خدا کو مان لینے کے بعد فطرت کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ اب اس سے کسی زائد شے کو ماننا ایک امرِ حق پر ایک بالکل غیر ضروری اضافہ ہے اور یہ کھلی ہوئی ضلالت ہے: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ (یونس - ۱۰ ، ۳۲) (تو حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہے) اسی وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ یعنی ایک خدا کو ماننا تو اس لیے ضروری ہے کہ فطرتِ انسانی اس کے بغیر تشفی نہیں پا سکتی اور اس کی شہادت انسان کے اندر اور باہر موجود ہے۔ لیکن اس کے ساتھ دوسروں کو خدائی میں شریک کرنا ایک بالکل بے ثبوت بات ہے:

فَتَعَٰلَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۖ	تو بڑی ہی برتر ذات ہے اللہ بادشاہِ حقیقی
لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ	کی اس کے سوا کوئی معبود نہیں، عرش کریم

اَلْكَرِيْمِ ۝ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ	کا مالک۔ اور جو کوئی اللہ کے سوا کسی اور الٰہ کو
اِلٰـهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ	بھی پکارے گا، جس کے حق میں اس کے پاس
فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ	کوئی دلیل نہیں، تو اس کا حساب اس کے
لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝	رب کے ہاں ہوگا اور کافر فلاح نہیں پائیں گے

(المؤمنون - ۲۳ : ۱۱۶ - ۱۱۷)

یعنی ایک خدا کی شہادت تو انسان اپنے اور باہر سے پا رہا ہے۔ اس لیے اس کو ماننا عقل و فطرت کا تقاضا ہے، لیکن اس کے علاوہ اگر کسی اور کو بھی وہ خدائی میں شریک ٹھہراتا ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں ہے، تو یہ انسان کی بدبختی ہے۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ ایک مشرک کے مقابلہ میں ایک موحد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کا اثبات کرے یا شرکاء کے ابطال پر دلائل قائم کرے، کیونکہ مشرک ایک خدا کو تو بہرحال مانتا ہی ہے، یہ چیز تو مشرک و موحد کے درمیان مشترک ہے، باقی رہے شرکاء، وہ اندازجو اس نے اپنے جی میں فرض کر رکھے ہیں تو پہلے ان کے ثبوت کے دلائل کی ضرورت ہے نہ کہ ان کی تردید کے دلائل کی۔ ان کی تردید کے لیے تو یہ دلیل کافی ہے کہ ان کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

۴۔ فطرتِ انسانی کا علو:

توحید کی ایک بہت بڑی نفسی دلیل فطرتِ انسانی کا علو ہے۔ انسان بالطبع ذلت و اطاعت اور بندگی و غلامی سے نفرت کرتا اور سروری و سرفرازی کا خواہش مند ہے۔ وہ جس وقت اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے کرشمے دیکھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ایک وجود بھی نہیں جو اس کی ہمسری کر سکے۔ اس احساسِ برتری کی ایک بہت بڑی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات اور خدا کا خلیفہ ہے اور فطرۃً اس اشرفیت اور اس خلافت کا احساس لے کر اس دنیا میں آیا ہے۔ اگر اس منصب کے لحاظ سے اس میں سربلندی

برتری کا احساس نہ ودیعت کیا گیا ہوتا تو یقیناً وہ اس منصب کی ذمہ داریوں کو نہ سنبھال سکتا۔ یہ حقیقت نہایت عمدہ طریقہ پر اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ۙ (الاحزاب - ۳۳ : ۷۲) (اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہے) میں بیان ہوئی ہے لیکن یہاں اس کی تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے یہی احساس ہے جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بسا اوقات خدائی کے دعوے کر بیٹھتا ہے کبھی اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى (النّٰزعٰت - ۷۹ : ۲۴) (تمہارا رب اعلیٰ تو میں ہوں) پکار اٹھتا ہے کبھی اَنَا اُحۡىٖ وَاُمِيۡتُ (البقرۃ - ۲ : ۲۵۸) (میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں) کی رعونت کا اظہار کرتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو قوموں کی گردنوں کا مالک اور خشکی و تری کا سلطان سمجھنے لگتا ہے اور بندہ کی جگہ طاغوت بن کر خدا کی زمین میں اپنا قانون اور اپنا فرمان چلانے لگتا ہے۔ لیکن اس احساسِ برتری کے ساتھ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی یہ ساری قوتیں اور قابلیتیں بچپنے بڑھاپے کی دو ناتوانیوں کے درمیان گھری ہوئی ہیں تو اسے ناچار خدائی کا تخت چھوڑ کر بندگی کی صف میں آکھڑا ہونا پڑتا ہے اور اپنی اس پیشانی کو جو کسی کے آگے جھکنا نہیں چاہتی ایک ایسی طاقت کے آگے جھکانا پڑتا ہے جو تمام قویٰ اور قابلیتوں کا سرچشمہ اور تمام آسمان و زمین کی مالک و مدبّر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فروتنی انسان اس لیے نہیں اختیار کرتا کہ اس میں بالطبع کمتری کا احساس یا کسی کو خدا بنانے کا شوق ہے۔ اس میں اصلی ولولہ تو خدا بننے کے لیے ہے، لیکن جب وہ اپنے حوصلوں کی بلند پروازیوں کے ساتھ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کی نارسائیوں کو دیکھتا ہے تو ناچار اسے ایک ان دیکھی ہستی کے سامنے اپنے تئیں ڈال دینا پڑتا ہے ایسا کرنے پر انسان مضطر ہے۔ اگر وہ اس سے بچ سکتا تو یقیناً اس کی خواہش یہی ہوتی کہ وہ اس سے اپنے آپ کو بچا لے جائے لیکن وہ مجبور ہے کہ ایک بالاتر ہستی کا اقرار کرے جس کی قدرت کاملہ

سے یہ سارا کارخانہ وجود میں آیا اور جس کی حکمت و تدبیر سے یہ سارا نظام چل رہا ہے۔ یہ کبر نفس اور غلو کا داعیہ انسان میں اتنا سخت و شدید ہے کہ بسا اوقات یہ کسی طرح بھی اعتراف حق پر راضی نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کا مناظرہ سورۂ بقرہ میں مذکور ہے، جو مدعی تھا کہ میں زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں اس لیے میں ہی رب ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہہ کر کہ خدا سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے، تم اسے مغرب سے طلوع کردو، اس کے عجز کو بالکل بے نقاب کردیا اور وہ اس معارضہ سے ہکا بکا ہو کے رہ گیا۔ لیکن کبر نفس کا شیطان اتنا سرکش ہے کہ لاجواب ہو کر بھی وہ خدا کے اقرار پر راضی نہ ہوا۔ لیکن جن کی عقل درست اور فطرت سلیم ہوتی ہے وہ اپنے علو اور اپنے ضعف دونوں کے توازن کو قائم رکھتے ہیں۔ وہ ایک حکیم و مدبر ہستی کے آگے جھک کے اپنے ضعف کی تلافی اور اپنی ناتوانی کا علاج پا لیتے ہیں اور ان کا قلب مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص کسی اور آستانہ پر جھکتا ہے تو اس کی مثال اس دنی الطبع گدا کی ہے جو ایک دروازہ سے اپنی تمام محتاجی پا لینے کے باوجود دردر صدائے سوال بلند کرتا پھرتا ہے اور اس کی طبیعت کی دناءت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ بسا اوقات اپنے سے زیادہ ذلیل بے بس محتاجوں کے آگے ہاتھ پھیلا دینے میں بھی اس کو کوئی شرم نہیں لاحق ہوتی۔

ظاہر ہے کہ یہ حالت انسان کی اصلی فطرت نہیں بلکہ فطرت کا بگاڑ ہے۔ جس طرح گداگروں کی کثرت کے باوجود ہم یقین رکھتے ہیں کہ انسان کی اصلی فطرت خودداری اور عزت نفس ہے، اسی طرح مشرکوں کی کثرت کے باوجود انسانی فطرت کا اصلی تقاضا توحید ہے۔ ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالہ اس لیے کرتی ہے کہ وہ اپنے اندر ایک خلا محسوس کرتی ہے جو ایک قوام کی قوامیت کے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اب اگر کوئی عورت ایسی ہے جو اس خلا کو بھر لینے کے باوجود دوسروں سے آشنائی کرتی پھرتی ہے تو وہ چھنال ہے، جس نے اپنا جوہر عفت اور جمال غیرت بالکل کھو دیا ہے۔

پس جو شخص خدا کو مانتا ہے وہ اس لیے نہیں مانتا کہ اسے خدا بنانے کا شوق ہے۔

بلکہ اس لیے مانتا ہے کہ اسے خدا کی احتیاج ہے۔ وہ تمام قوتوں اور قابلیتوں کے باوجود اپنے اندر ایک خلا محسوس کر رہا ہے جو ایک خدا کو مانے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اس کو مان لینے کے بعد وہ خلا پر ہوگیا اب اگر کوئی اس سے یہ کہتا ہے کہ اس ایک کے سوا کچھ اور بھی ہیں جو بندگی کے مستحق ہیں تو وہ تو یہ کہہ کر الگ ہو جائے گا کہ میرے لیے ایک خدا بس ہے اگر تمہیں دوسرے آستانوں پر بھی پیشانی رگڑنے کی تمنا ہے تو تم یہ ذلت گوارا کرو، مجھے اس سے معاف رکھو۔

انسانی فطرت کی اسی بلندی کی طرف حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا ہے جو انہوں نے اپنے قیدخانہ کے ساتھیوں کے سامنے کی ہے:

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ	اور میں نے اپنے بزرگوں ابراہیم اور
وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ	اسحاق اور یعقوب کے مذہب کی پیروی کی۔
لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ	ہمیں حق نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک
ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا	ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا ہم پر اور لوگوں پر فضل
وَعَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ	ہے، لیکن اکثر لوگ شکرگزار نہیں ہوتے۔
النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۭيٰصَاحِبَيِ	اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! کیا الگ الگ
السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ	بہت سے رب بہتر ہیں، یا اکیلا اللہ جو سب
خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۭ	پر حاوی و غالب ہو؟ تم اس کے سوا نہیں پوجتے
مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ	ہو مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ
اِلَّآ اَسْمَاۗءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ	دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان کی
وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ	کوئی دلیل نہیں اتاری۔ اختیار و اقتدار صرف
بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ	اللہ ہی کا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس
اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ	کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔ یہی دین
اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ	قیم ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥

(یوسف - ۱۲ : ۳۸ - ۴۰)

اس تقریر کے ابتدائی حصہ کی روح یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل وکرم ہے کہ اس نے اپنے سوا کسی کی عبادت وبندگی کا حکم نہیں دیا اور انسان کے اندر برتری اور سربلندی کا جو احساس ودیعت فرمایا اس کی حرمت وعزت کا خود اس درجہ لحاظ فرمایا کہ غیر کے آگے جھکنے کی ذلت سے اس کو بچایا اور صرف اپنے ہی آگے جھکنے کا حکم دیا، لیکن انسان نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا نہیں کیا اور بلا کسی سبب کے اس نے اپنی نفس کی حرمت کو بٹہ لگایا اور اپنے سے زیادہ حقیر وذلیل مخلوقات کی پرستش کی۔ اس کے بعد فرمایا کہ خدا کو ماننا ایک ضرورت ہے اور انسان، اپنے نفس کے غلو کے باوجود، اس لیے خدا کو مانتا ہے کہ اس کے ماننے بغیر اس کی فطرت کا خلا پر نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ بہتر کیا ہے؟ کیا یہ کہ بہت سے الگ الگ آقا اور رب ہوں اور ان سب کی غلامی کی جائے یا یہ کہ صرف ایک ہی خدائے واحد وتنہا کی اطاعت کی جائے۔ ظاہر ہے کہ خود دار انسان کے لیے ایک ہی رب کی غلامی بہت ہے، وہ بہت سے ارباب کیوں تراشے گا! رہی یہ بات کہ اسی ایک نے بعض دوسروں کی اطاعت کا حکم بھی دیا ہو تو اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے اور اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس کے بالکل برعکس اس کا حکم یہ ہے کہ تنہا اسی کی بندگی کی جائے اور یہی فطری دین ہے۔ یعنی انسان کی فطرت بھی اسی ایک کی شہادت اپنے اندر اور باہر پا رہی ہے، لیکن بہتوں نے اپنے اس فطری دین کو نہیں پہچانا اور شرک کی وادیوں میں بھٹک گئے۔

انسانی فطرت کے اسی غلو کی بنا پر موحد ومشرک کی ایک تمثیل بھی بیان ہوئی ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ انسان بالطبع توحید کو پسند کرتا ہے، نہ کہ شرک کو:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ	اللہ تمثیل بیان کرتا ہے ایک غلام کی
شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا	جس میں کئی مختلف الاغراض آقا شریک

سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ	ہیں اور ایک دوسرے غلام کی جو پورے کا
مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ	پورا ایک ہی آقا کی ملک ہے۔ کیا ان دونوں
اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○	کا حال یکساں ہوگا؟ سزاوار شکر صرف اللہ ہے
(الزمر - ۳۹ : ۲۹)	لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں سمجھتی۔

یعنی بہت سے مختلف المزاج اور مختلف الاغراض آقاؤں کی غلامی کو اپنی پسند سے کون گوارا کر سکتا ہے؟ تو جب کوئی غلام اس ذلت پر راضی نہیں ہوتا تو پھر انسان یہ کیوں گوارا کرتا ہے کہ ایک خدا کے ساتھ اپنے جی سے دوسرے بہت سے خداؤں کو شریک کر لیتا ہے۔ کیا ایک آقا کے غلام اور بہت سے آقاؤں کے غلام کا حال یکساں ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے بعد فطرتِ انسانی کی صدائے حال بتائی کہ الحمد للہ یعنی شکر کا سزاوار صرف اللہ ہی ہے کوئی اور اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔

انسان کے اسی طوعِ فطرت کو مخاطب کر کے سوال کیا گیا ہے:

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ	کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے!
(الزمر - ۳۹ - ۳۶)	

یہی طوعِ نفس ہے جس کو انسان شرک میں آلودہ ہوتے ہی کھو بیٹھتا ہے اور دفعۃً رفعت دعوت کے اس آسمان سے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو سرفراز فرمایا ہے، انتہائی ذلت کی پستی میں گر جاتا ہے:

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا	اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے اس کی
خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ	مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے گرے اور
الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ	چڑیاں اس کو اچک لیں یا ہوا اس کو کسی
فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۔	دور دراز جگہ میں لے جا پھینکے۔
(الحج - ۲۲ : ۳۱)	

دوسری جگہ اس سے زیادہ واضح لفظوں میں فرمایا:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي	کیا نہیں دیکھتے کہ ان ہی کے آگے جھکتے
السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ	ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں
وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ	اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت
وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيرٌ	اور چوپائے اور لوگوں میں سے بہتیرے
مِّنَ النَّاسِ ۖ وَكَثِيرٌ حَقَّ	ایسے ہیں جن پر خدا کا عذاب لازم
عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۗ وَمَنْ يُّهِنِ	ہو چکا ہے اور جس کو خدا ذلیل کر دے تو
اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۚ	اس کو کوئی دوسرا عزت دینے والا نہیں
إِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۩	ہو سکتا۔ بے شک اللہ جو کرتا ہے
(الحج ۲۲ : ۱۸)	چاہتا ہے۔

اس آیت میں انسان کی جس ذلت کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ تمام اشیائے کائنات صرف اللہ واحد کو سجدہ کرتی ہیں اور باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے ان ساری چیزوں کو انسان کی خدمت گزاری اور نفع رسانی میں سرگرم کر رکھا ہے، لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی یہ ننگ گوارا نہیں کرتی کہ انسان کی بندگی کرے۔ البتہ انسان ہے کہ ان ساری چیزوں پر فضیلت رکھنے اور ان کا مخدوم ہونے کے باوجود ان میں سے اکثر چیزوں کا پرستار بنا ہوا ہے۔

۴۔ انسان کا ضعف و افتقار:

چوتھی چیز انسان کا ضعف و افتقار ہے۔ ضعف و افتقار انسان کی صفت ذاتی ہے جو اس سے کبھی منفک نہیں ہوتی۔ بے شبہ انسان قوتوں اور قابلیتوں کا ایک بہت بڑا خزانہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ اپنی ان قوتوں کی بدولت زمین کے مدفون خزانے اگلوا لیتا ہے، فضا میں اپنا تخت حکومت بچھاتا ہے۔ پہاڑوں کا سینہ چاک کر ڈالتا ہے۔ سمندروں پر اپنے جہاز دوڑاتا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی ناتوانی کو جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ خود

کچھ نہیں ہے کیونکہ وہ علانیہ دیکھتا ہے کہ جن قوتوں اور قابلیتوں کے ذریعہ سے وہ یہ سارے تصرفات کر رہا ہے ان میں سے کسی قابلیت کو بھی وہ وجود میں نہیں لایا ہے اور نہ جن چیزوں پر وہ تصرف کرتا ہے ان میں کسی چیز کو اس نے پیدا کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں کسی اور ہی کی بخشی ہوئی ہیں اور اسی کے بنائے ہوئے قانون طبیعی کی پابند ہیں۔ انسان کے اختیار میں جو کچھ ہے وہ بس اتنا ہے کہ کوشش کر کے ان کے قوانین کو سمجھے اور انہیں قوانین کے مطابق ان سے کام لے اور فائدہ اٹھائے اور یہ تمتع بھی بس ایک ہی مدت تک ہے، جس کے پورے ہو جانے کے بعد وہ لاکھ چاہے، لیکن ان میں سے کسی چیز سے ایک پل کے لیے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ چیز انسان میں فطری طور پر ایک ان دیکھی ہستی کی احتیاج پیدا کرتی ہے جس نے اس کو اور ان ساری چیزوں کو وجود بخشا ہے اور جس کے جاری کیے ہوئے قوانین کے مطابق یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ انسان کا یہی ضعف و افتقار ہے جس کی وجہ سے فرمایا گیا ہے: ''أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ'' (فاطر - ۳۵: ۱۵) (تم ہی اللہ کے محتاج ہو) دوسری جگہ فرمایا ہے: ''وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ'' (محمد - ۴۷: ۳۸) (اور اللہ بالکل بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو)۔

جو عاقل ہیں وہ زندگی کے ہر دور اور اس کے ہر تغیر میں اپنی احتیاج کو محسوس کرتے رہتے ہیں اور کبھی خدا سے مستغنی اور بے پروا نہیں ہوتے، بلکہ ان پر نعمتوں کی فراوانی جس قدر بڑھتی جاتی ہے خدا سے ان کا تعلق اسی قدر بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، ذوالقرنین اور فاروق اعظمؓ ہیں۔ لیکن جو کم ظرف اور بلید ہوتے ہیں، وہ بسا اوقات اپنے اردگرد دولت کی فراوانی، خدم و حشم کی کثرت اور طاقت و قوت کے کرشمے دیکھ کر بے خود ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو خدائی میں شریک سمجھنے لگتے ہیں۔ قرآن میں اس کی مثال کے لیے فرعون، ہامان، قارون اور ابولہب، وغیرہ کے نام پیش کیے گئے ہیں جو اس عہد کے فرعونوں ہامانوں، قارونوں اور ابولہبوں کے ائمہ ضلالت ہیں۔

جن لوگوں پر اس طرح کی خیرگی طاری ہوتی ہے ان کے لیے قرآن نے جگہ جگہ انسان

کے فطری ضعف و افتقار کو مختلف تمثیلوں سے واضح فرمایا ہے کہ انسان کتنی ہی رعونت اور خدا سے غفلت و بے پروائی کا اظہار کرے، لیکن اس کی زندگی میں بارہا ایسے حالات پیش آتے ہیں جو اس کی بے بسی اور ناتوانی کا راز کھول ہی دیتے ہیں اور اس وقت اس کے منہ سے وہ چیخ نکل ہی پڑتی ہے جو اس کی فطرت کی پکار ہے۔ اس حالت میں اس کے تمام شرکاء خواہ اپنی ذات ہو یا اس کے لاؤ لشکر یا اس کے غیبی شرکاء و انداد، سب اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور صرف ایک ہی ذات بچ رہتی ہے جس کا دامن رحمت اس کو پناہ دیتا ہے۔ یہ دلیل قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ فرمایا ہے،

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ
الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ
تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا
مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ
الشّٰكِرِيْنَ ۝ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ
مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ
اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝
(الانعام - ۶ : ۶۳-۶۴)

ان سے پوچھو، خشکی اور تری کی تاریکیوں سے تم کو کون نجات دیتا ہے، جب کہ اسی کو تم پکارتے ہو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے کہ اگر اس نے ہم کو نجات دے دی اس مصیبت سے تو ہم اس کے شکر گزار بندوں میں سے بن جائیں گے، کہہ دو، اللہ ہی تم کو نجات دیتا ہے اس مصیبت سے بھی اور دوسری ہر تکلیف سے، لیکن تم پھر شرک کرنے لگتے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَ
الْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي
الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ
طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا
رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ
الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ

وہی ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتیاں ہوائے موافق سے چل رہی ہوتی ہے اور وہ اس میں مگن ہوتے ہیں کہ دفعۃً ایک باد تند آتی ہے اور ان پر ہر جانب سے موجیں اٹھنے لگتی ہیں اور

أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۔ فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ

(یونس - ۱۰ : ۲۲ - ۲۳)

وہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ہم ہلاک ہوئے تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں، خالص اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہمیں اس آفت سے نجات دی تو ہم تیرے شکر گزار بندوں میں سے ہو کر رہیں گے تو جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے وہ نجات پاتے ہی زمین میں، ناحق کے سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ لوگو، تمہاری سرکشی کا وبال تمہارے ہی اوپر آنے والا ہے۔ چند دن دنیا کی زندگی کا نفع اٹھا لو، پھر تمہاری واپسی ہماری طرف ہے، پھر ہم تمہیں تمہاری کرتوتوں سے آگاہ کریں گے۔

سرکش انسان کی سرکشی اور اس کے تمرد و استکبار کی یہ کتنی سچی مثال ہے۔ دنیا کے سمندر میں جب اس کی زندگی کی کشتی بغیر کسی رکاوٹ کے چلتی رہتی ہے، وہ اپنی کشتی کے استحکام اور اپنے حسنِ انتظام پر مغرور رہتا ہے، اپنی تدبیر و دانش کو بڑی چیز سمجھتا ہے، اپنے وسائل و ذرائع پر اتراتا ہے اور خدا کی اطاعت و شکر گزاری سے باہر ہو کر بغیر کسی استحقاق کے اپنی خدائی کا اعلان کرتا ہے، غرور سے اکڑتا ہے، گھمنڈ سے اتراتا ہے، فخر کے نشے سے بدمست ہو جاتا ہے، لیکن جب دفعتہً سازگار ہوا طوفانی بن جاتی ہے، کشتی ڈانوا ڈول ہونے لگتی ہے اور موجوں کے تھپیڑے کشتی کو ایک پرِ کاہ اور اس کے سارے تدبیر و انتظام کو بے حقیقت ثابت کر دیتے ہیں، اس کے منہ سے بے تحاشا چیخ نکل پڑتی ہے کہ اے خدا! اگر اس ورطۂ ہلاکت سے تو نے نجات بخشی تو اب کبھی تجھ سے غفلت نہ ہوگی، اب کبھی گھمنڈ نہ کروں گا اور کبھی تیری خدائی میں ساجھی بننے کی جرأت نہ کروں گا، بلکہ تیرا شکر گزار بندہ بنوں گا اور تیری ہی اطاعت کروں گا، نہ اپنی اطاعت کروں گا نہ کسی اور کی۔ لیکن جوں ہی اس آفت سے نجات پا جاتا ہے

پھر وہی غفلت اور سرمستی عود کر آتی ہے۔ اور اپنے جس سر و سامان اور جس گھمنڈ کو اس نے اتنا بے حقیقت پایا تھا ان ہی کے نشہ میں مخمور ہو کر پھر خدا کا باغی اور مشرک بن جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو خدا نے 'ختار' اور 'کفور'، عہد شکن اور ناشکر گزار کہا ہے۔ کیونکہ فطرت کے جس عہد کو مصائب کے تازیانے آکر یاد دلاتے ہیں اور انسان اس کی تجدید کرتا ہے، حالات کے بدلتے ہی اس عہد کو توڑ کر پھر کفرانِ نعمت کی حالت اختیار کر لیتا ہے۔

اس تفصیل سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ انسان کے اندر افتقار و احتیاج کا احساس بالکل فطری ہے اور یہ افتقار اسے دھکیل کر ایک ایسی ہستی کی طرف لے جاتا ہے جو اس کے لیے مامن و ملجا ہو۔ اگر انسان پر اس کا یہ افتقار آشکارا رہے تو وہ کبھی انانیت، خود سری، رعونت اور بغی و استکبار کے شرک میں مبتلا نہ ہو۔ لیکن وہ اکثر خدا کی نعمتیں پا کر اپنے ضعف و احتیاج کو بھول جاتا ہے لیکن بس بھول جاتا ہے، اس کی فطرت بدل نہیں جاتی چنانچہ جوں ہی اس پر کوئی ایسی مصیبت آتی ہے جو اس کے فریبِ اطمینان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی ہے، اس کی دبی ہوئی فطرت پھر جاگ اٹھتی ہے اور وہ خدا کی طرف بھاگتا ہے اور اس کے سوا سب کو بھول جاتا ہے۔

سرکش سے سرکش انسانوں میں ہم اس فطرت کو جاگتے اور ابھرتے دیکھتے ہیں۔ مغرور سے مغرور انسان جو 'اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ' (القصص - ۲۸ : ۷۸) (مجھے یہ جو کچھ ملا ہے میرے ذاتی علم کی بدولت ملا ہے) کے گھمنڈ میں خدا کو بھول گئے تھے۔ جنھوں نے بغیر کسی استحقاق کے خدا کی زمین میں اپنی خدائی کے علم گاڑ دیے تھے۔ جن کو اپنی تدبیروں اور اپنے استحکامات پر اتنا ناز تھا کہ خدا کے نام پر ہنستے تھے، آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کی تدبیروں کی ناکامی اور ان کے استحکامات کے بودے پن نے ان پر انسان کی بے بسی کا راز کھول دیا ہے اور وہ خدا کا نام لینے لگے ہیں: 'لَعَلَّ اللّٰهَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا' (الطلاق - ۶۵ : ۱) (شاید اللہ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے)۔

باب ۳

توحید کے خصوصی دلائل

دلائل بلحاظ مسلمات مخاطب

اوپر کے دو ابواب میں ہم نے الوہیت اور توحید کی وہ دلیلیں بیان کی ہیں جن کی حیثیت عام دلائل کی ہے۔ ان کی اساس اس کائنات کے نوامیس وسنن اور فطرتِ انسان کے اذعانات و مسلّمات پر ہے۔ اس وجہ سے ہر چند ان کے مخاطبِ اوّل عرب ہیں، لیکن ان کی حجت تمام بنی آدم پر بلا امتیاز عرب وعجم اور بلا لحاظ کافر و مومن، یکساں اور عام ہے۔ یہ صحیفۂ کائنات ہر شخص کے سامنے کھلا ہوا ہے اور فطرت کی شہادتیں بھی ہر قلبِ سلیم کے اندر سے بول رہی ہیں۔ صرف وہی لوگ ان حقائق کے انکار کی جرأت کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنی آنکھیں پھوڑ لی ہوں اور اپنے کان بہرے کر لیے ہوں۔ ایسے لوگوں کو دنیا کی کوئی چیز بھی قائل نہیں کر سکتی۔ اب ہم اُن دلائل کی توضیح کریں گے۔ جن کی بنیاد مخالف کے اعترافات پر قائم ہے ان کی حیثیت خصوصی دلائل کی ہے۔ یعنی مخاطب جن صحیح اصولوں کو تسلیم کرتا ہے قرآن نے ان کو اپنایا ہے اور ان کی اساس پر ان کے مقتضیات و لوازم کی تشریح کر کے مخاطب سے ان کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور ساتھ ہی جو باتیں ان مسلمات سے متناقض ہیں ان کی نفی کا مطالبہ کیا ہے استدلال کا یہ اسلوب بالکل عقلی و فطری ہے۔ اس پر یہ اعتراض کرنا کہ اس میں اساسِ استدلال بے ثبوت رہ گئی ہے بالکل لغو بات ہے۔ استدلال کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ اس اصل کو بھی مدلل و مبرہن کرنے پر وقت ضائع کیا جائے جو حریف کے نزدیک مسلّم ہے۔ انھی دلائل کی وجہ سے ہمارے بعض فلاسفہ و متکلمین کو یہ غلط فہمی ہو گئی

کہ قرآن کے سارے دلائل الزامی قسم کے ہیں اور ایسے برہانیات سے قرآن بالکل خالی ہے جن کی حجت تمام انسانوں پر عام ہو سکے۔ یہ خیال قرآن سے بے خبری پر مبنی ہے۔ یہ تو قرآنی استدلال کی ایک خاص قسم ہے، جس کی بنیاد ایک طرف مخاطب کے اعتراف پر ہے اور دوسری طرف ان برہانیات پر ہے جن کی شرح ہم پچھلے دو ابواب میں کر آئے ہیں۔ اب ہم اس کی توضیح کی کوشش کریں گے۔

۱۔ شرکاء کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے:

اس بات میں قرآن نے عربوں پر سب سے بڑی حجت یہ قائم کی ہے کہ جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو ان کے لیے تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ خدا کا سوال تو خارج از بحث ہے کیونکہ اسے تو تم مانتے ہی ہو اور اس کی شہادت آفاق و انفس سے بھی مل رہی ہے، لیکن اس کے سوا جن کو تم نے خدائی میں شریک بنا رکھا ہے ان کی دلیل لانا تمہارا فرض ہے۔ بغیر دلیل کے کسی معمولی بات کو بھی ماننا انسان کی فطرت کے خلاف ہے چہ جائیکہ کسی کو خدا کا دست و بازو قرار دینا۔ پس اگر اس کی کوئی عقلی دلیل ہے تو اس کو پیش کرو اور اگر کوئی نقلی دلیل ہے تو اس کو سامنے لاؤ۔ رہی یہ بات کہ تم نے اپنے بزرگوں کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے تو یہ کوئی سند نہیں ہے۔ اتنے بڑے دعوے کے ثبوت کے لیے مجرد یہ بات کافی نہیں ہو سکتی:

وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِندَ رَبِّهِ	اور جو کوئی اللہ کے سوا کسی اور اللہ کو بھی پکارے گا، جس کے حق میں اس کے پاس کوئی نہیں۔ تو اس کا حساب اس کے رب کے ہاں ہوگا۔
(المؤمنون - ۲۳ : ۱۱۷)	

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهٖٓ اِلَّاۤ	تم اس کے سوا نہیں پوجتے ہو مگر چند
اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ	ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں
وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا	نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی
مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ	دلیل نہیں اتاری۔

(یوسف - ۱۲ : ۴۰)

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمْ سُلْطٰنًا	کیا ہم نے ان پر کوئی ایسی دلیل اتاری ہے
فَهُوَ یَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ	جو ان چیزوں کی شہادت دے رہی ہو،
یُشْرِكُوْنَ ۔	جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں!

(الروم - ۳۰ : ۳۵)

اہل عرب اس کے جواب میں یہ کہتے کہ ہمارے بزرگوں نے جو شرک اختیار کیا وہ خدا کے حکم سے کیا اور یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم ہے۔ قرآن نے اس کا جواب دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے۔ خدا نے کبھی شرک کا حکم نہیں دیا ہے۔ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب لاؤ یا کوئی ایسی سند پیش کرو جس کی بنیاد علم پر ہو:

قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ	ان سے کہو کبھی تم نے غور بھی کیا ان
دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا	چیزوں پر جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو۔
مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ	مجھے دکھاؤ کہ زمین کی چیزوں میں سے انہوں
فِی السَّمٰوٰتِ ؕ اِیْتُوْنِیْ	نے کون سی چیز پیدا کی ہے یا ان کا آسمانوں
بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ	میں کون سا ساجھا ہے! میرے سامنے
اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ	اس سے پہلے کی کوئی کتاب پیش کرو یا
(الاحقاف - ۴۶ : ۴)	کوئی ایسی روایت جس کی بنیاد علم پر ہو اگر
	تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

رہی یہ بات کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کی تعلیم ہے تو یہ بھی بالکل جھوٹ اور افترا ہے۔ ابراہیم (علیہ السلام) کی زندگی کا ایک نمایاں کارنامہ تو ہجرت کا واقعہ ہے کہ انھوں نے اللہ واحد کے لیے اپنے خاندان و وطن، سب کو چھوڑ دیا اور ہجرت کے وقت انھوں نے شرکاء و شفعاء سے جس طرح اپنی علیحدگی کا اعلان کیا اور براءت کا جو یادگار کلمہ کہا آج تک ان کی ذریت کی ایک شاخ، بنی اسرائیل میں اس کی روایت موجود ہے، جو ان کے تمام اخلاف کے لیے ہمیشہ نشانِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔ سورۂ زخرف میں اس استدلال اور قرآن کے جواب کی پوری تفصیل موجود ہے:

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ۗ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ۝ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ

اور کہتے ہیں کہ اگر خدائے رحمان چاہتا تو ہم ان کو پوجنے والے نہ بنتے۔ ان کو اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض اٹکل کے تیر چلا رہے ہیں۔ کیا ہم نے ان کو اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے تو وہ اس کی سند پکڑتے ہیں! بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی انھی کے نقشِ قدم پر راہ یاب ہیں۔ اور اسی طرح ہم نے جس بستی میں بھی تم سے پہلے کوئی منذر بھیجا تو اس کے خوش حالوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم انھی کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں گے۔ منذر نے کہا: کیا اگرچہ میں اس سے زیادہ ہدایت بخش طریقہ لے کر تمہارے پاس آیا ہوں جس پر تم نے اپنے باپ دادا

عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۚ قَالُوْٓا اِنَّا	کو پایا ہے جب بھی تم انہی کے نقشِ قدم کی پیروی
بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝	کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اس سارے
فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ	کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو۔ تو ہم نے ان
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝	سے انتقام لیا تو دیکھو کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں
وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ	کا۔ اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے اپنے باپ اور
وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا	اپنی قوم سے کہا کہ میں ان چیزوں سے بالکل بری
تَعْبُدُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ	ہوں جن کو تم پوجتے ہو۔ میں صرف اسی کو پوجتا
فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ۝ وَجَعَلَهَا	ہوں جس نے مجھ کو پیدا کیا پس بے شک وہی میری
كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ	رہنمائی فرمائے گا اور اس کو اس نے ایک پائدار
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝	روایت کی حیثیت سے چھوڑا اپنے اخلاف میں
(الزخرف ۔ ۴۳ : ۲۰ ۔ ۲۸)	تاکہ لوگ اسی کی طرف رجوع کریں۔

ان آیات کے مطالب کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اہلِ عرب شرک کی حمایت میں جو روایات پیش کرتے تھے وہ بالکل بے بنیاد اور بے سروپا تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کی مدوّن سرگزشت، جس کو ایک علمی سند کی حیثیت دی جا سکتی تھی اور جو بنی اسرائیل کے صحیفوں میں موجود تھی، عربوں کے ان من گھڑت فسانوں کی تردید کے لیے بالکل کافی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ ان کی ہجرت کا واقعہ تو توحید و اخلاص کا ایک یادگار کارنامہ تھا۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ذرّیتِ ابراہیم کی دونوں شاخوں میں سے کسی نے بھی اس کلمۂ باقیہ کی روح نہیں پہچانی۔ یہود اس نشانِ راہ کے باوجود بار بار بھٹکے اور بالآخر توحید کے صراطِ مستقیم سے وہ اس قدر دور ہو گئے کہ ان کے لیے اس کی طرف لوٹنا ناممکن ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی اور عربوں نے تو اپنی روایات کے دفتر سے سرے سے یہ سرگزشت ہی گم کر دی اور اس کے بالکل برعکس ایسی روایات گھڑ کے کھڑی کر دیں جن سے دینِ بت پرستی

کی تائید نکلے۔

عربوں کے ان اوہام کی تردید میں قرآن نے جگہ جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مختلف واقعاتِ زندگی کا، نیز خانۂ کعبہ کی تعمیر اور مقصدِ تعمیر کی ابتدائی تاریخ کا اور تمام انبیاء کرام کی دعوت کے مشترک مقصود کا حوالہ دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس سے تمہارے اس دعوے کی تائید نکلتی ہو کہ خدا نے شرک و بت پرستی کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاننے کا ذریعہ انبیاء ہیں اور انبیاء کی دعوتیں اگلے صحیفوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے کسی کی دعوت کو بھی تم شرک کی حمایت میں نہیں پیش کر سکتے۔ انبیاء کی تاریخ کا مدون سرمایہ قرآن کے دعوے کی تصدیق کر رہا ہے اور جہاں کہیں اس تاریخ میں کوئی بات ملائی گئی ہے اس کی تردید خود اسی کے اندر موجود ہے۔

۲۔ لوازم سے استدلال:

قرآن کے استدلالِ خصوصی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اہلِ عرب خدا کی جن صفتوں کو تسلیم کرتے تھے، قرآن نے ان کے لوازم کو بھی تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ لوازم دو طرح کے ہیں: ایک وہ صفات جو ان مانی ہوئی صفات سے متفرع ہوتی ہیں۔ نیز ان صفات کی نفی جن سے مانی ہوئی صفات کی نفی لازم آتی ہے۔ دوسرے وہ حقوق و فرائض جو ان صفات کے اقرار کے لازمی نتیجہ کے طور پر اقرار کرنے والے پر عائد ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان اعمال و عقائد کی نفی جن سے خدا کے مسلمہ حقوق کی نفی لازم آتی ہے۔

اہلِ عرب کے متعلق یہ بات معلوم ہے کہ وہ نہ صرف خدا کے وجود کے قائل تھے، بلکہ آسمانوں اور زمین کا خالق، روزی رساں، قویٰ اور قابلیتوں کا بخشنے، موت اور زندگی کا مالک اور مدبرِ امر خدا ہی کو مانتے تھے، لیکن رب یعنی مالک و حاکم خدا کے سوا اوروں کو بھی قرار دیتے تھے۔ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ جس کے لیے یہ ساری صفتیں تسلیم کرتے ہو لازم ہے کہ رب بھی

اسی کو مانو:

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ	پس وہی اللہ تمہارا رب حقیقی ہے تو حق
فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا	کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہے تو کہاں
الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۔	تمہاری عقل الٹ جاتی ہے۔

(یونس - ۱۰: ۳۲)

یعنی یہ ساری باتیں مان لینے کے بعد تو یہ لازم ہے کہ مالک وحاکم اور آمر وناہی اسی کو مانو۔ اس حق کے بعد جو ثابت ہے، اگر کسی اور کو بھی مانتے ہو جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو یہ بھی ضلالت وگمراہی ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں فرمایا کہ جس کو خالق ارض وسما مانتے ہو لازم ہے کہ اسی کو رب بھی مانو۔ اس کے سوا کسی اور کو مالک وحاکم نہ بناؤ۔ جو خالق ہے امر وحکم کا حق اسی کو پہنچتا ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ	بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا....
اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط	آگاہ رہو خلق اور امر اسی کے لیے خاص ہے

(الاعراف - ۷: ۵۴)

جس اللہ کو آسمان وزمین کا خالق مانتے ہو، اسی کو رب بھی مانو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ خالق کوئی ہو اور رب کوئی بن جائے۔ جس نے خلق کیا ہے امر اسی کا حق ہے جب ایک جزیرہ کا انکشاف کرنے والا اور ایک چیز کا ایجاد کرنے والا محض اپنے کشف وایجاد کی بدولت یہ حق رکھتا ہے کہ اس کی ملکیت اور اس پر تصرف کا حق اسے حاصل ہو تو خدا کے اس حق سے کیوں انکار کرتے ہو، درآنحالیکہ اس کا حق کشف وایجاد سے بدرجہا زیادہ ہے!

اسی طرح خالق کے لیے صفتِ علم کو لازم قرار دیا۔ یعنی جس ذات کو آسمان وزمین کا خالق مانتے ہو لازم ہے کہ اس کے علم کو محیط کل مانو: اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۔

(الملک - ۶۷: ۱۴) (کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے)۔

اسی طرح یہ لازم ہے کہ جس خدا کو خلق و تدبیر پر قادر مانا ہے تمام نفع و ضرر اسی کے اختیار میں تسلیم کیا جائے: وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِنْ يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (الانعام - ۶: ۱۷) (اور اگر اللہ تجھ کو کسی دکھ میں مبتلا کرے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس کا دور کرنے والا بن سکے اور اگر کسی خیر سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

اسی طرح تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ان صفات سے بری قرار دیا گیا جو الوہیت کے منافی ہیں یا جن کو تسلیم کرنے سے ان صفات کی نفی لازم آتی تھی جن کو اہلِ عرب خدا کے لیے تسلیم کرتے تھے۔ یہ باب نہایت وسیع ہے اور اس پر ایک حد تک ہم "حقیقتِ شرک" کے تحت بحث کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے صرف اچھی صفتیں سزاوار ہیں۔ کوئی بری صفت الوہیت کے تصور کے منافی ہے۔ اس کائنات کا معقول حل ہی ایک ایسی ذات کو ماننے سے ہوتا ہے جو تمام صفاتِ جمال و کمال کی جامع ہے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی ایسی صفت لگا دی جائے جو جمال و کمال کے منافی ہو تو یہ حل شدہ معمہ پھر معمہ بن کے رہ جاتا ہے اور اس کائنات پر وہی ظلمت پھر طاری ہو جاتی ہے جس سے خدا کے صحیح تصور نے نکالا تھا:

وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ ۚ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (الاعراف - ۷: ۱۸۰)

اور اللہ کے لیے تو صرف اچھی ہی صفتیں ہیں تو انہی سے اس کو پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑو جو اس کی صفات کے باب میں کج روی اختیار کر رہے ہیں، وہ جو کچھ کر رہے ہیں عنقریب اس کا بدلہ پائیں گے۔

اس ذیل میں سب سے زیادہ اہمیت شرکاء و شفعاء کے اعتقاد کو حاصل ہے۔ اس عقیدہ سے خدا کی تمام اصولی صفات کی نفی ہو جاتی ہے۔ قرآن نے ان کے ان تناقضات کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ شفعاء کو ذریعۂ تقرب بنانے سے لازم آتا ہے کہ خدا کا علم محیط نہیں ہے، کیونکہ اگر اس کا علم محیط ہے تو یہ شفعاء اس کے علم میں کیا اضافہ کریں گے؛ اور اگر وہ اپنے علم کے خلاف محض ان کی سفارش کی بنا پر، لوگوں کو نیکوکار اور بدکار ٹھہرائے گا تو اس سے اس کے عدل و حکمت کی نفی لازم آتی ہے۔ اگر یہ خیال ہے کہ اس کی عنایت حاصل کرنے کے لیے تنہا عمل و اطاعت کافی نہیں ہے، بلکہ کسی کا وسیلہ بھی ناگزیر ہے تو اس سے ہر بندہ کے ساتھ اس کی قربت، اس کی رحمتِ عام اور اس کے غفور و کریم ہونے کی نفی ہوتی ہے اور یہ ایک بدترین سوءِ ظن ہے جس میں ایک بندہ اپنے پروردگار کے متعلق مبتلا ہو سکتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس کسی کو خدائی کے انتظام میں ساجھی ٹھہرایا تو خدا کے کمالِ قدرت کی نفی ہے یا کمالِ غیرت کی، کیونکہ کسی اور کی حصہ داری وہی خدا گوارا کر سکتا ہے جس کے لیے آسمان و زمین کا سنبھالنا مشکل ہو۔ یا پھر وہ بے غیرت ہو کر اسے اپنے حدود و حقوق میں دوسروں کی مداخلت سے کوئی ننگ نہ لاحق ہو اور الوہیت کا تصور ان تمام عیوب و نقائص سے بالکل پاک ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ عربوں کو ان تناقضات کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی ایسی صفت نہ مانیں جو خدائی کے برتر مفہوم سے بے جوڑ یا جس سے ان صفات کی نفی لازم آتی ہے جن کو وہ تسلیم کر چکے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ الزامی اور تنزیہی پہلو بالکل ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے ہیں اور انداز کلام عموماً مجادلہ کا نہیں، بلکہ ایک مسلّم حقیقت کے بیان کا ہوتا ہے؛ کیونکہ ایک امر کے اقرار کے ساتھ اس کے لوازم کا اقرار اور اس کے اضداد کا انکار ایک امر بدیہی ہے جس سے شرک

وہی لوگ گریز کر سکتے ہیں جو ہٹ دھرم ہوں :

مندرجہ ذیل آیات پر مذکورہ بالا پہلو سے غور کرنا چاہیے :

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۔ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔	اور کہتے ہیں کہ خدا اولاد رکھتا ہے۔ اس کی شان ان باتوں سے ارفع ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو بس اس کے لیے فرما دیتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔

(البقرة - ۲ : ۱۱۶ - ۱۱۷)

یہاں 'سُبْحٰنَهٗ' (وہ پاک ہے) کا لفظ ایک دلیل کے طور پر آیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے لیے اولاد کا تصور الوہیت کے تصور کے منافی ہے۔ الوہیت کا تصور مقتضی ہے کہ وہ ہر طرح کی احتیاج اور ہر قسم کے کفو و برادری کی نسبت سے ارفع و منزہ ہو۔ وہ آسمان اور زمین کا موجد ہو، ان کو عدم سے وجود میں لایا ہو، اور اس کی قدرت کاملہ کا یہ حال ہو کہ جب چاہے مجرد اپنے حکم سے جس چیز کو چاہے وجود میں لاوے۔ ایک ایسی ہی ذات خدا ہو سکتی ہے اور تم کو خدا کے لیے ان صفات سے انکار نہیں ہے۔ لیکن ان کے ساتھ تم بعض ایسی صفتیں بھی مان لیتے ہو جو ان سے بالکل متناقض ہیں، جو نہ تو مفہوم الوہیت کے شایان شان ہیں اور نہ تمہاری مانی ہوئی صفتوں کے ساتھ وہ کوئی مطابقت رکھتی ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے :

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي	یہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہے وہ ایسی باتوں سے پاک ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ	اور جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب
عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ	اسی کا ہے۔ تمہارے پاس اس بات کی کوئی
(یونس ۱۰ : ٦٨)	دلیل نہیں ہے۔

ایک جگہ اوثان و اصنام کے ضعف و بے چارگی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ الوہیت کے تصور کی یہ انتہائی تحقیر ہے کہ ایسے بے بس وجودوں کو اس خدا کا دست و بازو قرار دو جس کو قوی و عزیز مانتے ہو اور جس کی قوت و عزت کی سب سے بڑی شہادت یہ کائنات ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ	اے لوگو! ایک تمثیل بیان کی جاتی ہے تو
فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ	اس کو توجہ سے سنو! جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ	ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا کرسکنے پر قادر نہیں
يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا	ہیں اگرچہ وہ اس کے لیے سب مل کر کوشش کریں۔
لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ	اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ
شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ	اس سے اس کو بچا بھی نہیں پائیں گے۔ طالب
الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۔ مَا قَدَرُوا	اور مطلوب دونوں ہی ناتواں! انہوں نے
اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ	اللہ کی، جیسا کہ اس کا حق ہے، قدر نہیں
لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۔	پہچانی! بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔

(الحج ۲۲ : ۷۳-۷۴)

ایک جامع مثال ملاحظہ ہو جس میں توحید کی مختلف الزامی، تنزیہی، آفاقی اور نفسی دلیلیں ایک ہی سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ	اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے
اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ	کارساز بنا رکھے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم تو ان
اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ	کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم

يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ
فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا
يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ
كَفَّارٌ ۝ لَوْ أَرَادَ اللَّهُ أَنْ
يَتَّخِذَ وَلَدًا لَاصْطَفَىٰ
مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ سُبْحَانَهُ ۖ
هُوَ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝
خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ
بِالْحَقِّ ۖ يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى
النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى
اللَّيْلِ ۖ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ
كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى ۗ أَلَا
هُوَ الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ ۝ خَلَقَكُمْ
مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ
مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنْزَلَ لَكُمْ
مِنَ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ ۚ
يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ
خَلْقًا مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي
ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ
رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۖ لَا إِلَٰهَ
إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ ۝

کو خدا سے قریب تر کر دیں، اللہ ان کے درمیان
اس بات کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف
کر رہے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو بامراد نہیں
کرے گا جو جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔ اگر اللہ
اولاد ہی بنانے کا ارادہ کرتا تو وہ چھانٹ لیتا
ان چیزوں میں سے جو وہ پیدا کرتا ہے جو
چاہتا۔ وہ پاک اور ارفع ہے۔ وہ اللہ واحد ہے
سب پر قابو رکھنے والا۔ اس نے آسمانوں
اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ
رات کو دن پر ڈھانکتا ہے اور دن کو رات
پر۔ اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔
ہر ایک وقت مقرر کی پابندی کے ساتھ گردش
کر رہا ہے۔ سن رکھو کہ غالب اور بخشنے والا
وہی ہے۔ اس نے پیدا کیا تم کو ایک ہی جان
سے، پھر پیدا کیا اسی کی جنس سے اس کا جوڑا
اور تمہارے لیے (نر و مادہ) چوپایوں کی
آٹھ قسمیں اتاریں۔ وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے
پیٹوں میں پیدا کرتا ہے، ایک خلقت کے بعد
دوسری خلقت میں، تین تاریکیوں کے اندر۔ یہی
اللہ تمہارا رب ہے۔ اسی کی بادشاہی ہے،
اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو تم کہاں بھٹکائے

إِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ	دیے جاتے جو اگر تم ناشکری کرو گے تو خدا تم
عَنكُمْ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ	سے بے نیاز ہے۔ اور وہ اپنے بندوں کے
الْكُفْرَ وَإِن تَشْكُرُوا يَرْضَهُ	لیے ناشکری کو پسند نہیں کرتا اور اگر تم اس
لَكُمْ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ	کے شکر گزار ہو گے تو اس کو پسند کرے گا، اور
ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُم مَّرْجِعُكُمْ	کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے
فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ	گی۔ پھر تمہارے رب ہی کی طرف تمہاری واپسی
إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ	ہے تو وہ تمہیں ان کاموں سے آگاہ کرے گا
وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ ضُرٌّ دَعَا	جو تم کرتے رہے ہو۔ وہ سینوں کے بھیدوں
رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ	سے بھی باخبر ہے۔ اور جب انسان کو کوئی مصیبت
إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ	پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے، اس
مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ	کی طرف متوجہ ہو کر۔ پھر جب وہ اپنی طرف سے
مِن قَبْلُ وَجَعَلَ لِلَّهِ أَندَادًا	اس کو فضل بخش دیتا ہے تو وہ اس چیز کو بھول
لِّيُضِلَّ عَن سَبِيلِهِ قُلْ	جاتا ہے جس کے لیے پہلے پکارا کرتا تھا اور اللہ
تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا	کے شریک ٹھہرانے لگتا ہے کہ اس کی راہ سے لوگوں
إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ	کو گمراہ کرے۔ کہہ دو اپنے کفر کے ساتھ کچھ دنوں
(الزمر - ۳۹ : ۷ - ۸)	بہرہ مند ہو لو، تم دوزخ والوں میں سے بننے والے ہو

جو شخص ان آیات پر غور و تدبر کرے گا اس کے سامنے بالتدریج توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کے مندرجہ ذیل پہلو آئیں گے:

(۱) جو لوگ کسی کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔ ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ خدا نے کسی کو اپنا شریک بنایا ہے۔ اگر ہے تو اس کو پیش کریں۔ اس دلیل کی تفصیل باب کے شروع میں گزر چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(ب) یہ خیال کہ خدا کی بیٹیاں ہیں، جو اس کے ہاں سفارشی ہوں گی، بالکل باطل ہے۔ خدا کے لیے اولاد کا تصور ہی سرے سے غلط ہے۔ خدا کو واحد اور قہار (کنٹرول CONTROL میں رکھنے والا) ہونا چاہیے۔ وہ ہر قسم کے احتیاج سے بالاتر ہے۔ اس کو بیٹوں اور بیٹیوں کی کیا ضرورت۔ پھر ستم یہ ہے کہ اہل عرب خدا کے لیے بیٹیاں مانتے تھے، حالانکہ خود بیٹیوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دوہری غلطی کر رہے تھے۔ ایک یہ کہ خدا کے لیے اولاد تسلیم کر رہے تھے۔ دوسری یہ کہ اولاد میں سے بھی خدا کے حصہ میں وہ اولاد دیتے تھے، جس سے خود نفرت کرتے تھے۔

(ج) عالم کی خلقت عبث نہیں ہوئی ہے، بلکہ ایک غایت کے ساتھ ہوئی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جزا کا ایک دن ضرور آنے والا ہے اور عدلِ کامل کا ظہور یقینی ہے۔ اس تصور کے ساتھ شفاعت کا تصور نہیں جمع ہو سکتا، کیونکہ شفاعت کا تصور عالم کے بامقصد ہونے کی نفی کر دیتا ہے۔ شفاعت عدل کی نفی ہے۔

(د) اس کے بعد دلیل توافق اور دلیل تسخیر جو اوپر بیان ہو چکی ہے، سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کائنات کا خالق عزیز و غفار ہے۔ 'عزیز' یعنی سب پر غالب اور سب کی رسائی سے بالاتر۔ کوئی نہیں ہے جو اس کے اذن کے بغیر اس کے ہاں ایک لفظ بول سکے۔ 'غفار' یعنی بخشنے والا اور گناہوں پر پردہ ڈالنے والا۔ اس لیے اس کے ہاں کسی سفارش کی ضرورت نہیں ہے۔ آدمی کا اپنا عمل خود سفارشی ہے۔

(ھ) اس کے بعد خلقت اور ربوبیت کے دلائل سے اپنے علم کے احاطہ پر استدلال کیا اور پھر نتیجہ نکالا کہ جس نے پیدا کیا، جس نے پرورش کے وسائل مہیا کیے، جو ماؤں کے پیٹوں کے اندر، تہ بہ تہ پردوں کے پیچھے اپنی کاریگری کے کرشمے دکھاتا ہے وہ خدا مستحق ہے اس بات کا کہ اس کو رب مانو۔ اسی کے ہاتھ میں آسمان اور زمین کی بادشاہی ہے، نہ اس کا کوئی شریک ہے اور نہ ہونا چاہیے۔

(۵) اس کے بعد قانونِ عدل بیان کر کے شفاعت کی ساری توقعات کی بنیاد ڈھا دی کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے نہ کفر کو پسند کرتا ہے، نہ شکر کو ناپسند۔ تو جو شخص چاہے اللہ تعالیٰ کا شکرگزار بندہ بن کر اس کی رضا اور قرب حاصل کرے، اور جو چاہے ناشکری کر کے اس کے قہر و غضب میں اپنے تئیں مبتلا کر لے۔ ان دونوں باتوں کا انحصار آدمی کے اپنے عمل پر ہے، کوئی دوسرا نہ شکر کو کفر بنا سکتا، نہ کفر کو شکر: وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (الانعام - ۶ : ۱۶۴)۔

(۶) اس کے بعد اپنے احاطۂ علم کو بیان کر کے شفاعت کی ضرورت کی نفی کر دی کہ وہ دلوں کے بھیدوں تک سے واقف ہے، کوئی دوسرا اس کے علم میں کیا اضافہ کرے گا۔

(۷) آخر میں توحید کی وہ دلیل بیان کی ہے جو دلیلِ افتقار کے عنوان سے ہم دلائلِ انفس کے تحت بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ان تمام لوازم اور تمام تر تنزیہات کے بعد خدا کا تصور جس شکل میں سامنے آیا اس کی ایک عمدہ مثال آیت الکرسی ہے:

اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ	اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود
الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا	نہیں ہے، وہ زندہ ہے، سب کا قائم
نَوْمٌ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ	رکھنے والا ہے، نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی
وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ	ہے، نہ نیند، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے
یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ یَعْلَمُ	سب اسی کی ملکیت ہے۔ کون ہے جو اس
مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا	کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش
خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ	کرے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے
مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ	اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کی معلومات
وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے،

وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ۝

(البقرۃ - ۲ : ۲۵۵)

مگر جو وہ چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے اور ان کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں اور وہ بلند اور عظیم ہے۔

دوسری نہایت عمدہ اور جامع مثال سورۂ حشر میں ہے اور اس میں تنزیہ کی جگہ اثبات کا پہلو غالب ہے:

هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۖ هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ۝ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ ۖ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ۚ يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

(الحشر - ۵۹ : ۲۲ - ۲۴)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں غائب و حاضر کا جاننے والا، وہ رحمان و رحیم ہے۔ وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں بادشاہ، نہایت پاک، سراپا سلامتی، امن بخش، محافظ، غالب، زور آور، صاحب کبریاء۔ اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ وہی اللہ ہے نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، صورت گری کرنے والا، اسی کے لیے ساری اچھی صفتیں ہیں۔ اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ غالب و حکیم ہے۔

اسی ذیل میں سورۂ اخلاص کو بھی سامنے رکھنا چاہیے:

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ

کہو، وہ اللہ سب سے الگ ہے، اللہ سب کے ساتھ ہے۔ نہ وہ کسی کا باپ

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۔ اور نہ کسی کا بیٹا اور نہ کوئی اس کا کفو۔

(الاخلاص - ۱۱۲ : ۱-۴)

خدا کا یہ تصور ان مسلمات کی اساس پر آراستہ ہوا جن کا اہل عرب کو اقرار تھا۔ قرآن نے یہ کہا کہ جن صفتوں کو اہل عرب مانتے تھے ان کے لوازم کو بھی اس نے ان کے سامنے رکھ دیا کہ ان کو بھی تسلیم کرو۔ علیٰ ہذا القیاس جن باتوں سے ان مسلمات یا ان کے لوازم کی نفی لازم آتی تھی، مطالبہ کیا ان کا انکار کرو۔

اسی طرح ان صفات کو تسلیم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کے جو حقوق عائد ہوتے تھے ان کو بھی بلا شرکت غیرے تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔

سورۂ اعراف میں یہ ثابت کرنے کے بعد کہ جس نے خلق کیا ہے لازماً وہی رب ہے اور امر و حکم کا حق اسی کو حاصل ہے یہ نتیجہ نکالا کہ خفیہ و علانیہ اور امید و بیم، ہر حال میں اسی کو پکارنا چاہیے، مشکلوں کو آسان کرنے والا، خطرات و مصائب کا دور کرنے والا اور امیدوں کو پورا کرنے والا وہی ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (الاعراف - ۷ : ۵۵) (اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے) وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (الاعراف - ۷ : ۵۶) (اور اسی کو پکارو بیم و رجا دونوں حالتوں میں)۔

سورۂ بقرہ میں فرمایا کہ جس کو خالق مانتے ہو اسی کی بندگی اور اطاعت بھی کرو، دوسروں کو اس بندگی اور اطاعت میں شریک نہ کرو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔	اے لوگو! بندگی کرو اپنے اس خداوند کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔

(البقرۃ - ۲ : ۲۱)

اسی بندگی کے لیے جگہ جگہ یہ شرط لگائی کہ خالص اطاعت کے ساتھ اس کی بندگی

کرو: مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (الاعراف - ۷ : ۲۹) یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ پوجا خدا کی ہو اور اطاعت کسی اور کی: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (المؤمن - ۴۰ : ۶۵) (اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو پکارو۔ اسی کی خالص اطاعت کرتے ہوئے)

اسی طرح فرمایا کہ جس رب کے لیے آسمان و زمین کی بادشاہی ثابت ہے، حمد و شکر کا سزاوار صرف وہی ہے: لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (التغابن - ۶۴ : ۱) (اسی کی بادشاہی ہے اور وہی سزاوار شکر ہے)۔

سورہ بقرہ ہی میں خدا کو منعم حقیقی ثابت کرنے کے بعد فرمایا کہ اسی کو محبت حقیقی کا مرکز ہونا چاہیے: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۱۶۵) (اور جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں)۔ پھر اسی ذیل میں فرمایا کہ جب سب کچھ خدا ہی کی بخشش سے ملا ہے تو صرف خدا ہی کو ان کے حرام یا حلال کرنے کا حق حاصل ہے۔ دوسروں کے لیے ان کو حلال و حرام کرنے کا حق تسلیم کرنا یا دوسروں کا ان کو حلال و حرام کرنا شرک ہے:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ	اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس
اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ اِنَّ	کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ رحمان اور رحیم
فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	ہے۔ بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَ	رات اور دن کی آمد و شد اور ان کشتیوں میں
الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ	جو لوگوں کے لیے سمندر میں نفع بخش سامان
بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ	لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے
اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ	بادلوں سے اتارا اور جس سے زمین کو اس
فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	کی موت کے بعد زندگی بخشی اور جس سے
وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ	اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے اور

وَ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۞ وَمِنَ
النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ
اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ
حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ
اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۞ اِذْ
تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا
الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ
الْاَسْبَابُ ۞ وَقَالَ الَّذِيْنَ
اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ
مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ
كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ
حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ
بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ۞ يٰٓاَيُّهَا
النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ
حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ
الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ

ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں
جو آسمان و زمین کے درمیان مامور ہیں،
ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں
جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور لوگوں میں ایسے
لوگ بھی ہیں جو خدا کے ہم سر ٹھہراتے ہیں،
جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جس
طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے۔ لیکن جو خدا پر
ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے
محبت رکھنے والے ہیں اور اگر یہ اپنی جانوں
پر ظلم ڈھانے والے اس وقت کو دیکھ سکتے
جب کہ یہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو ان پر یہ
حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی کہ سارا زور اور
اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اللہ بڑا ہی سخت
عذاب دینے والا ہے۔ اس وقت کا خیال کرو
جب کہ مقتدا اپنے پیروؤں سے اظہار برأت
کریں گے اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے۔
اور ان کے تعلقات یک قلم ٹوٹ جائیں گے اور
ان کے پیرو بھی کہیں گے کہ کاش! ہمیں دنیا
میں ایک بار اور جانا نصیب ہوتا کہ ہم بھی ان
سے اسی طرح اظہار برأت کر سکتے جس طرح
انہوں نے ہم سے اظہار برأت کیا ہے۔ اس

مُّبِينٌ ۝ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

(البقرۃ - ۲ : ۱۶۸ - ۱۶۹)

طرح اللہ ان کے اعمال ان کو سرمایۂ حسرت بنا کر دکھائے گا اور ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال طیب ہیں ان کو کھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ تو بس تمہیں برائی اور بے حیائی کی راہ سجھائے گا اور اس بات کی کہ تم خدا کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں ہے۔

سورۂ نحل میں آسمان و زمین میں ایک ہی خدا کا تصرف ثابت کرنے کے بعد اس کا لازمی نتیجہ یہ قرار دیا کہ "فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ" (۵۱) (تو مجھی سے ڈرو) اور غیر اللہ سے ڈرنے پر تعجب کا اظہار فرمایا: "أَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُونَ" (۵۲) (تو کیا تم غیر اللہ سے ڈرتے ہو)۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِن شَيْءٍ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ ۝ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِن دَآبَّةٍ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ يَخَافُونَ رَبَّهُم مِّن فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۩ ۝ وَقَالَ اللّٰهُ

کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ خدا نے جو چیز بھی پیدا کی ہے اس کے سائے داہنے اور بائیں سے منقلب ہوتے ہیں، اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے اور ان پر فروتنی ہوتی ہے اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جتنے آسمانوں اور زمین میں جاندار ہیں اور فرشتے بھی، وہ سرتابی نہیں کرتے۔ وہ اپنے اوپر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ملتا ہے اور اللہ نے فرمایا کہ دو معبود نہ بناؤ، وہ ایک ہی معبود ہے تو مجھی سے ڈرو۔

لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ
اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ
فَارْهَبُوْنِ ۝ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ
اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ۝ وَمَا بِكُمْ
مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا
مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْــَٔــرُوْنَ ۝
ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا
فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۝
لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ
فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَيَجْعَلُوْنَ
لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا
رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔــلُنَّ عَمَّا
كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ۝ وَيَجْعَلُوْنَ
لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ
مَّا يَشْتَهُوْنَ ۝ وَاِذَا بُشِّرَ
اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ
مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى
مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْۗءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ
اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ
فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا

اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے
اور اسی کی اطاعت ہمیشہ لازم ہے تو کیا تم
غیر اللہ سے ڈرتے ہو۔ اور تمہارے پاس جو
نعمت بھی ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے پھر
جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی سے تم
فریاد کرتے ہو۔ پھر جب وہ تم سے تکلیف دور
کر دیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے رب
کا شریک ٹھہرانے لگتا ہے۔ تاکہ ناشکری کریں اس
چیز کی جو ہم نے ان کو بخشی ہے تو چند روزہ عیش
کر لو، عنقریب تم جان لوگے اور جن کے بارے
میں انہیں کوئی علم نہیں ان کا حصہ نکالتے ہیں
ان چیزوں میں سے جو ہم نے ان کو دی ہیں۔
خدا کی قسم! جو افترا تم کرتے ہو اس کی تم سے
پرسش ہونی ہے اور یہ اللہ کے لیے بیٹیاں
ٹھہراتے ہیں وہ ان چیزوں سے پاک ہے
اور ان کے لیے ہے جو یہ چاہیں۔ اور جب
ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے
تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ اور وہ گھٹا
گھٹا رہتا ہے۔ وہ اس منحوس خبر
پر لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا ہے۔ سوچتا ہے
کہ اس کو ذلت کے ساتھ رکھ چھوڑے یا اس

يَحْكُمُوْنَ ۔

(النحل - ۱۶ : ۵۸ - ۵۹)

کو مٹی میں دفن کر دے، افسوس کیسا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔

سورۂ انعام میں فرمایا کہ جو آسمان و زمین کا فاطر ہے لازم ہے کہ اسی کو یار و ناصر بنایا جائے اور اپنے تئیں بالکلیہ اسی کے حوالے کیا جائے :

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ

(الانعام - ۶ : ۱۳)

کہو کیا میں اللہ کے سوا، جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، کسی اور کو اپنا کارساز بناؤں اور وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں، کہو مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں۔

سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ کو ہادی ثابت کرنے کے بعد فرمایا کہ وہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے :

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۔

(یونس - ۱۰ : ۳۵)

پوچھو، کیا تمہارے شرکاء میں کوئی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو، کہہ دو، اللہ ہی ہے جو حق کی توفیق بخشتا ہے، تو کیا جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ پیروی کیے جانے کا حق ہے یا وہ جو بغیر رہنمائی کے خود راہ نہیں پاتے؟ تو تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟

سورۂ فاتحہ میں عالم کے رب ہی کا حق یہ بتایا کہ شکر اسی کے لیے ہو، بندگی اسی کی کی

جائے، استعانت اسی سے ہو:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ۝ (الفاتحة - ۱ : ۴) — ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔

الغرض جو شخص خدا کو ایک مانتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ خدا کے حقوق میں کسی نوعیت سے کسی دوسرے کو شریک کر کے اس کی صفات کی نفی یا اس کے حقوق کا ابطال نہ کرے۔ مثلاً جو شخص خدا کو کھلے اور چھپے کا عالم مانتا ہے وہ کسی کو شفیع و سفارشی مان کر اس کی صفتِ علم کی نفی نہ کرے۔ جو شخص خدا کو رحمان و رحیم مانتا ہے وہ شفاعت کا عقیدہ رکھ کر خدا کے عدل سے بدگمان نہ ہو[1]۔ جو خدا کو بادشاہ تسلیم کرتا ہے وہ اس کی بادشاہی میں کسی دوسرے کی اطاعت نہ کرے۔ جو خدا کو پاک و پاکیزہ جانتا ہے وہ پاکیزگی کو اس کے ہاں تقرب کا وسیلہ بنائے نہ کہ شرکاء و انداد کو۔ جو شخص خدا کو سلام یعنی سُکھ اور چین تسلیم کرتا

---

[1] جس شفاعت کا عقیدہ مشرکین اپنے شفعاء کے متعلق رکھتے تھے اور جس سے خدا کی صفات کی نفی اور اس کے علم اور عدل و حکمت کی نفی لازم آتی ہے وہ شرک اور کفر ہے اور ہرگز جائز نہیں ہے کہ اس طرح کی شفاعت کا عقیدہ ملائکہ اور انبیاء و صالحین کے متعلق رکھا جائے۔ قرآن مجید میں اس بات کی صاف تصریح کر دی گئی ہے کہ کسی کو بھی خدا کے ہاں تدلّل کا مقام حاصل نہ ہوگا۔ سب اس کے سامنے عاجز و سرفگندہ کھڑے ہوں گے۔ نیز کوئی شخص بغیر اذنِ الٰہی کے اس کے حضور میں زبان نہ کھول سکے گا۔ نیز ایک حرف بھی حق کے خلاف نہ کہہ سکے گا اور کوئی شفاعت ایسی نہ ہوگی جس سے حق، باطل اور باطل، حق بن جائے۔ پس انبیاء و صالحین اور ملائکہ سے جو شفاعت ثابت ہے وہ اس مشرکانہ شفاعت سے بالکل مختلف ہے اور اس پر مفصل بحث ان شاء اللہ ہم اپنی کتاب 'حقیقتِ معاد' میں کریں گے اور بعض ضروری باتوں سے 'حقیقتِ رسالت' میں بھی تعرض کریں گے۔

ہے وہ مُشکل اور طمانیت اسی سے طلب کرے جو اس کو امن دینے والا مانتا ہو وہ اسی کی پناہ میں چھپے۔ جو اس کو معتمد مانتا ہے وہ اسی پر بھروسہ کرے اور اسی سے طالبِ مدد ہو۔ جو اس کو غالب اور عالی جناب مانتا ہے وہ اس کے آگے سب کو یکساں عاجز و سرفگندہ مانے۔ جو اس کو غیور مانتا ہے لازم ہے کہ وہ کسی غیر کو سجدہ کر کے اس کی غیرت و کبریائی کو جوش نہ دلائے۔ جو خدا ہی کو خالق، وجود بخشنے والا اور صورت گری کرنے والا مانتا ہے لازم ہے کہ اس کے علم کو محیط اور اس کی قدرت کو کامل تسلیم کرے۔

۳- دلیلِ عدل :

توحید کے انفسی دلائل کے سلسلہ میں ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ عدل انسان کی فطرت ہے اور یہ عدل انسان کو ایک خدا کی شکر گزاری اور اس کی بندگی پر مجبور کرتا ہے۔ اس شعورِ عدل کو قرآن نے عہدِ فطرت سے تعبیر کیا ہے اور اس کی ذمہ داری ہر انسان پر عائد کی ہے۔ وہاں یہ دلیل عام دلیل کی حیثیت سے بیان ہوئی تھی اور اس کی حجت اہلِ عرب اور تمام بنی آدم پر یکساں تھی۔ قرآن نے اسی اصل سے بعض خاص دلیلیں بھی پیدا کیں جن کی ترکیب میں فطرتِ انسانی اور مسلّماتِ عرب، دونوں شامل ہیں۔ مثلاً اہلِ عرب تمام عالم کا خالق اور روزی رساں خدا ہی کو مانتے تھے، لیکن رب اور حاکم دوسروں کو بھی بنا لیتے تھے اور پھر ان کا رتبہ اس قدر بڑھاتے کہ ان کو خدا کے برابر لے جا کر بٹھا دیتے، بلکہ بسا اوقات خود خدا سے بھی بڑھا دیتے۔ قرآن نے ان کے اس مسلّمہ اور انسانی فطرت کی عدل پسندی کی بنا پر ان سے یہ سوال کیا کہ جب تم اپنے لیے نہیں پسند کرتے کہ اپنے غلاموں اور مملوکوں کو درجہ اور روزی میں اپنے برابر کا شریک قرار دو تو پھر جن کو خدا کی مخلوق و مملوک مانتے ہو ان کو خدا کے اختیارات اور خدا کے حقوق میں کیوں شریک کرتے ہو؟ تمہاری فطرت جس بات سے اپنے لیے انکار کرتی ہے اسی چیز کو اللہ جلّ شانہٗ کے لیے کس طرح گوارا کر لیتی

ہے۔ حالانکہ ہونا یہ تھا کہ خدا کے بارہ میں تم اس سے کہیں زیادہ نفرت کرتے۔ اس اصل کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیے۔ ان میں یہ دلیل مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَآدِّي رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَآءٌ ۚ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُونَ ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُونَ ۝ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيعُونَ ۝ فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا

اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق کے معاملہ میں برتری دے رکھی ہے تو جن کو برتری دی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے غلاموں کو نہیں دے دیتے کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں تو کیا وہ اللہ کے فضل کا انکار کرتے ہیں اور اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے اور تمہیں پاکیزہ رزق عطا کیا، تو کیا یہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کے سوا ان چیزوں کو پوجتے ہیں جو نہ ان کے لیے آسمان سے کسی رزق پر اختیار رکھتی ہیں، نہ زمین سے اور نہ وہ اس کی استطاعت ہی رکھتی ہیں۔ تو تم اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو بیشک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، اور اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا اور اس

مَمْلُوكًا لَّا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَمَن رَّزَقْنَاهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَجَهْرًا ۖ هَلْ يَسْتَوُونَ ۚ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۔ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَاهُ أَيْنَمَا يُوَجِّههُّ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ ۖ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَن يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۔

(النحل - ۱۶: ۷۵ - ۷۶)

کہ جس کو ہم نے اپنی جانب سے اچھا رزق دے رکھا ہے جس میں سے وہ پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے، کیا یہ یکساں ہوں گے؛ شکر کا سزاوار اللہ ہے، لیکن ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور اللہ مثال بیان کرتا ہے دو شخصوں کی جن میں سے ایک گونگا ہے، جو کسی چیز پر قادر نہیں ہے اور وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے، جہاں کہیں بھی وہ اس کو بھیجتا ہے وہ کوئی کام درست کر کے نہیں لاتا، کیا وہ اور وہ جو عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ ایک سیدھی راہ پر ہے۔ دونوں یکساں ہوں گے؛

یہی اساسِ استدلال سورۂ نجم کی اس آیت میں ہے:

أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَىٰ ۔ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ ۔

(النجم - ۵۳: ۲۱ - ۲۲)

تم اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور اس کے لیے بیٹیاں! یہ تو بڑی ہی بھونڈی تقسیم ہوئی!

۴- اہلِ کتاب اور منافقین:

یہود و نصاریٰ اور منافقین، جیسا کہ ہم حقیقتِ شرک میں بیان کر چکے ہیں، بالعموم

یا تو خدا کی صفات کے صحیح تصور میں بھٹکے تھے یا ان سے متناقض چیزیں مانتے تھے یا ان صفات کے لوازم کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے تھے، اس وجہ سے وہ عمومی دلائل کی جگہ خصوصی دلائل کے مخاطب ہیں۔ ان کے سامنے ان کے مسلمات رکھ دیے گئے ہیں اور ان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ جو باتیں ان سے متناقض انھوں نے مان رکھی ہیں ان کو ترک کریں اور جو باتیں ان سے لازم آتی ہیں، ان کو تسلیم کریں۔ ان کے سامنے توحید کی حقیقت جس طرح پیش کی گئی ہے اس کی تفصیل ہم "حقیقتِ شرک" میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ بعض استدلال کی نوعیت اور اس کی اساس واضح کرنے کے لیے چند باتوں کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔

مثلاً اہل کتاب کے یہاں یہ چیز مسلم تھی کہ خدا کے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر یہ بات مانتے ہو تو مسیح (علیہ السلام) اور احبار و رہبان کو رب نہ بناؤ اور ساتھ ہی یہ امر بھی واضح کر دیا گیا کہ کسی کے لیے امر و نہی کا مطلق حق تسلیم کر لینا در حقیقت اس کو رب بنا لینا ہے، زبان سے اس کو رب کہو یا نہ کہو۔ اسی طرح یہود کو اپنی نسبت یہ گمان تھا کہ وہ اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں اور بندگی سے کچھ مافوق درجہ رکھتے ہیں۔ قرآن نے ان کی اس تاریخ سے، جس کو وہ مانتے تھے، ان پر ثابت کر دیا کہ ان کا یہ خیال غلط ہے۔ ان کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی انھوں نے خدا کی بندگی و اطاعت سے باہر قدم نکالا ہے خدا نے ان کو نہایت عبرت انگیز سزائیں دی ہیں جو اس امر کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ ان کا درجہ بشریت سے کچھ اونچا نہیں ہے۔ نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری سرگزشت ان کو سنا کر ان پر یہ حقیقت واضح فرمائی کہ ان کو خدا کے ہاں جو تقرب اور درجہ حاصل ہوا وہ بندگی اور اطاعت کا ثمرہ تھا تو انہی کی اولاد کو خدائی کا مقام کیسے حاصل ہو جائے گا؟

اسی طرح نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی خارقِ عادت پیدائش کو ان کی الوہیت کے ثبوت میں پیش کیا تو قرآن نے ان کے مسلمات سے ان کے خلاف حجت پیش کی کہ تم

آدم (علیہ السلام) اور یحییٰ (علیہ السلام) کی ولادت کو بھی خارقِ عادت مانتے ہو، لیکن ان کی الوہیت کے مدعی نہیں ہو؟ نیز حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کا کھانا کھانا بھی ان کی بشریت کے ثبوت میں پیش کیا، کیونکہ کھانا کھانا بھی یہود و نصاریٰ کے ہاں بشریت کی ایک مسلّم دلیل تھی اور اسی دلیل سے حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے بارہ میں اپنے شاگردوں کی ایک غلط فہمی دور کی تھی جس کی تفصیل 'حقیقتِ شرک' میں گزر چکی ہے۔ نیز حضرت مسیح علیہ السلام کے بعض اقوال کا جو غلط ترجمہ ہو گیا تھا قرآن نے اس کی تصحیح کر دی۔ مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے انجیلوں میں بار بار یہ نقل ہوتا ہے: 'میرا باپ اور تمہارا باپ' - قرآن نے اس کی تعبیر 'رَبِّیْ وَ رَبُّکُمْ' (میرا رب اور تمہارا رب) سے کی ہے اور یہ تعبیر انجیلوں کے دوسرے بیانات، نیز انجیلوں کی اصل زبان، یعنی عبرانی کے بالکل مطابق ہے۔

منافقین کی تمام ضلالت ان لوازم اور حقوق کے سمجھنے میں تھی جو خدا اور اس کی صفتوں پر ایمان لانے سے بندے پر عائد ہوتے ہیں اور اس ضلالت کا سبب یہ نہیں تھا کہ ان لوازم کے ادراک میں کوئی اشکال تھا۔ یہ ساری باتیں بالکل واضح تھیں اگر ان میں کوئی اشکال تھا تو وہ قرآن کی بار بار کی وضاحت سے دور ہو گیا تھا لیکن منافقین کی بیماری عقلی نہیں قلبی تھی۔ ان کے دلوں کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ توحید کے مقتضیات کا ساتھ دے سکتے، اس لیے اگر اس راستے سے خدا کے دین میں داخل ہوتے تھے تو دوسرے راستوں سے بھاگ کھڑے ہونے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے قرآن نے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ان کرشموں کو بیان کیا جو مسلمانوں کی قلت و ضعف کے باوجود ان کی فتح و کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوئے اور دوسری طرف توحید کے تمام گوشوں کی پوری پوری توضیح کی۔ چنانچہ تقریباً ان تمام سورتوں میں جن میں منافقین مخاطب ہیں، یہ دکھایا گیا ہے کہ اس کائنات کی تمام چیزیں اللہ واحد کے آگے سرافگندہ اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم ہیں تاکہ خدا کی حمد و تسبیح

ہیں تمام کائنات کی اس ہم آہنگی کو دیکھ کر ان کے دلوں میں ہمت پیدا ہو اور اس خیال سے ان کے دل پست نہ ہوں کہ اس راہ پر چلنے والے تھوڑے ہیں بلکہ یہ دیکھ کر ان کا حوصلہ بڑھے کہ تھوڑے سے ناشکرے انسانوں کے سوا ساری کائنات اس راہ میں سرگرم سفر ہے اور قافلوں سے بھری ہوئی سڑک یہی ہے جو بظاہر سنسان نظر آ رہی ہے۔ قرآن میں جو لوگ مسبحات کی روح سمجھ گئے ہیں ان کو ہمارے اشارات کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔

---

۱ مسبحات سے ہماری مراد وہ سورتیں ہیں جو 'سَبَّحَ' اور 'یُسَبِّحُ' سے شروع ہوتی ہیں۔ ان سورتوں میں بالعموم روئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جنہوں نے زبان سے اقرار توحید کا کر لیا تھا لیکن اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے میں تھڑدلے پن کا ثبوت دے رہے تھے اور مشرکین مکہ اور یہود کی جتھے بندی سے خائف تھے کہ ممکن ہے ان کی منظم طاقت کے مقابل میں مسلمانوں کو ان کی قلت تعداد کی وجہ سے پسپا ہونا پڑے تو تقاضائے مصلحت یہی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی رابطہ رکھا جائے اور یہود و مشرکین سے بھی ناتا نہ توڑا جائے۔ ان منافقین کے سامنے قرآن مجید نے بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی کہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں خدا کی تسبیح کرتی ہیں۔ تسبیح کی اصل حقیقت ڈنڈوت اور جبیں رسائی (PROSTRATION) ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا کی ساری چیزیں خدا کے بنائے ہوئے قانون کی مطیع و فرماں بردار ہیں اور سرمو اس کے حکم سے انحراف نہیں کر رہی ہیں اور اپنے عمل سے خلائق کو دعوت دے رہی ہیں کہ سب اسی کی اطاعت میں سرگرم ہوں۔ نیز کسی کو بھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ خدا کے فرماں برداروں کی تعداد تھوڑی ہے، بلکہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے یعنی ساری کائنات خدا کی فرماں بردار اور مطیع ہے، اس کی نافرمانی کرنے والے اگر ہیں تو بس انسانوں کے اندر ہیں۔ تو جو شخص خدا کی راہ میں قدم رکھے وہ یہ خیال نہ کرے کہ وہ تنہا ہے، بلکہ اسے یہ خیال کرنا چاہیے کہ تھوڑے سے بلید انسانوں کے سوا، جنہوں نے اپنے نفس کو یا دوسروں کو معبود بنا رکھا ہے، آسمان سے لے کر زمین تک ایک ایک ذرہ اس کے ہم رکاب ہے۔

باب ۴

پچھلے مباحث کا خلاصہ

اوپر کے تین ابواب میں جو باتیں بیان ہوئی ہیں ہم ان کا اجمالی خلاصہ بھی پیش کر دیتے ہیں تاکہ یہ پھیلے ہوئے مطالب بسہولت پڑھنے والوں کی گرفت میں آجائیں۔

(ا) ان تفصیلات سے پہلی بات یہ ثابت ہوئی کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کے استدلال کی ساری عمارت الزامی اور خطیبانہ قسم کی دلیلوں پر قائم ہے اور وہ محض عقلی و فطری دلائل سے بالکل خالی ہے، وہ قرآن کے متعلق نہایت مکروہ قسم کے سوءِ ظن میں مبتلا ہیں۔ بلاشبہ قرآن مجید میں الزامی دلائل ہیں، لیکن یہ قرآنی استدلال کی ایک خاص قسم ہے اور اس کی مخاطب وہ جماعتیں ہیں جو بعض صحیح اصولوں کو تسلیم کرتی ہیں۔ قرآن نے ان کے ان مسلّمات سے ان پر حجت قائم کی ہے اور یہ استدلال کا ایک بالکل فطری اور عقلی طریقہ ہے جو تمام بنی آدم میں یکساں مسلّم ہے۔ باقی قرآن کے عام استدلال کی اساس فطرت اور کائنات کی آیات پر ہے۔ جن کی حجت عربی و عجمی اور عامی و فلسفی سب کے لیے یکساں ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن تمام بنی آدم کی ہدایت کے لیے نازل ہوا اور اب قیامت تک دنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

(ب) دوسری حقیقت یہ ثابت ہوئی کہ قرآنی استدلال ہمارے متکلمین و فلاسفہ کے استدلال سے بالکل مختلف ہے ان کی ساری کاوش کا خلاصہ زیادہ سے زیادہ صرف ایک علۃ العلل کا اثبات ہے جس سے نہ تو اس کائنات کا معمہ ہی حل ہوتا اور نہ وہ خلا ہی بھرتا جس کو

ہر انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے اور جس کو بھرنے کی اس کے اندر اتنی شدید خواہش ہے کہ بسا اوقات اگر وہ صحیح چیز نہیں پاتا تو کسی غلط ہی چیز سے بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنی استدلال سے ایک ایسے خدا کا ثبوت ملتا ہے جو تمام اچھی صفتوں سے متصف ہے۔ جس نے اپنے ارادے سے دنیا کو پیدا کیا ہے اور حکمت و رحمت کے ساتھ دنیا کی تدبیر و پرورش فرما رہا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جس طرح سورج سے بالاضطرار خلق کو فائدہ پہنچ رہا ہے اسی طرح خدا سے یہ دنیا بالاضطرار وجود میں آگئی اور اس سے اضطراراً فیض جاری ہے۔ نیز یہ بھی نہیں ہے کہ وہ دنیا کو خلق کر کے اس کے روزمرہ معاملات سے بے تعلق ہو گیا ہو، یہاں تک کہ اگر وہ غائب ہو جائے تو اس کے غائب ہو جانے سے دنیا کو کوئی نقصان نہ پہنچے، جیسا کہ یونانی فلسفیوں کا خیال تھا بلکہ وہ تمام عالم کے تدبیر و نظام پر حاوی اور مسلط ہے۔ اس کا علم جزئیات اور کلیات کو یکساں محیط ہے۔ زمین کے اندر جو کچھ داخل ہوتا ہے اور آسمان کے اوپر سے جو اترتا ہے وہ سب کو جانتا ہے۔ تمام خیر و شر اس کے ہاتھ میں ہے۔ روشنی اور تاریکی، دونوں کا نکالنے والا وہی ہے۔ اس کے اذن کے بغیر نہ ایک ذرہ اپنی جگہ سے ہل سکتا نہ ایک پتہ اپنی شاخ سے گر سکتا۔ نیز وہ بے ہمہ اور باہمہ ہے: جب کچھ نہیں تھا، تب وہ تھا اور جب کچھ نہ ہوگا تب بھی وہ ہوگا۔ وہ خالق ہے، باری ہے، مصور ہے، رزاق ہے، علیم و قدیر ہے، رحمٰن و رحیم ہے، عزیز و حکیم ہے، غالب و قہار ہے، مومن و مہیمن ہے، غفار و ستار ہے، قدوس و سلام ہے، ملک اور رب ہے، غفور و ودود ہے، ہادی و کریم ہے۔ وہ سب سے مستغنی اور سب کی پناہ ہے، نہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا ہے، نہ کوئی اس کی ذات برادری کا ہے۔

(ج) تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ خدا کی ان صفتوں کے لوازم ہیں اور جس طرح وہ اپنی صفات میں یکتا اور بے شریک ہے اسی طرح ان لوازم میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے مثلاً یہ کہ جب وہ خالق ہے تو اسی کو رب مانا جائے، اسی کے امر و حکم کی پیروی کی جائے

زندگی کے ہر مرحلہ میں اسی کی اطاعت و بندگی ہو۔ جب وہی رزاق ہے تو حقیقی شکر گزاری اور حقیقی محبت کا مرکز وہی ہے اور ساری شکر گزاریاں اور ساری محبتیں اس کی شکر گزاری اور محبت کے تابع ہیں۔ جب وہ مومن و مہیمن ہے تو اسی پر توکل کیا جائے، اسی سے استعانت ہو، اسی سے فریاد کی جائے۔ جب وہ عزیز و حکیم ہے تو حقیقی اعتماد کے لائق وہی ہے اور لازم ہے کہ رنج و راحت، دکھ سکھ، ہر حال میں اسی پر بھروسہ کیا جائے۔ جب وہ علیم و قدیر ہے تو تمام سرّ و علانیہ کو اس پر آشکارا مانا جائے۔ جب وہ ہادی ہے تو واجب ہے کہ اسی کی ہدایت کی پیروی کی جائے۔ نیز یہ بھی ضروری ہوا کہ ان تمام باتوں سے قول و فعل میں اجتناب کیا جائے جن سے ان لوازم کی نفی لازم آئے یا ان میں دوسروں کی حصہ داری ثابت ہو۔

رہا یہ سوال کہ خدا کی مرضی اور زندگی کے ہر شعبہ کے لیے اس کے احکام کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے تاکہ انسان اس کی توحید کا پورا حق ادا کر سکے اور غیر اللہ کی اطاعت سے آلودہ نہ ہو تو اس پر تفصیل کے ساتھ ہم اپنی کتاب 'حقیقت رسالت' میں بحث کریں گے[1]۔ یہاں اس سوال سے تعرض کا موقع نہیں ہے۔ یہاں تک ہم نے جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ کائنات اور فطرت انسانی کی کھلی ہوئی شہادت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق و مدبر ہے جو تمام صفات حسنیٰ سے متصف ہے اور اس کائنات پر آمر و متصرف ہے۔ وہی ہمارا مولیٰ اور رب ہے جس کی عبادت اور اطاعت ہم پر واجب ہے۔ وہی ہماری تمام شکر گزاریوں، تمام نیاز مندیوں اور تمام التجاؤں کا مرکز ہے۔

لا الٰہ الا ھو ولا رب سواہ۔

---

[1] افسوس کہ یہ کتاب نہ میں اب تک لکھ سکا اور نہ اب بظاہر اس کی توقع ہے۔

باب ۵

توحید کے اثرات

پچھلے ابواب میں توحید کی جو حقیقت پیش کی گئی اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ توحید مجرد ایک علمی حقیقت نہیں، بلکہ ایک نہایت اہم عملی حقیقت ہے۔ انسانی زندگی پر خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اس کے نہایت گہرے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

انفرادی زندگی پر اس کا سب سے زیادہ نمایاں اثر یہ پڑتا ہے کہ یہی عقیدہ انسان کو آزادی و حریت کا وہ بلند مقام بخشتا ہے جس کا 'وہ اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے' مستحق ہے۔ تمام کائنات انسان کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ لیکن جب تک انسان توحید سے آشنا نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی دناءت و رذالت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی حقیر سے حقیر چیزوں سے ڈرتا اور کانپتا ہے، جو چیزیں اس کی تابعداری اور اطاعت کے لیے پیدا ہوئی ہیں وہ خود ان کی تابعداری اور اطاعت کرتا ہے۔ اپنے ہی جیسے انسان کو اپنا رب اور آقا بناتا ہے، غلاموں کی طرح ان کے آگے جھکتا ہے، ان کو 'ان داتا'، خداوند نعمت، غریب پرور وغیرہ خطابات سے مخاطب کرتا ہے۔ ان کے لیے ہر طرح کے امرونہی کا حق تسلیم کرتا ہے۔ یہاں تک کہ زندوں سے گزر کر مردوں کی قبروں پر بھی اپنی درخواستیں اور التجائیں پیش کرتا ہے ان کو امور کائنات میں متصرف، عالم الغیب اور نافع و ضار سمجھتا ہے۔ بالآخر ہر چکنے پتھر اور ہر اونچے درخت کو معبود بنا لیتا ہے اور ہر گھنی جھاڑی، ہر سنسان

مقام، ہر بہتا دریا، ہر اونچا پہاڑ اور ہر ضرر رساں قوت اور نفع بخش طاقت اس کو بندگی کی دعوت دیتی ہے اور ان میں سے کسی کے سامنے بھی اس کو اپنے نفس کو ذلیل کرنے میں کوئی غیرت نہیں لاحق ہوتی۔ وہ ایک مرتبہ اپنے مقامِ عزت سے گر کر برابر گرتا ہی چلا جاتا ہے اور اس شرف کو بالکل کھو دیتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو سرفراز کیا تھا۔ یہی حقیقت ہے جو سورۂ حج کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے:

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا
خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ
اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ
مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۔

اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے اس
کی مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے
گرے اور چڑیاں اس کو اچک لیں یا ہوا
اس کو کسی دور دراز جگہ میں لے جا پھینکے۔

(الحج - ۲۲: ۳۱)

جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت گزاری میں لگایا وہ اس کی خدمت گزار ہونے کے باوجود ننگ گوارا نہیں کرتیں کہ اس کو سجدہ کریں۔ ان کا سجدہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، لیکن انسانوں کی دناءت کا یہ عالم ہے کہ ان سب کا مقصود ہونے کے باوجود، ان میں سے ہر ایک کے در کا نقشِ سجدہ اس کی پیشانی پر ثبت ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ
مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي
الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ
وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ
وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ
النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ
الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا

کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے آگے جھکتے
ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں
اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ،
درخت اور چوپائے اور لوگوں میں سے بہتیرے
اور بہتیرے ایسے ہیں جن پر خدا کا عذاب
لازم ہو چکا ہے اور جس کو خدا ذلیل کر دے
تو ان کو کوئی دوسرا عزت دینے والا نہیں

لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ	ہیں سکتا۔ بے شک اللہ ہی کرتا ہے
مَا يَشَاۗءُ ۞ السجدة	جو چاہتا ہے۔

(الحج - ۲۲ : ۱۸)

لیکن توحید کا چمکارا پاتے ہی دفعتاً اس کی حالت میں ایسا انقلاب عظیم واقع ہو جاتا ہے کہ وہی انسان جس کو ہم نے اس حال میں دیکھا تھا کہ وہ اس دنیا کی ہر چیز سے نیچے تھا اس قدر بلند ہو جاتا ہے کہ خدا کے سوا ہر چیز اس سے نیچے آجاتی ہے۔ اس تغیر حال کی بہترین مثال ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان سے مقابلہ کرنے والے ساحروں کی سرگزشت میں ملتی ہے۔ جن جادوگروں کو فرعون نے اکٹھا کیا تھا گھڑی بھر پہلے ان کی دناءت طبع کا یہ حال تھا کہ میدان مقابلہ میں اترنے سے پہلے اپنی مزدوری کی طرف سے اطمینان کر لینا چاہتے ہیں اور نہایت ذلیل خوشامدانہ انداز میں التجا کرتے ہیں: اَىِٕنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ (الشعراء - ۲۶ : ۴۱) (کیا ہمارے لیے کوئی صلہ بھی ہے اگر ہم ہی غالب رہنے والے ہوئے!) لیکن زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ توحید کا ایک پرتو پڑتے ہی ان کی طبیعت میں ایسا تغیر عظیم رونما ہو جاتا ہے کہ فرعون ان کو ایمان لانے پر سخت سے سخت سزا کی دھمکی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تم کو سولی پر لٹکا دوں گا، لیکن ان پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ بے دھڑک جواب دیتے ہیں: کچھ پروا نہیں، ہم اپنے رب کے پاس ہی جائیں گے، تمہیں جو کچھ کرنا ہے کرلو۔ تمہارا زور بس اسی دنیا کی زندگی پر چل سکتا ہے:

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا	تم ہمارے درپے آزار صرف اس غصہ میں
بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَاۗءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ	ہو رہے ہو کہ ہم اپنے رب کی نشانیوں پر
اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا	جب کہ وہ ہمارے پاس آئیں، ایمان لائے۔
مُسْلِمِيْنَ ۝	اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے

(الاعراف - ۷ : ۱۲۶) اور ہمیں وفات اسلام پر دے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک موقع پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ دکھ ہو یا سکھ، زندگی ہو یا موت ہر ایک کے آنے اور جانے کا راستہ ایک ہی ہے۔ پس وہ امید و بیم ہر حال میں ایک ہی سے امید رکھتا ہے اور اسی سے ڈرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ دنیا مختلف دیوتاؤں اور کارفرماؤں کی رزم گاہ نہیں ہے، ایک ہی عزیز و حکیم ہے جو اپنی قدرت و حکمت سے اس کارخانہ کو چلا رہا ہے اور ممکن نہیں ہے کہ اس کی مشیت کے خلاف اس عالم کے معاملات میں کوئی ایک ذرہ برابر دخل دے سکے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس عالم کا خالق حق اور محب حق ہے' اس وجہ سے اس عالم میں باطل مجرد کا وجود نہیں ہے۔ باطل کی حیثیت اس دنیا میں طفیلی کی ہے جو حق کے ساتھ لگ جاتا ہے اور بالواسطہ وہ بھی حق ہی کی خدمت کرتا ہے۔ جس پر یہ راز کھل گیا اس نے دنیا جہان کی دولت پالی۔ اس کا خزانہ لازوال اور اس کی زندگی غیر فانی ہے۔ وہ نہ تو کبھی ہراساں ہوتا نہ کبھی اس کو تنہائی دکھ دیتی۔ وہ ایک سدا بہار درخت سے کھاتا اور ایک ہمیشہ جاری رہنے والے چشمے سے آسودہ حال رہتا ہے:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا	کیا تم نے غور نہیں کیا، کس طرح تمثیل
كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ	بیان فرمائی ہے اللہ نے کلمہ طیبہ کی۔ وہ
أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا	ایک شجرہ طیبہ کی مانند ہے جس کی جڑ
فِي السَّمَآءِ ﴿ تُؤْتِيْٓ أُكُلَهَا	زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں
كُلَّ حِيْنٍۭ بِإِذْنِ رَبِّهَا ۭ	فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا پھل ہر
وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ	فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿	رہتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے تمثیلیں
(ابراھیم - ۱۴ : ۲۴ - ۲۵)	بیان کرتا ہے تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں

یہی لوگ ہیں جن کا دماغ مصیبت و راحت، ہر حال میں متوازن رہتا ہے اور تنگی و فراخی

کی کوئی حالت ان کے دل کے اطمینان کو درہم برہم نہیں کرتی۔ نہ وہ گھبراتے، نہ مایوس ہوتے، نہ اکڑتے اور نہ فخر کرتے۔ جس خندہ جبینی کے ساتھ وہ آرام کی گھڑیوں کا استقبال کرتے ہیں اسی شادمانی کے ساتھ آزمائشوں اور مصیبتوں کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں:

يَآيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿﴾	اے وہ جس کا دل اپنے رب پر جما
ارْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿﴾	رہا، چل اپنے رب کی طرف، تو اس
(الفجر - ۸۹ : ۲۷ - ۲۸)	سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔

یہ ایک موحد کا باطن ہے۔ وہ اپنے باطن میں بالکل یکسو اور حنیف ہو جاتا ہے اور پھر یہی یکسوئی اور حنیفیت اس کے ظاہر پر بھی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ جس طرح قوانین طبیعی کے آگے بے بس اور مسلوب الاختیار ہوتا ہے وہی بے بسی اور مسلوب الاختیاری وہ اللہ تعالیٰ کے احکام و اوامر کے آگے اختیار کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو آزادی بخشی ہے اپنی خوشی سے اللہ کی مرضی کے ماتحت کر دیتا ہے۔ سورج اور چاند، ابر و ہوا، دریا اور پہاڑ مجبوراً خدا کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ مہاروں میں بندھی ہوئی اونٹنیوں کے مانند اپنے متعین راستوں پر چلتے ہیں۔ لیکن مومن انسان خود اپنے ہاتھوں سے اپنی ناکوں میں نکیل ڈال کر اس قافلہ میں شامل ہو جاتا ہے اور یہی انسان کا اصلی شرف ہے۔ یہی اختیاری انقیاد و اطاعت توحید کی اصلی روح ہے اور جو اس انقیاد میں جتنا ہی کامل ہے وہ اسی قدر توحید میں کامل ہے۔ راہِ توحید کے سلوک کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی بندگی سے چھوٹ کر اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں دیتا ہے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ قوم، ملک، وطن اور تمام رسوم و قیود سے آزاد ہو کر خدا کی طرف بھاگتا ہے۔ آخری درجہ یہ ہے کہ خوشی خوشی اس زندگی پر اللہ کے قرب اور اس کی معیت کو ترجیح دیتا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَ	کہہ دو، میری نماز اور میری قربانی،
مَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿﴾	میری زندگی اور میری موت اللہ رب العلمین

وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ٥ (الانعام - ٦ : ١٦٢ - ١٦٣)

کے لیے ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں اور مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں پہلا مسلم ہوں۔

اسی طرح توحید کا اجتماعی اثر بھی نہایت گہرا ہے۔ انسانی معاشرت کی بنیاد کامل عدل اور صحیح مساوات پر قائم ہے اور کامل عدل اور صحیح مساوات وحدتِ الٰہ اور وحدتِ آدم کے بغیر ناممکن ہے۔ دنیا کی موجودہ ابتری اور تباہی کا اصل سبب یہ ہے کہ جس رفتار سے دنیا کی سائنس نے ترقی کی ہے اس رفتار سے اس کے تمدنی شعور نے ترقی نہیں کی ہے۔ سائنس کی ترقیوں کا تو یہ عالم ہے کہ انسان نے ساری جغرافیائی حد بندیاں توڑ ڈالیں اور اپنی ایجادوں اور مشینوں کے زور سے اس وسیع زمین کو ایک مکان کے صحن کی طرح بنا دیا ہے، لیکن دلوں اور دماغوں کی تنگی کا یہ حال ہے کہ ہر قوم کا خدا بھی الگ ہے اور ہر ایک اپنا آدم بھی الگ بنائے ہوئے ہے۔ اگر اس طرح کے انسان کسی طرح اپنی حد بندیوں کو توڑ کر ایک دوسرے کے حدود میں گھس جائیں تو ان میں اس طرح کا جدال و قتال متوقع ہے جس کا ہم آج دنیا کی قوموں میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ان کی صورتیں انسانوں کی سی ہیں، لیکن ان کے دل درندوں کے ہیں۔ ان کو قدرت نے دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں کی حد بندیوں کے ذریعے الگ الگ کر رکھا ہے، لیکن سائنس نے یہ حدیں توڑ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک دوسرے پر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے ہیں اور ساری دنیا کا امن تاراج ہو گیا ہے۔ جو لوگ ان مشکلات پر غور کر رہے ہیں وہ اس نتیجہ تک پہنچ تو گئے ہیں کہ جن اصولوں پر ہمارے موجودہ تمدن و معاشرت کی عمارت قائم تھی وہ اصول موجودہ دنیا کے لیے ناکافی ہیں۔ یہ بچپن کی لنگوٹی پورے قد کے انسان کے لیے نہایت تنگ ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس کے قامت کے لحاظ سے اس کے لیے نیا جامہ تراشا جائے۔ نسل اور رنگ، وطن اور سرزمین کی اساسات پر جن تمدنوں کی اٹھان ہوئی

تھی اور جو سیاسی تنظیمات وجود میں آئی تھیں ان کے خاتمہ کا وقت آگیا۔ اب دنیا کو ایک نئے نظم (NEW ORDER) کی تلاش ہے۔ لیکن وہ نیا نظم کیا ہو؟ اس سوال کا کوئی صحیح جواب اب تک نہیں دیا جا سکا۔ بعض کہتے ہیں کہ اب دنیا کو قومی اور ملکی حکومتوں کی جگہ ایک عالم گیر حکومت (WORLD STATE) ہے۔ جس کی بنیاد عالمگیر انسانیت کے تصور پر ہو۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ یہ عالمگیر انسانیت کا مبارک تصور وجود میں کس طرح آئے جبکہ قوموں کی افراتفری کا یہ عالم ہے کہ نہ ان میں خدا مشترک ہے نہ آدم؛ ہر قوم کا دعویٰ یہ ہے کہ اَنَا وَلَا غَیْرِیْ۔ ہر ایک کا خدا الگ ہے، اس کی نسل الگ ہے، اس کا باوا آدم الگ ہے، وہ اپنی تہذیب میں، اپنے معتقدات میں، اپنے اخلاق میں بالکل علیحدہ ہے اور اس علیحدگی کو نہ صرف باقی رکھنا چاہتی ہے، بلکہ دوسروں پر اس کو بالجبر مسلط بھی کرنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک دماغوں میں یہ گرہ موجود ہے ان قوموں میں اتحاد کے لیے کوئی مشترک سررشتہ موجود نہیں ہے۔ مشترک سررشتہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی خدا کو سب اپنا خدا مانیں، اسی کے اتارے ہوئے قانون کو سب اپنے لیے شریعت بنائیں اور ایک ہی آدم کے مشترک گھرانے کا سب اپنے آپ کو فرد سمجھیں۔ اس اساس پر بلاشبہ ایک عالمگیر قومیت اور ایک عالمگیر سیاسی تنظیم کی عمارت قائم ہو سکتی ہے اور دنیا کی موجودہ مصیبتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنی تدبیریں بھی اس مشکل کو حل کرنے کی اختیار کی جائیں گی وہ رشتہ میں ایک اور گرہ کا اضافہ کریں گی۔ کسی مشکل کو حل نہیں کریں گی۔

یہی راز ہے کہ قرآن نے —— سورۂ نساء کے شروع میں —— انسانی معاشرے کی بنیاد دو چیزوں پر قائم کی ہے: مذہب اور خاندان۔ پھر مذہب کی بنیاد توحید پر رکھی، یعنی صرف اللہ کو رب اور قانون دینے والا مانا جائے، دوسروں کے لیے اس میں کسی طرح کی حصہ داری نہ ہو۔ اور خاندان کی بنیاد وحدتِ آدم کے تصور پر رکھی، یعنی تمام نسلِ

انسانی ایک ہی آدم سے ہے۔ کسی کو کسی پر فضیلت نہیں حاصل ہے مگر دین اور تقویٰ کی وجہ سے۔ پہلی چیز نے خداؤں اور الٰہوں کے تعدد اور قانون سازی اور حکمرانی کے مدعیوں کے تزاحم سے دنیا کو نجات دی اور دوسری چیز نے خاندان اور نسل و نسب کے سارے گھمنڈوں کو باطل کر دیا۔ سارے انسان ایک خدا کے بندے اور ایک آدم کے بیٹے بن گئے۔ کالے اور گورے، عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ سب کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام ہے۔ سب کے لیے یکساں امن ہے، یکساں عدل ہے، یکساں جدوجہد کا میدان ہے، یکساں استحقاق ہے اور یکساں ذمہ داری ہے۔ یہاں کسی نسل کے متعلق یہ خیال قائم کرنا کہ وہ پیدائشی غلام ہے شدید گناہ ہے۔ یہاں ایرین اور سامی نسل کے درمیان کسی قسم کا امتیاز فساد فی الارض ہے۔ یہاں ریڈ انڈین کو محض رنگ کی بنیاد پر حقوق سے محروم کرنا ظلم کبیر ہے۔ اس نظام میں صرف وہ لوگ مساویانہ حقوق سے محروم ہیں جو ان اصولوں کے منکر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ انسانیت کے، امن و عدل کے دشمن ہیں۔ وہ زمین میں فساد چاہتے ہیں اور انسانی معاشرے کی ان اساسات کو ہدم کر دینا چاہتے ہیں جن سے محروم ہو کر دنیا کبھی چین نہیں حاصل کر سکتی۔

آج جو لوگ دنیا کے لیے نئے نظم کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ جب تک توحید کی حقیقت نہ سمجھ لیں، وہ کوئی ایسی اساس نہیں قائم کر سکتے جس پر تمام عالم انسانی کی اخوت کی عمارت قائم ہو سکے۔ انسان کے لیے یہ بات تو بالکل فطری ہے کہ وہ خدا کی بندگی و اطاعت کرے۔ یہ بات ایسی ہے جس کی دعوت تمام بنی آدم کو یکساں دی جا سکتی ہے اور ہر سلیم الفطرت انسان، خواہ وہ کسی قوم و نسل سے تعلق رکھتا ہو بغیر کسی عصبیت کے اس دعوت کو قبول کر سکتا ہے۔ اس کے اندر فطرتِ انسانی کے لیے ایک قدرتی کشش ہے۔ آفاق و انفس، دونوں میں اس کی ناقابلِ انکار شہادتیں موجود ہیں۔ باقی اس کے سوا جتنے بھی دعوے ہیں سب دعاوی جاہلیت کے حکم میں داخل ہیں۔

فطرتِ انسانی کے اندر ان کے لیے نہ تو کوئی اپیل ہے نہ کائنات کے نظام سے ان کو ہم آہنگی حاصل ہے۔ اگر ان میں سے کسی نظریے کو بھی بالجبر دنیا پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو لازماً دنیا کا مزاج اس کو اگلنے کی کوشش کرے گا اور اس کا نتیجہ یا تو یہ ہوگا کہ کوشش ناکام ہوگی یا کامیاب ہوگی تو اس کی حیثیت محض کی جیانس کی ہوگی اور زمین کے ادیانِ باطلہ میں ایک دینِ باطل کا اور اضافہ ہو جائے گا۔

باب ۔ ۶

توحید کی اہمیت دین میں

پچھلے مباحث کو جن لوگوں نے غور سے پڑھا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہی کہ نظامِ دین میں توحید کو وہی جگہ حاصل ہے جو جسمِ انسانی میں دل کو حاصل ہے۔ اگر دل بیمار ہے تو سارا جسم بیمار ہے اور اگر دل تندرست ہے تو سارا جسم تندرست ہے۔ توحید کے بغیر آدمی کا کوئی عمل مقبول نہیں ہے اور توحید کے ساتھ ہر غلطی کے بخشے جانے کی توقع ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا اور اس کے سوا جو کچھ ہے، جس کے لیے چاہے گا، معاف فرمائے گا۔

توحید کی اس اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ سارے دین کی عمارت تین چیزوں پر قائم ہے: توحید، رسالت اور معاد۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ توحید سارے دین کا ایک ثلث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ اخلاص کو، جو خالص توحید کی سورہ ہے، ثلثِ قرآن کہا گیا ہے، لیکن اگر مزید غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ رسالت اور معاد بھی توحید کے تحت آتے ہیں۔ رسالت کا جزوِ توحید ہونا یوں ثابت ہے کہ خدا ہی کو شارع اور قانون ساز ماننا بھی توحید کے مقتضیات میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے احکام و قوانین اپنے رسول کے ذریعے سے بھیجتا ہے۔ اس مسئلہ پر ہم مفصل بحث اپنی کتاب 'حقیقتِ رسالت' میں کریں گے اور وضاحت کے ساتھ

۱؎ افسوس کہ یہ کتاب میں اب تک نہ لکھ سکا۔

ذٰ اِلٰہ کے ساتھ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے تعلق کی تشریح کریں گے۔ وہاں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اور زندگی کے ہر شعبہ میں واجب الاطاعت ماننا توحید کا جزوِ لاینفک ہے۔ جو شخص اللہ کو واحد کہتا ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پیروی سے منحرف ہے، وہ قطعی مشرک ہے۔ اس کو توحید سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

باقی رہا معاد کا مسئلہ تو وہ توحید کے تحت مختلف پہلوؤں سے داخل ہے۔ ہم اپنی کتاب 'حقیقتِ معاد'[1] میں تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے کہ معاد خدا کے صفات کا لازمی اقتضاء ہے۔ یہاں صرف اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ معاد کی ساری روح توحید ہے۔ جو لوگ معاد کے قائل ہیں، لیکن ساتھ ہی شرکاء و شفعاء کو بھی مانتے ہیں، جو ان کے زعم کے مطابق ان کو بخشوا لیں گے، ان کے لیے معاد کا عقیدہ بالکل بے جان ہے۔ وہ خدا کے سامنے جواب دہی کی ذمہ داری اور اس کے قانون عدل کے ظہور سے ویسے ہی بے خوف ہو جاتے ہیں جیسے معاد کے منکرین۔ چنانچہ اہلِ عرب اور یہود و نصاریٰ کا یہی حال تھا۔ انھوں نے معاد کی ساری اہمیت شفاعت و کفارہ کے عقیدہ سے باطل کر دی تھی اور یہی حال مسلمانوں کے مبتدع گروہوں کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کا بیان اکثر ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ معاد کی ساری حقیقت ہوا ہو جائے اگر توحید کے تصور میں ذرا بھی خلل واقع ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین کا سارا نظام توحید سے روشن ہے۔ اس جسم کی روح اور اس آنکھ کی پتلی توحید ہی ہے۔ اس کے بغیر نہ کوئی عقیدہ موثر ہے نہ کوئی عمل مثمر۔ یہیں سے دین کا پہلا قدم اٹھتا ہے اور پھر یہیں اس کا آخری قدم پڑتا ہے۔ یہ دین کا دائرہ ہے اور دین اسی وقت تک محفوظ ہے جب تک اس دائرہ کے اندر ہے

---

[1] افسوس ہے کہ یہ کتاب بھی میں اب تک نہ لکھ سکا۔

یہی نکتہ ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں دینِ فطرت کے احکام و قوانین کی تعلیم دی ہے اس کا آغاز "لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ" (بنی اسرائیل - ۱۷ : ۲۲) (اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کر) اور پھر ساری باتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ "ذٰلِكَ مِمَّا أَوْحٰى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۗ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ" (بنی اسرائیل - ۱۷ : ۳۹) (یہ ان باتوں میں سے ہیں جو تمہارے رب نے حکمت میں سے تمہاری طرف وحی کی ہیں اور خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک نہ کرو)۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین کا آغاز اور دین کی انتہا دونوں توحید ہے اور شرائع و احکام درحقیقت توحید کامل تک پہنچنے کے وسائل و ذرائع ہیں۔

توحید کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جتنے انبیاء آئے سب نے اپنی دعوت کا آغاز توحید سے کیا اور اس نقطہ پر اس طرح جمے کہ کسی حال میں اس سے بال برابر سرکنے پر راضی نہ ہوئے۔ مخالفین نے لاکھ چاہا کہ پیغمبر اس معاملہ میں تھوڑی سی مداہنت گوارا کرے، ذرا اپنے رویہ میں نرم ہو جائے، کم از کم ان کے بتوں کی تحقیر ہی سے باز آ جائے تو آگے بڑھ کر اس سے سمجھوتہ کرلیں: "وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ" (القلم - ۶۸ : ۹) (وہ تو چاہتے ہیں کہ ذرا تم نرم پڑو تو یہ بھی نرم پڑ جائیں گے)۔ لیکن پیغمبر نے ایک لمحہ کے لیے اس میں کسی قسم کی نرمی گوارا نہیں کی۔ انھوں نے مخالفتوں سے اس کو ڈرانا چاہا! اور وہ سب کچھ کر ڈالا جو ان کے بس میں تھا، لیکن اس کو اس کی جگہ سے ہلا نہ سکے۔ انھوں نے ترغیب کے پھندے ڈالے اور رشوت میں وہ سب کچھ پیش کیا جو کر سکتے تھے، لیکن اسے رام نہ کر سکے۔ معزز ترین گھرانے میں شادی، دولت کے ڈھیر، سروری و سرداری، ساری ہی چیزیں پیش کی گئیں، لیکن ان ساری ترغیبوں کے جواب میں ان کے سامنے وہی توحید کی دعوت پیش کی گئی۔ جب ان تدبیروں میں ناکام رہے تو مخالفین نے آخری حربہ اٹھایا اور پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے گھر کو، اپنے اعزہ کو، اپنے خاندان کو، اپنی

املاک و جائداد کو اور اپنے وطن کو چھوڑ دیں۔ خدا کے ہر نبی نے اس کو بھی گوارا کر لیا۔ قرآن ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس میں تمام انبیائے کرام کی ہجرت کی سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں، ان کو پڑھو۔ ہر نبی کی زبان پر اپنی قوم کو چھوڑتے وقت جو آخری کلمہ جاری ہوتا ہے وہ توحید کا کلمہ ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے جس کے لیے وہ سب کچھ چھوڑتا ہے اور سب کو چھوڑ کر تنہا یہی چیز ہے جس کو اپنی معیت و رفاقت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ غور کرو، ایسا کیوں ہے؟ کیا بات ہے کہ انسان سب کو چھوڑ دے مگر توحید پر حرف نہ آنے دے! بدر میں باپ نے بیٹے پر، چچا نے بھتیجے پر، ماموں نے بھانجے پر، بھائی نے بھائی پر توحید کی خاطر تلوار چلائی۔ اس کے لیے بیویوں نے شوہروں سے اور شوہروں نے بیویوں سے جدائی اختیار کر لی۔ عزیز سے عزیز قرابتوں اور محکم سے محکم روابط پر قینچی چل گئی اور ان لوگوں کے ہاتھوں سے چل گئی جو انسانیت کے گلِ سرسبد تھے، جو رحم و محبت اور اخلاص و وفا کے پیکر تھے جن سے بڑھ کر اپنی قوم سے، اپنے قبیلہ سے، اپنے عزیزوں سے اور پھر عام انسانوں سے محبت کرنے والے لوگ اس زمین پر پیدا نہیں ہو سکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے کچھ لوگ جب گوسالہ پرستی کے مرتکب ہوتے ہیں تو وہ حکم دیتے ہیں کہ جس قبیلہ کا مجرم ہے اسی قبیلہ کے لوگ اسے قتل کر دیں: ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ (البقرۃ-۲: ۵۴) (تو اپنے مجرموں کو اپنے ہاتھوں قتل کرو)۔ اور بدر کے قیدیوں کے متعلق فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہر شخص اپنے عزیز پر خود اپنے ہاتھ سے تلوار چلائے۔ اللہ اکبر! توحید کا حق یہ ہے کہ آدمی کا ایک ہاتھ اگر اس کی حرمت کو بٹہ لگائے تو اس کا دوسرا ہاتھ اس سے انتقام لینے میں ذرہ برابر رحم و مروت کو دخل نہ دے۔

توحید کی اس عظمت کی وجہ وہی ہے جو اوپر کے مختلف ابواب میں بیان ہو چکی ہے۔ توحید سب سے بڑے حق یعنی خدا کے حق کا اقرار ہے۔ یہی عدل و قسط کی بنیاد ہے جو شخص اس حق کو نہیں پہچانتا وہ کسی کے بھی حق کو نہیں پہچان سکتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے

نفس کے حق کو بھی نہیں پہچانتا۔ اس سے اسی طرح کی ناانصافیاں اور تعدیاں ظہور میں آئیں گی جیسی کہ موجودہ زمانہ کے ظالم اور ناشکرگزار انسانوں سے ظہور میں آرہی ہیں، اور جس کی طرف ہم نے پچھلے باب میں اجمالی اشارہ کیا ہے۔ پس انبیائے کرام، جو کہ سر حق اور انصاف کی دعوت ہوتے ہیں، وہ توحید کے معاملہ میں کسی قسم کی مداہنت کیونکر گوارا کر سکتے ہیں، جب کہ توحید ہی تمام حقوق کی بنیاد ہے۔ وہ اس معاملہ میں نہ باپ کو معاف کر سکتے، نہ چچا کو، نہ بیٹے کو، نہ بیوی کو۔ جو چیز بھی اس حق کی ادائیگی میں مانع ہو، وہ ایک پتھر ہے اور ضروری ہے کہ اس پتھر کو راہ سے ہٹا دیا جائے۔

پس انبیائے کرام کی ساری جدوجہد کا مقصود توحید خالص کا قیام ہے۔ وہ دنیا میں اسی لیے آتے ہیں کہ خدا کے بندوں کو دوسروں کی بندگی سے چھڑا کر خالص خدا کا بندہ بنا دیں، وہ اسی کو خالق مانیں، اسی کو بادشاہ کہیں، اسی کی بندگی کریں، اسی کی اطاعت کریں، اسی پر اعتماد و توکل کریں، اسی سے طالب مدد ہوں۔ نعمت ملے تو اسی کا شکر ادا کریں، مصیبت آئے تو اسی سے استغاثہ کریں۔ طمع ہو یا خوف، امید ہو یا بیم، ہر حال میں ان کی نظر اسی کی طرف ہو، وہ اپنے تئیں بالکلیہ اس کے حوالہ کر دیں۔ ان کی محبت اس کی محبت کے تابع، ان کی پسند اس کی پسند کے تحت ہو۔ اس کی ذات میں، اس کی صفات میں، اس کے حقوق میں، اس کی یکتائی تسلیم کریں اور کسی پہلو سے ان چیزوں میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، نہ کسی فرشتے کو، نہ کسی جن کو، نہ کسی نبی کو، نہ کسی ولی کو، نہ کسی اور کو، نہ اپنی ذات کو۔

توحید کی یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ اصل حقیقت کے اعتبار سے توحید دین کا صرف ایک جزو نہیں ہے، بلکہ یہ سارے دین کو محیط ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ توحید سے باہر دین کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کے انبیاء یہیں سے اپنا کام شروع کرتے ہیں اور اسی پر ختم کرتے ہیں۔ یہی راز ہے کہ قرآن مجید توحید سے شروع ہوتا ہے اور توحید پر ہی ختم ہوتا ہے۔ قرآن

کی پہلی سورہ، سورۂ فاتحہ ہے جس کی اصل روح خدا کی خالص شکرگزاری اور کامل تفویض و تسلیم ہے اور آخر میں سورۂ نصر میں فتح مکہ کی بشارت اور سورۂ لہب میں باطل کی شکست کی پیشین گوئی کے بعد سورۂ اخلاص رکھی گئی جو خالص توحید کی سورہ ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دین کا مرکزی نقطہ توحید ہے اور اب دین اپنے مرکز پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد معوذتین: 'قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ' اور 'قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ' رکھ دی گئی ہیں، جو شیطان کی آفتوں سے اس خزانۂ توحید کی حفاظت کر رہی ہیں کیونکہ یہ معلوم ہے کہ شیطان کو بنی آدم سے جو حسد ہے اس حسد کے جوش میں اس کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ انسان کو توحید کے نقطے سے ہٹا دے، چنانچہ اسی وجہ سے اس نے کہا: 'لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ' (الاعراف ۷: ۱۶) (میں تیری سیدھی راہ پر ان کے لیے گھات میں بیٹھوں گا)۔ یعنی ان کو توحید کے رستے پر قائم نہ رہنے دوں گا: 'وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ' (الاعراف ۷: ۱۷) (اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکرگزار نہ پائے گا) یعنی وہ شرک میں مبتلا ہو جائیں گے۔